ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی نظم و نثر

(تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

ذوالفقار حسین شاہ

فیکلٹی آف لینگوئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۰ء

ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی نظم و نثر

(تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

ذوالفقار حسین شاہ

فیکلٹی آف لینگوئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۰ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی نظم و نثر (تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

پیش کار: ذوالفقار حسین شاہ رجسٹریشن نمبر PD-URD-AS 15-ID-03

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو زبان و ادب

ڈاکٹر نعیم مظہر _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری) _____

ریکٹر

تاریخ _____

اقرارنامہ

میں، ذوالفقار حسین شاہ حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

ذوالفقار حسین شاہ

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کا دفاع کی منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہار تشکر	viii
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور ڈاکٹر انور سدید کے احوال و آثار	
الف: تمہید	۱
i۔ موضوع تحقیق کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۲
iii۔ مقاصد تحقیق	۳
iv۔ تحقیقی سوالات	۳
v۔ نظری دائرہ کار	۳
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۴
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
viii۔ تحدید	۵
ix۔ پس منظری مطالعہ	۶

x۔ تحقیق کی اہمیت ۶

(ب)۔ ڈاکٹر انور سدید کے احوال و آثار

i۔ خاندانی پس منظر اور حالات و واقعات ۷

ii۔ شخصیت و کردار ۱۱

iii۔ شخصی انفرادیت ۲۸

iv۔ ادبی زندگی کا آغاز ۳۶

v۔ ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ ۴۳

حوالہ جات ۴۹

باب دوم: ڈاکٹر انور سدید کی افسانوی نثر، تجزیاتی و اسلوبیاتی مطالعہ

(الف) ڈاکٹر انور سدید کی افسانوی نثر، مطالعاتی جائزہ ۵۲

i۔ افسانوی ادب روایت اور رجحانات (مختصر جائزہ) ۵۲

ii۔ ڈاکٹر انور سدید کی افسانہ نگاری، ارتقائی سفر ۶۲

(ب) ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ ۶۵

i۔ ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں میں رومانیت اور سماجی حقیقت نگاری ۶۵

ii۔ ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں میں تقسیم ہند، ہجرت اور فسادات کے عناصر ۷۱

iii۔ ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں میں معاشرتی مسائل اور دیہات کی پیش کش ۷۷

(ج) ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں کا اسلوبیاتی مطالعہ ۸۱

حوالہ جات ۹۹

باب سوم: ڈاکٹر انور سدید کی غیر افسانوی نثر کا تجزیاتی و اسلوبیاتی مطالعہ

(الف) ڈاکٹر انور سدید کی سفر نامہ نگاری کا تجزیاتی و اسلوبیاتی مطالعہ ۱۰۲

(ب) ڈاکٹر انور سدید کی انشائیہ نگاری کا فنی و فکری مطالعہ ۱۰۷
(پ) ڈاکٹر انور سدید کی تحریف نگاری کا تجزیاتی و اسلوبیاتی مطالعہ ۱۱۷
(ت) ڈاکٹر انور سدید کی خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کا فنی و فکری جائزہ ۱۲۶
(ٹ) ڈاکٹر انور سدید کی جائزہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ ۱۳۹
(ث) ڈاکٹر انور سدید کی ادبی کالم نگاری کا فنی و فکری مطالعہ ۱۴۶
(ج) ڈاکٹر انور سدید کی تبصرہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ ۱۵۱
(چ) ڈاکٹر انور سدید کی تراجم نگاری کا فنی و فکری جائزہ ۱۶۰
حوالہ جات ۱۶۵

باب چہارم: ڈاکٹر انور سدید کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

(الف) ڈاکٹر انور سدید کی شاعری کا ارتقائی سفر ۱۶۸
(ب) انور سدید کی غزل کا فنی و فکری مطالعہ ۱۷۸
(پ) ڈاکٹر انور سدید کی نظم نگاری کا تجزیاتی و اسلوبیاتی جائزہ ۱۹۸
(ت) ڈاکٹر انور سدید کی نعت نگاری کا تجزیاتی مطالعہ ۲۰۵
(ٹ) ڈاکٹر انور سدید کی قطعات نگاری کا تجزیاتی مطالعہ ۲۰۸
حوالہ جات ۲۱۴

باب پنجم: ماحصل

(الف) مجموعی جائزہ ۲۱۵
(ب) نتائج ۲۲۴
(ج) سفارشات ۲۲۵
کتابیات ۲۲۷

Dr. Anwar Sadeed's Creative Prose and Poem
(Research and Analytical Study)

ABSTRACT:

Dr. Anwar Sadeed is one of the notable writers who contributed a great deal towards the advancement of Urdu literature. His literary contribution can never be underestimated. He is adept at all genres of literature and his input in the field of poetry, short story, essay, translation and journalism are stupendous.This thesis comprises of five chapters. In the first chapter, explanation of key terms, research methodology, introductory information and in-depth study of Anwar Sadeed's life, times and works are discussed in detail. The second chapter focuses on his short stories in relation to content and form. Especially, the oriental aspect of his fiction is brought to the fore with an emphasis on the rural backdrop of his writings. Characterization, themes, situations and other aspects are explored. The third chapter focuses on his non-fiction writings like travelogues, essays, sketches, analytical writings, columns, and translations. His travelogues are not just reporting rather contain a form of knowledge enriched with the experiences and observations of the writer. In his essays, he comments on social inequalities without becoming a rabid castigator. He has also introduced a new style in profile and personality writings as they glow with a personal warmth and colour. He has brought out the nuances of the personalities of notable literary figures of his time. His analytical prose has a flavour of its own and reveals a mind that can dwell on rational and philosophical issues as aptly as he could on emotional ones. His writings reveal that he takes his profession very seriously and aspires to cultivate a poised and balanced approach. Because of his varied and vast study, his columns are also full of wit and wisdom. In chapter 4, his poetic themes and techniques are critically evaluated. His method and skills earned him a unique place among his contemporary poets. In the fifth chapter, findings and recommendations are given.

اظہارِ تشکر

تحقیق زندگی کے عملی میدان میں زندہ معاشرہ کی بنیادی ضرورت ہے۔ تحقیق کسی بھی موضوع پر ہو غیر جانبداری سے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہر صاحب علم کا بنیادی فریضہ ہے۔ تحقیق کا عمل بلاشبہ دُشوار اور اس میں بے شمار کٹھن مراحل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن با مقصد حیات کے لیے تحقیق کا عمل از حد ضروری ہے۔

میں مقالے کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں جس نے ہر طرح کی نعمت بخشی اور خاص کرم کیا اور تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت دی۔ موضوع کا انتخاب ہر طالب علم کے لیے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ لیکن موضوع کے انتخاب کے وقت صدر شعبہ اُردو نمل، اسلام آباد ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ، ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب اور ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ جو کہ میرے لیے خضر راہ ثابت ہوئے۔ اُن کی راہنمائی کی بدولت موضوع کا انتخاب کر سکا۔ میں اِن تمام کا شکر گزار ہوں اور ان کے درجات کی بلندی کے لیے دُعا گو ہوں۔ میں شکر گزار ہوں شعبہ اُردو نمل، اسلام آباد کے انتہائی واجب الاحترام تمام اساتذہ کا جنہوں نے دورانِ تحقیق ہر منزل پر راہنمائی اور ہمت افزائی کی ہے۔

میرے لیے قابل فخر ہے کہ تحقیق کا یہ عمل ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب کی زیر نگرانی پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ دورانِ تحقیق ہر قسم کی راہنمائی اور معاونت کے لیے میں اُن کا تہہ دِل سے شکر گزار ہوں۔ میں اِن تمام احباب کا جنہوں نے تحقیق کے اس عمل میں میری مدد کی اور موضوع سے متعلق مواد فراہم کیا تہہ دِل سے ممنون ہوں۔ بالخصوص بادشاہ الملک، اجمل خان، عبد الشکور رافع، وحید خان (مرحوم)، کمپوزر سید عمران، عزیر عاصم، صائمہ، عائشہ، ذوالفقار احسن، ڈاکٹر سید کامران شاہ صاحب، سید عمران امجد قادری، امتیاز احمد، اور عفت فاطمہ کا تہہ دِل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آخر میں اپنے والدین، بہن بھائیوں اور اہلیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جن کی حوصلہ افزائی اور تعاون کی بدولت تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی ملی۔

ذوالفقار حسین شاہ
پی ایچ۔ڈی سکالر
نمل، اسلام آباد

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف اور ڈاکٹر انور سدید کے احوال و آثار

(الف) تمہید:-

i۔ موضوع تحقیق کا تعارف:

انور سدید اُردو ادب و شعر میں ایک اہم مقام و مرتبے کی حامل شخصیت ہے۔ اُن کی شخصیت اور خدمات کے پہلو متنوع ہیں۔ اُنہوں نے اُردو ادب کی کثیر الجہت اصناف میں طبع آزمائی کی اور مطالعے کی نئی راہیں استوار کی ہیں۔ اُن کی تمام تحقیقی اور تخلیقی اصناف ادب میں وسعت مطالعہ، گہرائی اور گیرائی کا عنصر نمایاں ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی تخلیقات میں بے تکلفی اور احساس کا تاثر ملتا ہے۔

اُنہوں نے ادبی زندگی کا آغاز اُردو افسانے سے کیا ہے۔ تنقید اور تحقیق کے علاوہ اُس نے شاعری ،انشائیہ نگاری، سفر نامہ نگاری، شخصیت اور خاکہ نگاری، تبصرہ نگاری، کالم نگاری اور ترجمہ نگاری میں منفرد کام سرانجام دیا ہے۔ اُن کی افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے ذخیرہ نے سرمایہ اُردو ادب میں خوبصورت اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ مشرق اور مغرب کے ادب کا مطالعہ بھی تواتر سے کرتے رہے ۔اور اس پر اپنی آرا کا اظہار منفرد اسلوب میں کیا۔ کلاسیکی ادب اور معاصر ادب پر بھی قلم فرسائی کی۔ اُردو ادب خواہ پاکستان میں ہو یا بین الاقوامی سطح پر ہو ہمیشہ اُن کے مطالعے میں آتا تھا اور اسی پر اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے جو کہ کثیر تعداد میں بکھرا پڑا ہے۔ انہوں نے اُردو ادب میں سالانہ ادبی جائزے تحریر کیئے جو کہ نہایت طویل ترین ادبی جائزے ہیں۔ اُنہوں نے ۸۰ سے زائد تحقیقی، تنقیدی، تالیفی اور تخلیقی کتابیں لکھی ہیں۔ تصانیف اور تالیف کے علاوہ ادبی صحافتی رسائل میں کالم نگاری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اُردو ادبی کالم نگاری کے عالمی ادب کا بھی شغف رکھتے تھے اور انگریزی رسالے پاکستان ٹائمز، دی اسٹیٹس مین، کراچی ہفتہ وار جریدے سے منسلک رہے۔

اُن کے افسانے فکری و فنی اعتبار سے معیاری صورت کے حامل ہیں۔ انہوں نے شاعری میں فطرت حسن کی تخلیق اور جبلت انسانی کے خواص، مظاہر، انسان کی اُمنگوں، حزن و ملال اور جذباتی کشمکش کے المیوں کا اظہار بطور موضوع ملتا ہے۔ اُنہوں نے الفاظ کی خوبصورتی اور اپنی فنی پختگی کے بل بوتے پر نئی ترکیبیں تراش کر ایک حسین لفظی پیکر تخلیق کیا ہے۔ اُن کا یہ سلیقہ اور ہنر کاری اُنہیں ہم عصر شعراء میں انفرادیت دلاتی ہے۔

اُن کی تخلیقی جہت فنی اور فکری اعتبار سے بھرپور ہے۔ ادبی حلقوں میں ان کی ادبی اصناف کو سراہا گیا ہے۔ اُن کی خدمات کے اعتراف کرنے والوں میں ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ، انتظار حسین، ممتاز مفتی، مرزا ادیب، جوگندر پال، بلراج کومل، منشایاد اور ڈاکٹر خورشید رضوی جیسے احباب شامل رہے ہیں۔ انور سدید کی ادبی زندگی کے تخلیقی گوشوں کو اس مقالہ میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ:

ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ اُنہوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں ایک اہم مقام پایا ہے اور کامیاب لکھنے والوں میں تھے۔ لیکن دنیا میں ایسے لکھاریوں کے ساتھ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اُس کی تصنیفی زندگی کا کوئی ایک پہلو اتنا نمایاں ہو جاتا ہے کہ دیگر پہلو دب جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ ہوا ہے۔ اُن کی نقاد کی حیثیت نے اُن کی دیگر حیثیتوں کو دبا دیا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے نظم و نثر اور دیگر اصناف میں تخلیقی کام کیا ہے۔ اب جب کہ زیر تحقیق مقالے میں اُن کی تخلیقی کاوشوں کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ اس لیے اُن کی تحریروں کا نئے سرے سے مطالعہ کر کے اُن کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ اُن کی تخلیقی اصناف کے موضوعات اور فکری پہلوؤں کی انفرادیت قدر و منزلت اور مخصوص طرز فکر اور اسلوبیات کو اس تحقیق میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

iii۔ مقاصد تحقیق:

زیر نظر تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیش نظر رہے:

۱۔ ڈاکٹر انور سدید کی افسانوی ادب کا تجزیاتی اور اسلوبیاتی مطالعہ کر کے تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر انور سدید کی غیر افسانوی نثر کا تجزیاتی اور اسلوبیاتی مطالعہ کر کے تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر انور سدید کی شاعری کے موضوعات اور فکری پہلوؤں کا مطالعاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ ادبی زندگی کے تخلیقات پر کیا اثرات تھے؟

۲۔ ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی نثر کے اسلوب، فنی اور فکری پہلوؤں کی نمایاں جہات کیا ہیں؟

۳۔ ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی نظم و نثر کا اُردو ادب میں مقام و مرتبہ کیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار:

ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقات نمایاں عناصر کی حامل ہیں۔ اُنہوں نے نظم و نثر میں اقدار، انتشار، زندگی، ثقافت، مسرت کی تلاش اور مؤثر انداز میں حقائق کے اظہار کی ہمت اور حقیقت کو فن کا روپ دیا۔ اگرچہ فن کے اس سفر میں اُن کو اعتراضات کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ لیکن اُنہوں نے ادب میں تجزیہ، فن، استدلال، ادبی صحافت میں منطق اور شخصی جذبات اور تخلیقات میں فطری رویہ اپنایا ہے۔ اُنہوں نے انسانی جبلی تقاضوں اور اس کے ماتحت زندہ رہنے والوں کا بڑے غور سے مشاہدہ ااور اپنی تخلیقات میں سراغ رسانی کے ذریعے سچ کی ترغیب پیدا کی ہے۔ اُن کی نظم و نثر میں ان تمام پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن انور سدید کی ادبی خدمات پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہے: کہ

> "ڈاکٹر انور سدید ایک ہمہ جہت اور متنوع صفات کے حامل تخلیق کار ہیں۔ وہ محقق، نقاد، کالم نگار، افسانہ نگار، مترجم اور شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔۔ اُن کی ہنر مندیوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ وہ اپنے موضوع کا بغور

جائزہ لیتے ہیں اور پھر اس کے محاسن و مصائب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اُن کی تخلیقات اُن کی وسعت مطالعہ ژف بینی اور گہرائی و گیرائی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں"[1]

اس مقالہ میں انہی خصوصی حوالوں سے اُن کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

تحقیقی مقالے میں دستاویزی طریقہ تحقیق کو اپنایا گیا ہے۔ جو استقرائی تحقیق کے زمرے میں شمار ہو تا ہے۔ جس کے پیش نظر موجود مواد کی جمع آوری، تجزیہ اور اس کی روشنی میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

ا۔ اس تحقیق کی بنیاد موضوع سے متعلق مصادر اور ماخذات تک رسائی کے لیے کتب خانوں جن میں مختلف جامعات (انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، نیشنل لائبریری اور نجی کتب خانوں کے ساتھ ساتھ اکادمی ادبیات، مقتدرہ قومی زبان اور نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے اداروں کی طرف رجوع اور استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں ثانوی ماخذات میں تحقیقی و تنقیدی کتب، اخبارات، رسائل اور مقالہ جات کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر انور سدید کے متعلق معلومات اور تخلیقات کے بارے میں دریافت کے لیے ان کے قریبی اشخاص اور لواحقین سے بالمشافہ ملاقات اور سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

۳۔ ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویوز اور اُن کے متعلق مختلف ادیبوں کے قیمتی آرآ کو بھی شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ موضوع سے متعلق میسر مواد میں، ڈاکٹر انور سدید کے اُنیس افسانے، اُنیس انشائیے، تحریف نگاری میں ان کے پندرہ خطوط، خاکے اور شخصیت نامے، ۱۹۷۷ سے ۲۰۰۸ تک ادبی جائزے، ۱۹۷۷ سے ۲۰۱۶ تک ادبی کالم، کُتب پر تبصرے، ۷ تراجم، ۴۹ غزلیں، ۵۰ نعت اور پندرہ قطعات شامل ہیں۔ جن کا نظری مطالعہ کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

انور سدید کی علمی و ادبی خدمات پر مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ جامعاتی سطح پر اُن کی بطور نقاد اور علمی و ادبی حیثیت کا کام ہوا ہے۔ لیکن تخصیص کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی نظم و نثر پر کام تا حال نہیں ہوا

ہے۔ یہ مقالہ اس نوعیت کے اعتبار سے انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ اس سے قبل اُن کی تنقیدی حیثیت پر کام ہوا ہے۔ جب کہ یہ مقالے ایم۔ اے اور ایم فل سطح کے ہیں۔ جو کہ تعارفی نوعیت کے ہے۔ انور سدید کی خدمات کئی جہات میں ہیں۔ اس تحقیقی مقالے میں اُن کی تخلیقی نظم و نثر کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جو کہ ما قبل اس موضوع پر کسی جامع نے تحقیقی کام نہیں کیا ہے۔ اُن پر تحریر کیئے گئے چند معلوم مقالوں کی تفصیل درج ہیں۔

ا۔ نعیم بزمی "انور سدید کی ادبی خدمات" مقالہ برائے ایم۔ اے (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۷ء (غیر مطبوعہ)

۲۔ مسرت شاہین "ڈاکٹر انور سدید بطور نقاد" مقالہ برائے ایم۔ فل (اُردو)، سرگودھا یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء (غیر مطبوعہ)

یہ مقالے ان کی حیات میں تحریر کیے گئے ہے۔ جب کہ اُن کی تخلیقی سرگرمیاں تادم آخر جاری رہی تھی۔ اُن کا تخلیقی ادب غیر معمولی ہے۔ اس لیے پی۔ ایچ۔ ڈی سطح پر اُن کی نظم و نثر کا بغور جائزہ از حد ضروری ہے۔

Viii ۔ تحدید:

زیر نظر مقالہ میں " انور سدید کی تخلیقی نظم و نثر " کو ہی دیکھا گیا ہے۔ افسانوی نثر میں اُن کے افسانوں کا تجزیاتی و اسلوبیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جب کہ غیر افسانوی نثر میں اُن کی سفر نامہ نگاری، انشائیہ نگاری، تحریف نگاری، شخصیت نگاری، جائزہ نگاری، ادبی کالم نگاری اور تبصرہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی شاعری میں غزل گوئی، نظم نگاری، نعت نگاری اور قطعات نگاری کو موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔ اُن کی تحقیق، تنقید، تاریخ اور تالیفات ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

انور سدید کا شمار معتبر اور معروف ادیبوں میں ہوتا ہے۔اُن کی ادبی زندگی تخلیقی سرگرمیوں سے بھر پور گزری ہے۔اُن کی تخلیقیات پر معروف محققین اور ناقدین کی آراء میسر ہے۔جس میں اُنہوں نے ان کے فکر اور فن پر بحث کرتے ہوئے ان کے مقام اور مرتبے کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔اس موضوع تحقیق میں اُن کی یہ آراء مفید رہی اور راہنمائی حاصل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس عہد کے معاصر ادب، رویے رحجانات، تحریکوں، معاشرتی حالات اور واقعات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی اہم کتابوں میں "پاکستانی اُردو ادب" از ڈاکٹر رشید امجد، "جدید اُردو افسانے کے رحجانات" از ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، "انور سدید فن اور شخصیت" از سجاد نقوی اور "انوار ادب" از ڈاکٹر ہارون رشید تبسم شامل ہیں۔

X۔ تحقیق کی اہمیت:

اُردو ادب میں ڈاکٹر انور سدید کا کام بہت سی جہتوں پر مشتمل ہے۔اُن کی تنقید اور تحقیق کی جہتوں پر مختلف ناقدین اور محققین نے تنقید اور تحقیق کی ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو فکر اور فن کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ تنقید اور تحقیق کے میدانوں کے علاوہ انہوں نے نظم و نثر میں بھی غیر معمولی کام کیا ہے۔ لیکن تنقیدی اور تحقیقی کام کے حجم نے اُن کی تخلیقی زاویوں کو دبا دیا تھا۔ اُن کی کارکردگی ادبی اصناف میں غیر معمولی ہے۔ اس لیے ان کا تحقیقی مطالعہ اہمیت کا حامل ہے۔ انور سدید نظم و نثر میں بھی تنقید کی طرح ایک منفرد سوچ، صاحب اسلوب اور رحجان ساز ادیب ہے۔ نظم و نثر میں انہوں نے مطالعے کی نئی راہیں استوار کی ہے۔ اس مقالہ میں اُن کی تخلیقات کا تخصیص سے مطالعہ کر کے اُن کے مقام اور مرتبے کا تعین کیا ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اس موضوع کی اہمیت اور بڑھ جائے گی۔

(ب) ڈاکٹر انور سدید کے احوال و آثار:

(I) ۔ خاندانی پس منظر اور حالات وواقعات:

ڈاکٹر انور سدید سرگودھا شہر کے قصبہ میانی تحصیل بھلوال میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام مولوی امام الدین تھا۔ ان کے والد مولوی امام الدین کے چار بھائی تھے جبکہ بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام مولوی کریم الدین تھا۔ مولوی کریم الدین مجلس احرار کے رکن اور سرگودھا شہر کے امیر تھے۔ اس سے قبل ان کے دو بھائی سراج الدین اور شمس الدین جواں عمری میں وفات پا گئے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کے آباؤ اجداد کشمیر (سری نگر) سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا تعلق ان ایک نو مسلم راجپوت خاندان سے ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے سسر میاں بشیر احمد خاندانی پس منظر کی روایت بیان کرتے ہیں کہ:

> "یہ خاندان سری نگر میں رہتا تھا اور بدستور ہندو مذہب سے وابستہ تھا آزادی سے پہلے سری نگر سے ایک ہندو شجرہ نویس سرگودھا آیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ہمارے خاندان کی جنم پتریاں بھی تھیں۔ اس کی روایت کے مطابق اٹھارویں صدی کے آخر میں ہمارے خاندان کے ایک بزرگ نے کشمیر کے ایک ولی اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلام قبول کیا۔ ڈوگرہ راج میں یہ خاندان نقل مکانی کر کے گجرات کے راستے بھیرہ میانی پہنچا اور پھر یہیں آباد ہو گیا۔"(۱)

ڈاکٹر انور سدید کے دادا کا نام میاں الٰہ دین تھا اور ضلع سرگودھا کے قصبہ بھیرہ میں قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کے دادا نیک اور پارسا انسان تھے۔ جس کا چرچا پورے شہر میں تھا۔ اُن کی والدہ کا نام صالحہ خاتون تھا۔ ان کی والدہ اسلامی اقدار و روایات کی سخت پابند تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرتی تھیں۔ اولاد کی تعلیم و تربیت میں اسلامی شعار کی پابندی کرتی تھیں یہاں تک کہ گھر میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر موسیقی یا دیگر انٹرٹینمنٹ پروگرام دیکھنے پر پابندی تھی۔ خبریں اور مذہبی پروگرام دیکھنے میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ صالحہ اور گھریلو خاتون تھیں۔ مولوی امام دین کی کل آٹھ اولادیں ہوئیں جن میں پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑے بیٹے فیروز الدین نور تھے جو سیشن کورٹ سے بحیثیت ہیڈ کلرک ریٹائرڈ ہوئے اور ۱۹۸۰ میں وفات پائی۔ دوسرے بیٹے کا نام معراج الدین تھا جو محکمہ آبپاشی سے چیف ڈرافٹسمین ریٹائر ہوئے اور ۱۹۹۰ میں وفات پائی۔ میاں معراج الدین اور فیروز الدین ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انور سدید کی

ادبی تربیت میں دونوں بھائیوں کا کردار اہم تھا۔ ڈاکٹر انور سدید کے تیسرے بھائی کا نام محمد یوسف تھا جو کہ لندن میں مقیم تھے۔ عارضہ قلب کے سبب ۲۶ اپریل ۲۰۰۲ء کو وفات پائی۔

"ڈاکٹر انور سدید کی تین بہنوں میں سے سکینہ بیگم اور زینت پروین کا انتقال ہو چکا ہے۔ فضیلت بیگم اپنے میاں حاجی رفیق صاحب اور بیٹے بہوؤں کے ساتھ لاہور میں مقیم ہیں۔" (۲)

ڈاکٹر انور سدید ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء میں قصبہ میانی تحصیل بھلوال میں پیدا ہوئے۔ اپنی ولادت کے بارے میں انور سدید خود لکھتے ہیں کہ:

"میری زندگی کا سفر کب شروع ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ اور وقت شاید اب بتانا مشکل ہے۔ سکول کے سرٹیفکیٹ میں میری تاریخ پیدائش ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء ہے۔ لیکن والدہ بتاتی تھیں کہ میں دریائے جہلم کی بڑی طغیانی کے دنوں میں پیدا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے میری پیدائش وسط جولائی ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ پرانی ہے۔"(۳)

تعلیمی اسناد کے مطابق ڈاکٹر انور سدید کا اصل نام محمد انوار الدین تھا اور انور سدید ان کا ادبی و قلمی نام تھا۔ ان کا تعلق راجپوت خاندان سے تھا۔ محمد انوار الدین سے انور سدید کی کہانی سناتے ہوئے پروفیسر سجاد نقوی بیان کرتے ہیں کہ:

"ہمایوں، میں انور صاحب نے محترمہ زبیدہ بیگم کا افسانہ "سفر کا مقصد" پڑھا اور اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی زمانے میں انور سدید نے و۔ ب۔ سدید کا ناول "بیاضِ سحر" پڑھا۔ 'سدید' کا لفظ اچھا لگا تو اسے اپنے نام کے ساتھ لگا لیا۔"(۴)

ڈاکٹر انور سدید نے زمانے کی روایات کے مطابق مذہبی تعلیم سے تعلیمی سفر کا آغاز کیا۔ مذہبی تعلیم اپنے والد اور والدہ سے گھر پر ہی حاصل کی۔ ابتدائی تعلیمی مدارج اسلامیہ پرائمری سکول سرگودھا، ایم۔ سی پرائمری سکول سرگودھا اور میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے نمایاں پوزیشن سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد سول انجینئرنگ کالج رسول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۸ء میں انجینئرنگ کے امتحان میں امتیازی پوزیشن لے کر کامیاب ہوئے اور محکمہ آبپاشی میں بطور اوور سیئر بھرتی ہو گئے۔ ملازمت کے دوران ادیب

فاضل کا امتحان بدرجہ اول پاس کیا۔ انہوں نے ایم۔ اے اُردو پرائیویٹ اور پی۔ ایچ۔ ڈی اردو کا مقالہ اُردو ادب کی تحریکیں وزیر آغا کی نگرانی میں مکمل کر کے پنجاب یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ اُردو ادب کی تحریکیں جیسا دقیع مقالہ انور سدید کا اُردو ادب کے ساتھ دلچسپی کا سبب ہے۔ کیونکہ اُردو ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ان کے ذہن میں کوئی معاشی فائدہ یا ملازمت کا جذبہ کار فرما نہیں تھا۔ محکمہ آبپاشی میں ملازمت کے دوران ہی ادب سے ان کا رشتہ استوار رہا اور ادب سے ناطہ نہ ٹوٹ پایا۔

ڈاکٹر انور سدید کا تعلیمی کیریئر تعلیمی اہمیت کے تصور کو فروغ دیتا ہے۔ انہوں نے تمام تعلیمی مراحل اپنی ذاتی استعداد کے بل بوتے پر طے کیے جس سے ان کی محنت، مشقت اور ریاضت کا بخوبی اندارہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی شادی ۹ مئی ۱۹۵۶ء میں محترمہ نصرت بیگم سے ہوئی۔ نصرت بیگم کے والد کا نام میاں بشیر احمد تھا۔ بشیر احمد، ڈاکٹر انور سدید کے سسر اور کزن بھی تھے۔ نصرت بیگم کی سات بہنیں اور ایک بھائی گل محمد تھا۔ گل محمد کی پیدائش کے بعد بشیر احمد کی اہلیہ وفات پا گئیں۔ نصرت بیگم نے ماں کی وفات کے بعد بھائی کو گود میں لیا اور پانچ سال تک اپنے بھائی کی پرورش کی تھی۔

> "ڈاکٹر انور سدید کے والد محترم کے بھائیوں میں ایک بھائی مولوی شمس الدین کا ذکر آیا ہے۔ جو جوانی میں وفات پا گئے تھے۔ ان کے بیٹے میاں بشیر احمد کی پرورش ان کے والد کی وفات کے بعد انور سدید کی والدہ صاحبہ نے کی تھی انہوں نے ہی طے کیا تھا کہ بشیر احمد کی شادی کے بعد ان کی جو پہلی بیٹی پیدا ہو گی وہ ان کی بہو بنے گی۔ گویا انور سدید کی منگنی ان کی بیوی کی ولادت سے بھی پہلے طے پا گئی تھی۔"(۵)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انور سدید خاندانی روایات کے بندھن میں بندھے نظر آتے ہیں، تقریباً یہی حالت تسلسل کے ساتھ خاندانی پس منظر میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جو آگے جا کر مضبوط رشتوں اور سلسلہ وار کڑیوں کا سراغ ملتا ہے۔ مضبوط خاندانی نظام، مذہبی روایات کی پابندی اور والدین کے فیصلوں کے احترام نے ان کی زندگی پر مثبت اثرات ڈالے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے ہاں چار اولادیں ہوئیں۔ ان کے چار بیٹے ہیں بڑے بیٹے مسعود احمد، ایم ایس سی (حیوانات) ہیں اور پولٹری کی صنعت سے وابستہ ہیں۔ ان سے چھوٹے محمد امتیاز ایم بی بی ایس، ایف سی پی ایس

سرگودھا میں بچوں کے ڈاکٹر ہیں۔ تیسرے بیٹے انس اعجاز بی۔ ایس۔ سی کیمیکل انجینئر ہیں اور لاہور پیپر ملز میں بطور انجینئر کی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ سب سے چھوٹے صاحب زادے ندیم بی۔ ایس۔ سی مکینیکل انجینئر ہے اور سرگودھا میں احمد فیبر کس کے نام سے کپڑے کا ایک تجارتی ادارہ چلا رہے ہیں۔ انور سدید اولاد کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ:

"ہم کم بچے خوش حال گھرانہ کی مثال شاید قرار دیئے جا سکیں" (۶)

انور سدید کی کوئی بیٹی نہیں تھی تاہم بیٹی نہ ہونے پر مایوس نہیں تھے اور یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

"میں چار پلی پلائی بیٹیاں، بہوؤں کے روپ میں لے آیا ہوں۔" (۷)

ان کا یہ جملہ اُن کی بہوؤں سے گہری پیار و محبت کی عکاسی کرتا ہے۔ اولاد کی تعلیم و تربیت اور درخشاں مستقبل سے انور سدید کا بطور باپ گھر کے ذمہ دار فرد ہونے کا تاثر ملتا ہے۔ پیشہ سے منسلکی، ادب سے دلچسپی اور کل وقتی ادیب ہونے کے باوجود اولاد کی تعلیم و تربیت اور امور خانہ داری میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہے۔

انور سدید نے ملازمت کا آغاز محکمہ آبپاشی سے بطور کلرک شروع کیا۔ لیکن انور سدید اس سے مطمئن نہ تھے۔ بعد ازاں سول انجینئرنگ کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسی محکمہ میں اوور سیئر کے عہدے پر تعینات ہو گئے تھے۔ انہوں نے تھل کینال، مرالہ راوی لنک، قائد آباد پاور ہاؤس، وارسک ڈیم، بی آر بی لنک، سمندری ڈرینج، بی آر بی کینال جیسے بڑے پراجیکٹ کی تعمیر میں مثالی خدمات سر انجام دیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ میں لاہور کے لیے حد محافظ کا فرضہ بھی نبھایا جس نے پاکستان کے دفاع میں نمایاں کردار ادا کیا۔

انور سدید ۱۹۶۴ء میں بطور ایس۔ ڈی۔ او اپنے آبائی شہر سرگودھا تعینات ہوئے۔ ایس۔ ڈی۔ او کی حیثیت سے سرگودھا، فیصل آباد، لاہور اور دیگر شہروں میں مقیم رہے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے پر تقرری کے بعد لاہور سیکریٹریٹ پہنچے اور زیادہ تر عرصہ یہیں پر گزارا اور لاہور میں "علامہ اقبال ٹاؤن" میں ستلج بلاک میں پانچ مرلے کا گھر بھی تعمیر کر لیا تھا۔

محکمہ آبپاشی سے ۱۹۸۸ء میں ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہوئے۔ محکمہ آبپاشی سے ریٹائرمنٹ کے بعد تمام تر سرگرمیاں اُردو ادب کے لیے وقف کر دیں اور مختلف اخبارات میں بطور مدیر اور کالم نگار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ملازمت کے دوران بھی اخبارات اور مختلف جرائد سے منسلک رہے۔

وہ روزنامہ مشرق، جسارت، حریت، خبریں، نوائے وقت، ہفت روزہ "ندائے ملت، ادب در ادب، ہفت روزہ فیملی میگزین، پاکستان ٹائمز اور دی اسٹیٹسمین" سے وابستہ رہے اور کالم نگاری کے ساتھ بطور مدیر قومی ڈائجسٹ، خبریں اور نوائے وقت میں کام کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بیرون ملک ادبی کانفرنسز میں بھی پاکستان کی نمائندگی کی تھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی (انڈیا) مقالہ "غالبیات شیخ محمد اکرام" اور انجمن ترقی اُردو، دہلی (انڈیا) مقالہ "مولوی عبد الحق کی صحافت" کے مقالہ جات پڑھے تھے۔ ان کے علاوہ اندرون ملک ادبی کانفرنسوں میں بھی شرکت کرتے رہے اور مقالہ جات پیش کیے۔

(ii) شخصیت و کردار:

انور سدید کی شخصیت و کردار کو بحیثیت باپ اور شوہر، دوست، دیانت داری اور ایثار، معاصرین ادب کی نظر میں، نجی زندگی، ادبی زندگی اور بحیثیت کُل وقتی ادیب ان پہلوؤں سے جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔۔ فرخندہ لودھی انور سدید کی نجی زندگی کے احوال کے متعلق بیان کرتی ہیں کہ:

> "یہ نکتہ شاید میں نے ہی اُٹھایا تھا کہ گوشۂ انور سدید اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جائے گا جب بھائی صاحب کی نجی زندگی کی جھلکیاں سامنے نہ آئیں۔ بھائی صاحب کے بارے میں، میں زیادہ نہیں جانتی۔ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ دیو قامت مطبوعات اور کاٹ دار طرز تحریر کے باوجود بہت اچھے بھائی ہیں۔ شفیق والد، ذمہ دار شوہر اور بامروت رشتہ دار ہیں۔ دوست تو خیر وہ جس کے ہوتے ہیں۔ اس کے دشمنوں کے دشمن پکے ہوتے ہیں اور ٹھنے ٹھنائے رہتے ہیں۔ قلمی میدان میں وہ قلم ٹھونک کے لڑتے ہیں۔ گھریلو زندگی میں نہایت پسپا اور صلح کن۔ نہ چوں نہ چراں۔" (۸)

انور سدید کی جملہ خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ عملی زندگی کی مصروفیات اور سرگرم ادبی زندگی کے باوجود اولاد کی تعلیم و تربیت، پرورش اور ذمہ داری سے غافل نہیں رہے تھے۔ ان کی خانگی زندگی نہایت پرسکون اور کامیاب رہی تھی۔ اولاد کی تعلیم و تربیت کی خاطر سخت کوبی لہجے بھی کبھی کبھار آزمائے۔ جس کی وجہ سے ان کے چاروں صاحبزادے لائق فائق، سعادت مند، محنتی اور بہتر سے بہتر کی تلاش میں سختی سے کاربند ہیں۔ انور سدید کی یہ خوبی اُسے دیگر قلم کاروں سے منفرد رکھتی ہے۔ کیوں کہ عام طور پر زیادہ تر ادیبوں کی زندگی خانگی مسائل سے اٹی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے گھریلو ذمہ داریوں سے اکثر نبرد آزما رہتے

ہیں۔ انور سدید کا شمار اُن چند ادیبوں میں ہو سکتا ہے جن کی خانگی زندگی اور معاشی حالات اب تک کے تمام دیگر ادیبوں کے مقابلے معتدل رہے ہیں اس لحاظ سے اُن کو خانگی اور معاشی طور پر خوشحال ادیب قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کی تعلیم وتربیت میں سختی بھی برتتے تھے۔ مسعود انور اس حوالے سے واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

"۱۹۷۳ء میں میٹرک کے بعد میرا داخلہ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ہوا تو یہاں کے ادبی ماحول نے مجھے بھی متاثر کیا اور میں نے افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ جب اباجی کو پتا چلا تو حوصلہ افزائی کے بجائے اُنہوں نے سختی سے ڈانٹا اور اپنے اُستاد والا سبق مجھے بھی دیا مگر میں نظر انداز کرتا رہا، وہ کہتے تم سائنس کے طالب علم ہو پہلے اپنا کیریئر بناؤ۔ پھر لکھنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے لکھتے رہنا۔ بارہ چودہ افسانے چھپوانے اور دو سال امتحانات میں سپلیاں لینے کے بعد مجھے عافیت اباجی کی بات ماننے میں ہی نظر آئی اور میں نے زرعی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ کیریئر بنانے کا سبق اُنہوں نے ہر اُس نوجوان کو دیا جو اُن سے ملنے کے لیے آیا۔ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اگر اباجی کو نہ ملتے تو شاید زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے۔"(۹)

انور سدید کے مزاج میں سادگی، فراخی اور وسعت تھی۔ انکساری کی صفت نے اس میں معصومیت اور گہرائی بھی پیدا کر دی ہے۔ مشہور افسانہ نگار عذرا اصغر نے انور سدید کی سادگی، انکساری اور خلوص کی وجہ سے انہیں درویش ادیب قرار دیا ہے۔ اپنے مضمون میں لکھتی ہیں کہ:

"انور سدید میرے گھر آئے تو مجھے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی، انور سدید کی سادگی اور انکساری نے مجھے اور بھی متاثر کیا، خاکساری کا انداز انہوں نے خود پر طاری نہیں کیا یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ "(۱۰)

انور سدید کے کردار میں دیانت اور خلوص کی کارفرمائی نمایاں تھی۔ ایثار، قربانی اور شفقت انور سدید کی شخصیت کا دل آویز پہلو تھا۔ اس کے علاوہ ایثار اور احسان کا ایک اور قابلِ تقلید واقعہ بیگم افضل کے خطوط سے اخذ کیا جاتا ہے جو انہوں نے انور سدید کے نام پر لکھے تھے۔ انور سدید کے محکمے کے ایک افسر خواجہ محمد افضل کار کے حادثے میں اچانک موت کا شکار ہوگئے۔ ان کی بیوہ اور چار چھوٹے بچے دنیا میں بے

یارو مددگار تھے۔ حادثے کا مقدمہ سرگودھا کی ایک عدالت میں چل رہا تھا۔ خواجہ افضل کا خاندان لاہور میں مقیم تھا۔ مقدمہ طاقت ور اور صاحب اقتدار افراد کے ساتھ تھا اور لاچار خاندان کے لیے مقدمہ کی پیروی میں مشکلات درپیش تھیں۔ اس موقع پر انور سدید نے اس دُکھی خاندان کا ساتھ دیا۔ اور چھ سال کے بعد ایک لاکھ ستاون ہزار کی ڈگری لینے میں کامیاب ہوگئے۔ انور سدید نے یہ گراں قدر رقم ایک مقامی بنک میں محفوظ رکھ دی۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ لڑتے رہے اور ہر چھ ماہ کے بعد فکسڈ ڈیپازٹ کا منافع بیگم افضل صاحبہ کو پہنچاتے رہے۔ بالآخر جب مقدمہ ہائی کورٹ سے بھی جیت لیا تو امانت کی رقم بیگم افضل کو پہنچا کر گویا اطمینان کا سانس لیا۔ موصوفہ نے خطوط میں ان کے نام شکریہ اور صادق جذبے سے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔

قناعت، انکساری اور سادگی ان کے مزاج میں شامل تھی۔ دیانت داری اور خود داری کا پہلو ان کی عملی اور ادبی زندگی میں بکثرت ملتا ہے۔ اسی دیانت داری اور خودداری نے اُن کی زندگی کو باوقار اور مطمئن بنایا اور تحریروں میں بھی اُن کی صاف گوئی اور حق سچ کی تلقین کا اظہار ملتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت کے ضمن میں ڈاکٹر خورشید رضوی نے ان کی جرات اظہار اور دیانت دارانہ صاف گوئی کا درج ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے:

> "انور صاحب نے بے دھڑک بات کہنے کی جس جرات کا اظہار کیا ہے۔ وہ خاصی مشکل چیز ہے۔ ذاتی گفتگو میں انہوں نے خود کو بنیادی طور پر سادہ اور دیہاتی قرار دیا تھا۔ جو چھپا کر بات کہنے اور اپنے حقیقی جذبات کو مخفی رکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ یہ بات ان کے حوالے سے بالکل درست ہے۔ وہ بنیادی سرشت اور فطرت کے اعتبار سے صاف گو آدمی ہیں۔ جو اپنے دلی جذبات کے اظہار سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا۔ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ "سدید" کا جو اضافہ کیا ہے۔ وہ بھی اس بنیادی رجحان کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ لفظ انہوں نے قرآن حکیم سے اخذ کیا ہے اور جس آیت کریمہ سے لیا وہ وہ یہ ہے " قولواً قولاً سدیداً" (سیدھی اور کھری بات کرو)۔ اپنے قلمی نام کے طور پر اس لفظ کا انتخاب ان کی ابتدائی مذہبی تربیت اور دیانتدارانہ صاف گوئی کی خواہش کا پتہ دیتا ہے۔ "[11]

یہ تعریفیں ان کی شخصیت کی خصوصیات بحیثیت سربراہ خاندان، دوست، اخلاص، مہمان نوازی، انکساری اور دیانت داری ان کے رفقاء نے اپنے تاثرات میں اظہار خیال کیا۔ بحیثیت افسر، ادیب اور احباب کے ساتھ تعلق کے بارے میں ان کے ہم عصر و ہم کار ساتھیوں کی آراء کو دیکھنا ہو گا۔

منور عثمانی اُن کی کتاب " سعید صورتوں " میں ان کی شخصیت و کردار کا مشاہدہ کرتے ہوئے، سعید صورتوں کے تذکرے میں انور سدید کی جو اپنی صورت ابھرتی ہے۔ وہ ایک وضع دار اور دیانت دار شخص کی ہے۔ جو استفادے کا اعتراف اور احسان مندی کا اظہار بر سرعام کرنا جانتا ہے۔ بعض اوقات موضوع سے گریز کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ لیکن اس گریز کے عقب میں فکری و شخصی نمود و نمائش کے جذبے کے بجائے احساسات کا دباؤ یادوں کا بہاؤ اپنا زور دکھا رہا ہوتا ہے البتہ اس گریز پائی سے مضمون میں موضوعیت اور شخصی والہانہ پن دوچند ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں منور عثمانی رقم طراز ہے کہ:

> "شاید تمام تر علمی و ادبی اختلافات، تنازعات اور تعصبات کے باوجود اس بات سے کوئی انکار نہ کرے کہ انور سدید جن خوبیوں کی بنیاد پر کسی دو " سعید صورت " قرار دے رہے ہیں، وہ خوبیاں خود انور سدید میں بھی موجود ہیں مثلاً درویشی، دیانت داری، راست گوئی، اسی طرح احسان مندی، محسن شناسی، ادیب نوازی، کتاب دوستی اور محنت شاقہ اور ایک ان تھک تصنیفی و تالیفی سلسلہ جاریہ۔۔۔۔۔۔"(۱۲)

ڈاکٹر انور سدید کی زندگی کا ایک اہم پہلو جس نے انھیں بنایا بھی اور بگاڑا بھی، وہ گروہ بندی اور معاصرانہ چشمک سے عبارت ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں پاکستانی اُردو ادب میں احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے درمیان ہونے والی گروہ بندی نے بعض اوقات افسوس ناک صورتحال بھی اختیار کی ہے۔ اس گروہ بندی نے ان کی ادبی حیثیت کو متنازعہ اور جانبدار بھی بنایا ہے۔ ناصر عباس نیر اس صورتحال کے متعلق بیان کرتے ہے کہ:

> "انور سدید نے آخری دم تک وزیر آغا سے فکری اور جذباتی تعلق کو قائم رکھا۔ ہر لکھنے والے کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے، جب وہ اپنے اساتذہ، مربیوں۔ یہاں تک کہ اپنے والدین سے خود کو مختلف محسوس کرتا ہے۔ اور اس کی ایغو ایک الگ اپنی پہچان بنانے پر اُسے سخت مجبور کرتی ہے۔ ذہین

آدمی کے یہاں یہ وقت خاصا جلدی آجاتا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ انور سدید نے اپنی تحریروں میں کہیں ظاہر نہیں کیا کہ ان کی ایغو نے اُنھیں وزیر آغا کے اثر سے آزاد ہونے پر مجبور کیا ہو۔ وزیر آغا کا انتقال ستمبر ۲۰۱۰ء میں ہوا، تو اس کے بعد بھی انھوں نے آغا صاحب کو مسلسل یاد رکھا۔ یہی نہیں انور سدید کے ادب کی دنیا کے اہم ترین دوست بھی وہی بنے جو رسالہ اوراق میں لکھنے والے تھے۔ اور مخالفین بھی وہی بنے جو اوراق کے حریف فنون میں لکھنے والے تھے۔ سرگودھا اور وزیر آغا سے جذباتی وابستگی بعض اوقات انھیں غلو سے کام لینے کی ترغیب دیتی تھی، اور وہ آسانی سے اُس کا شکار ہو جاتے تھے یہ غلو دوستوں اور مخالفین دونوں کے لیے تھا۔"(۱۳)

فنون اور اوراق نے جہاں اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا وہاں انہوں نے اُس وقت کی ادبی معرکہ آرائی کے صورت میں دلچسپ صورتحال کو بھی جنم دیا اور ادبی معرکہ آرائی کی صنف کو بھی بام عروج پر پہنچایا۔ اس صنف ادب کی ترویج میں کئی نامور اہل قلم کا لازوال حصہ ہے اور یہ کوئی آج کا قصہ نہیں ہے۔ مصحفی و انشاء، شرر اور چکبست، مولانا آزاد اور مولانا ماجد، اوپندر ناتھ اشک اور سعادت حسن منٹو، چراغ حسن حسرت اور ایم ڈی تاثیر، سر سید احمد خاں اور اکبر الہ آبادی، معرکہ حمایت علی شاعر اور محسن بھوپالی، منیر نیازی و جون ایلیا اور جمیل یوسف اور ظفر اقبال کے درمیان چپقلش سے ایک دنیا واقف ہے۔ اور پھر اُدھر نارنگ و شمس الرحمان فاروقی، احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے درمیان رسوائے زمانہ معرکے کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ موخر الذکر میں ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی بقدر ظرف اپنا اپنا حصہ ڈالا اور اسے ترقی کے بام عروج پر پہنچا دیا۔ ادبی چپقلشوں کے تعلق سے اس ضمن میں کئی لطیفے بھی مشہور ہوئے۔ مشفق خواجہ نے شاہد دہلوی اور جوش ملیح آبادی کے درمیان چپقلش کے تعلق سے نومبر ۱۹۹۵ کے ایک کالم میں یہ پر لطف واقعہ درج کیا ہے جس میں ڈاکٹر انور سدید کا ذکر بھی موجود ہے:

"مصطفی زیدی نواب شاہ سندھ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انہوں نے ایک ادبی کانفرنس منعقد کی اور اس میں شاہد احمد دہلوی اور جوش ملیح آبادی کو مدعو کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان دونوں میں زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ مصطفی زیدی نے ان دونوں بزرگوں کو کراچی سے نواب شاہ لے جانے کا کام طفیل

احمد جمالی کے سپرد کیا۔ سفر ریل گاڑی سے کرنا تھا، اس لیے جمالی نے ایک گاڑی سے جوش صاحب کو روانہ کیا اور دوسری سے شاہد صاحب کو لے کر وہ خود نواب شاہ پہنچے۔ مصطفی زیدی نے جمالی سے کہا: " اگر آپ ان دونوں کو ایک ہی گاڑی سے لے کر آتے تو مجھے استقبال کے لیے دو مرتبہ ریلوے اسٹیشن پر آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔۔۔ جمالی نے جواب دیا: آپ کو اپنی زحمت کا تو خیال ہے لیکن اس کا خیال نہیں کہ اگر یہ دونوں بزرگ ایک ساتھ سفر کرتے اور راستے میں ان کے درمیان صلح ہو جاتی تو اس حادثے کا کون ذمہ دار ہوتا؟" خواجہ صاحب نے مزید لکھا: "اس واقعے سے جو اخلاقی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے، اس کی بنا پر ہمارا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کو کسی محفل میں یک جا نہیں ہونا چاہیے۔ "(۱۴)

۱۹۸۱ء میں جریدہ نقوش نے اس سنگین صورتحال کے پیش نظر ادبی معرکوں پر ایک خاص نمبر چھاپا۔ ممکنہ طور پر مشاہیر ادب کو آپس میں نبرد آزما دیکھایا گیا ہے۔ نقوش کے اس جریدے میں دلچسپ کارٹون بھی پیش کیے گئے جو کہ اُس وقت مختلف ادیبوں کی معرکہ آرائی کی صورتحال کی عکاسی کر رہے تھے۔ مشفق خواجہ اس ساری صورتحال کا دلچسپ انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہے کہ:

خدا سلامت رکھے ڈاکٹر انور سدید کو کہ اس قوی صنف ادب اور اپنے ترکش، دونوں کو نہ صرف فعال رکھا ہوا ہے بلکہ شنید ہے کہ ترکش کا آخری تیر سائنایڈ میں بجھا کر اپنے آخری زندہ بچ جانے والے دشمن کے لیے محفوظ کیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کو شکایت ہے کہ بعض لوگ انہیں "زبان دراز سر گودھوی" کہتے ہیں اور بعض وزیر آغا کا مزارع ۔ڈاکٹر سدید نے تمام زندگی بقول شخصے ' نہر کے موگے توڑ' محکمے میں بحیثیت انجینئر نوکری کی ، ساتھ ساتھ ہی ساتھ وہ ادبی نہر کے موگے توڑنے میں بھی تندہی سے مصروف رہے۔ توڑ پھوڑ کا یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔(۱۵)

ڈاکٹر انور سدید کی کثیر التعداد تصنیفات اور ڈاکٹر صاحب کی احمد ندیم قاسمی سے چپقلش کو مشفق خواجہ نے ایک ہی جگہ کچھ یوں باندھا ہے:

"ڈاکٹر انور سدید کی تصانیف پڑھنے کا کام خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا خطرناک بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے ذریعے حاصل کردہ علم تو بے ضرر ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب بھی اسے اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتے اور قارئین میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے بلڈ پریشر میں اضافہ کیوں ہوتا ہے، اس کی تفصیل میں جانے کے بجائے ہم یہ بتائے دیتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی تازہ تصنیف ' دلی دور نہیں' پڑھنے کے دوران ہم پر کیا گزری۔ احمد ندیم قاسمی کا ذکر اس سفر نامے میں ایک درجن سے زیادہ مرتبہ کیا گیا ہے اور ہر جگہ سخن گسترانہ انداز میں ہے۔ حیرت ہے کہ دلی میں بھی ڈاکٹر انور سدید نے احمد ندیم قاسمی کا پیچھا نہ چھوڑا، مثلاً ۱۹۸۸ کے لاہور کے فیض میلے میں بعض سخن ناشناسوں نے قاسمی صاحب کو کلام نہیں سنانے دیا۔ اس واقعے کا دلی یا دلی کے سفر نامے سے کوئی تعلق نہیں لیکن داد دیجیے ڈاکٹر انور سدید کو کہ انہوں نے اس واقعے کا کئی مرتبہ ذکر کیا ہے۔ انداز یہ اختیار کیا ہے جیسے سخن ناشناسوں کی یہ حرکت انہیں ناگوار گزری ہو لیکن بین السطور سے دلی مسرت پھوٹی پڑتی ہے۔"(۱۶)

ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت کا یہ پہلو بحثیت نقاد ہے۔ ان کی تحریروں کی ترشی اور کڑواہٹ مخالفین کو ناگوار گزرتی تھی۔ جب کہ انور سدید اس انداز تحریر کو راست بازی اور بے باکی کی نقطہء نظر سے دیکھتے اور اعتراف کرتے ہے کہ میرا ذاتی کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ میں غلط بیانی کو ریکارڈ کی درستی کے لیے لکھتا ہوں جو کہ صرف نظریاتی اختلاف ہے۔ ان کے بیٹے مسعود انور اُن کی احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر سلیم اختر سے معرکہ آرائی کے حوالے سے تحریر کرتے ہے کہ:

"قتیل شفائی سے اُس وقت چپقلش شروع ہوئی جب یہ دونوں رائٹرز گلڈ کے الیکشن میں ایک دوسرے کے مخالف امیدوار تھے اور قتیل شفائی نے ان پر مستری ہونے کی پھبتی کسی تھی۔ سعد اللہ شاہ بتاتے ہے کہ قتیل شفائی دیر تک ابا جی کا ہاتھ پکڑ کر روتے رہے کہ ساری زندگی جن کے کہنے پر قتیل ابا

جی سے لڑتے رہے ان میں سے کوئی بھی عیادت کے لیے نہیں آیا۔ قتیل صاحب کو یقین نہیں آرہا تھا کہ انور سدید اُن کی عیادت کے لیے اُن کے گھر آئیں گے۔ اسی طرح جس دن احمد ندیم قاسمی صاحب کا انتقال ہوا میں ابا جی کے تاثرات جاننے کے لیے اقبال ٹاؤن جا پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر گلے لگ گئے اور بولے "او یار قاسمی صاحب مر گئے" اماں یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ وہ بولیں ساری عمر تو لڑائی کرتے رہے اب آپ رو رہے ہیں۔ جواب میں کہنے لگے میں احمد ندیم قاسمی کے بڑا ادیب ہونے کا تو قائل ہوں مگر جب وہ غلط بیانی کرتے ہیں اور ریکارڈ کی درستی لیے لکھتا ہوں جسے لوگ لڑائی سمجھتے ہیں۔ آخری ملاقات میں انھوں نے سلیم اختر صاحب کی عیادت کی خواہش کا اظہار بھی کیا مگر وقت نے مہلت نہ دی۔ جب بھی کسی ادیب یا شاعر کی وفات ہوتی تو ایک مجلس عزاداری ہمارے گھر بھی منعقد ہوتی۔"(۱۷)

ممتاز مفتی اپنے رائے میں ایک طرف اُن کی شخصیت کے علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہے لیکن ساتھ اوراق سے وابستگی اور وزیر آغا کی دفاع میں لکھنے پر لفظ "گُھڑیا" اور وفا شعار ادیب کہہ کر طنز بھی کرتے نظر آتے ہے۔

"انور سدید کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوں۔۔ وہ ایک مضبوط کردار کا مالک ہے۔ طاقتور۔۔۔۔ جسمانی بھی اور ذہنی بھی۔ بل کہ ذہنی زیادہ۔ جبڑے تلے دبا عزم بہت رکھتا ہے۔ انگریزی میں ایسے آدمی کو "آئرن مین (Iron Man) کہتے ہیں۔ خمیر میں سنجیدگی کا جزو حاوی ہے۔ دیکھو تو یوں لگتا ہے جیسا عمل حاوی ہے۔ ویسے بہت علم رکھتا ہے۔ پنجابی میں جو بہت پڑھا ہوا ہو اُسے "گھڑیا" کہتے ہے۔ انور سدید "گھڑیا" محنتی ہے۔ محنت کی نسبت مشقت زیادہ پسند کرتا ہے۔ وفا شعاری کی بیماری لگی ہوئی ہے، صحت مند ہونے کا کوئی امکان نظر آتا"(۱۸)

ڈاکٹر انور سدید کی احمد ندیم قاسمی اور اُس کے گروہ سے محاذ آرائی ادبی تھی اُس میں کسی قسم کا تعصب نہیں تھا اُن کی کوشش اور مقصد ادب کا بے غرض فروغ تھا۔ ادیبوں کو وہ اخلاقی طور پر مکمل دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ تنقید میں وہ ہمیشہ خامی یا غلطی یا قول و فعل کے تضاد کا برملا اظہار کرتے تھے۔ دوسروں کو ان کی

غلطیوں سے آگاہ کر کے اصلاح اُن کا بنیادی مقصد تھا۔ڈاکٹر انور سدید اس شخص کو بھی اہمیت دیتے تھے۔جو ان کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کرتا ہے۔کیونکہ اس شخص کی بدولت وہ اپنی اصلاح کرنے کے قابل ہوتے وہ ایسے انسان کو بہترین دوست گردانتے تھے اور ان کی رائے میں وہ شخص ان کے لیے ان کے دوستوں سے زیادہ مقدم ہو گا۔اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> محترم جناب احمد ندیم قاسمی اردو ادب کی مشہور ترین شخصیت ہیں۔لیکن وہ غلطیوں اور خامیوں سے مبرا نہیں۔اگر اُن کے کسی اقدام نئی نسل گمراہ ہوتی ہے۔اگر اُن کے کسی اقدام سے نئی نسل گمراہ ہوتی تو یہ غلطی اُن کے نام سے منسوب ہونی چاہیے اور انہیں اس کی وضاحت کا حق ضرور ملنا چاہیے۔۔۔۔بروقت وضاحت نہ کی گئی تو داغ اُن پر موجود رہے گا اور تاریخ میں کبھی نہ کبھی ابھر کر ضرور سامنے آجائے گا۔اس وقت سے ہر ادیب کو ڈرنے کی ضرورت ہے۔میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ میری کوئی غلطی یا خامی دیکھیں تو بروقت شائع کریں۔ لیکن مجھے وضاحت کا حق ضرور ملنا چاہیے۔۔۔۔بروقت وضاحت نہ کی گئی تو داغ اُن پر موجود رہے گا اور تاریخ میں کبھی نہ کبھی ابھر کر ضرور سامنے آجائے گا۔اُس وقت سے ہر ادیب کو ڈرنے کی ضرورت ہے۔میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ میری کوئی غلطی یا خامی دیکھیں تو بروقت شائع کریں لیکن مجھے وضاحت کا حق بھی دیجیے۔آخری بات یہ کہ مجھے میری خامی یا غلطی سے آگاہ کرنے والا میرا دشمن یا بدخواہ نہیں بلکہ میرا دوست ہے اور میں اُس کی وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، صبا لودھی، سجاد نقوی اور عامر سُہیل سے زیادہ قدر کرتا ہوں۔[۱۹]

ادب اور ادیب معاشرے اور اس میں ہونے والے واقعات کا حصہ ہوتے ہیں اور ان سے الگ نہیں ہو سکتے۔یہ واقعات چاہے منفی حیثیت کے ہوں یا معاشرتی، سیاسی ہوں یا سماجی ادب اور ادیب کا اُن سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں ادیبوں کو ادب کی خدمت بغیر کسی لالچ کے کرنی چاہیے۔ان کے پیش نظر مالی منفعت نہ ہو بلکہ ادب کی آبیاری ان کا مقصد ہو۔تب ہی اچھا ادب وجود میں آئے گا۔جب مالی فوائد کو ادب سے وابستہ کر لیا جائے تو یہ ادب نہیں کاروبار کی صورت اختیار کر لے گا۔ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں ادیب کو خوددار ہونا چاہیے۔اس کو اپنے ذاتی فائدے کے لیے ادب کو پامال نہیں کرنا چاہیے۔اس کو

اپنے ذاتی مفادات سے بالا تر ہو کر ادب کی خدمت بجالانی چاہیے۔ ڈاکٹر انور سدید ایسے اعزازات کے بھی خلاف تھے جو کہ عوامی حکومتوں کی طرف سے نہ ہو۔ اس جب صدر ایوب کی حکومت میں مختلف ادبی ایوارڈ دیئے گئے تو اُن پر بھی تنقید کی گئی۔ ایسا ہی ایک ایوارڈ حسن کارکردگی کی صورت احمد ندیم قاسمی کے حصے میں بھی آیا۔ غلام حسین اطہر نے احمد ندیم قاسمی سے دوران انٹرویو اس ایوارڈ کی واپسی کے بارے میں دریافت تو اُنھوں نے اُس ایوارڈ کی واپسی کو ایک عجیب سی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا کہ وہ ایوارڈ اس واپس کریں گے جب شہروں کو دیئے گئے ایوارڈ واپس کیے جائیں۔ احمد ندیم قاسمی کے اس رویے پر ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مکتوب میں لکھا:

> "یہاں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ڈکٹیٹر ایوب کے عطا کردہ حسن کارکردگی کے انعام کو قاسمی صاحب نے لاہور، سرگودھا اور سیالکوٹ ہلال استقلال کے مترادف قرار دیا ہے اور اصرار کیا ہے کہ یہ شہر ہلال استقلال واپس کریں گے تو وہ بھی اپنا اعزاز واپس کر دیں گے۔ ہلا ل استقلال جراءت، شجاعت اور پامردی کا اعزاز ہے اس لیے اس کا موازنہ حسن کارکردگی کے انعام سے کرنا مناسب نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ صدر ایوب کے زمانے کی تعبیر اب جس تناظر میں سامنے آرہی ہے۔ اس سے بہت سے سابقہ نتائج کی کایا پلٹ گئی ہے۔ لیکن ان شہروں کے قومی اعزاز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسری طرف اس نئی تعبیر کی روشنی میں ڈکٹیٹر ایوب کے ثناء خوانوں نے اپنے رویے کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور بیشتر غیرت مند اُدباء اپنے سابقہ رویے پر نادم ہونے کے بجائے بعد کے حکمرانوں کی ستائش بھی اسی طریقے سے کرتے رہے ہیں۔ (۲۰)

ڈاکٹر انور سدید تنقیدی مباحث میں فریق مخالف کے انتہائی اشتعال انگیز رویئے کے باوجود شائستگی اور مضبوط دلائل سے جواب دیتے تھے کہیں کہیں طنز کا استعمال بھی کرتے نظر آتے ہے۔ مثال کے طور پر مشکور حسین یاد نے اُن کے خلاف متعدد بار نازیبا الفاظ لکھے اور بعض اوقات تو اُنھیں دُشنام کا نشانہ بھی بنایا لیکن جب انور سدید نے اپنی کتاب "انشائیہ اُردو ادب میں" لکھی تو انشائیہ کے دور زریں کے انشائیہ نگاروں میں مشکور

حسین یاد کو شامل کیا۔ انھوں نے اپنے اس جائزے میں مشکور حسین یاد کی خامیوں کی نشاندہی رکھ رکھاؤ اور شائستگی سے کی ہے:

> "مؤختین نے جس تہذیبی رویئے کو انشائیہ میں فروغ دیا تھا، مشکور حسین یاد نے اس کی یکسر نفی کی ہے۔ انھوں نے بالعموم اس غیر تہذیبی رویئے کو اُبھارا ہے جو دُشنام اور تیزابیت سے داغدار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ کسی دوسرے انشائیہ نگار کے ہاں موجود نہیں۔ چناں چہ احمد ندیم قاسمی کے ایک قول ملیح کے مطابق مندرجہ بالا قسم کے انشائیئے کے بانی اور منشی مشکور حسین یاد ہیں۔"(۲۱)

ادب میں گروپ بندی کا ذکر آیا تو وہاں وزیر آغا گروپ اور احمد ندیم قاسمی کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ فنون اور اوراق کے دو گروپ ایک ڈاکٹر وزیر آغا اور دوسرا احمد ندیم قاسمی کا گروپ تھا۔ وزیر آغا کے گروپ کے صف اول کے ادیب ڈاکٹر انور سدید تھے جب کہ احمد ندیم قاسمی کے گروپ میں رطب اللسانوں کا جم غفیر تھا۔ ان میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، خالد احمد، ڈاکٹر سلیم اختر اور بہت سے ادیب شامل تھے۔ ادبی مجلہ "فنون" احمد ندیم قاسمی کی زیر ادارت جبکہ "اوراق" ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں نکلتا تھا۔ جس میں دونوں گروہ ایک دوسرے کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ ۱۹۶۶ء میں فتح محمد ملک نے ایک مضمون "فیض کی دو آوازیں" اوراق میں شائع ہونے کے لیے پیش کیا جس میں قاسمی صاحب کو فیض سے بڑا شاعر ثابت کرنے کے حوالے سے اظہار خیال تھا۔ وزیر آغا نے نوک پلک درست کر کے اس میں موجود قابل اعتراض حصوں کو حذف کر دیا تھا۔ بعد میں قاسمی صاحب سے محبت کرنے والوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ عمل ان کے لیے گناہ بنا ڈالا اور تنقید کا نشانہ بنا دیا۔ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ڈاکٹر وزیر اغا نے ادبی رقابت کے باعث اس مضمون میں سے کچھ حصے حذف کیئے ہیں۔ اس بناء پر اُن کے خلاف ایک دُشنامی مہم شروع کی گئی۔ اس مہم میں ان کے دیگر احباب کی طرح انور سدید بھی اس زد میں آگئے۔ ڈاکٹر انور سدید اس جھگڑے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میں ۱۹۶۲ء سے وزیر آغا صاحب کے ایک مجلس نشین کی حیثیت سے اس دُشنامی مہم کا مستقل ہدف ہوں جو احمد ندیم قاسمی صاحب کے نیاز مندوں نے گزشتہ بیس برس جاری رکھی ہے۔ اس کا پس منظر اجمالا یہ ہے کہ اوراق نے

جناب قاسمی صاحب کو فیض سے برتر قرار دینے میں فتح محمد ملک کا ساتھ نہیں دیا تھا اور وہ حصہ جن سے قاسمی صاحب آسمان پر چڑھایا گیا تھا قلمزد کر دیئے گئے۔ فُٹ نوٹس نگار صاحب نے اس قسم کی تنقید کو "پھوک دینے" کا عمل قرار دیا ہے۔ گویا وزیر آغا صاحب نے قاسمی صاحب کے غبارے میں اُن کے عقیدت مند فتح محمد ملک کو پھوک دینے کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ غبارہ زیادہ پھوک سے پھٹ بھی سکتا تھا۔ چنانچہ قاسمی صاحب ناراض ہو گئے اور وزیر آغا صاحب کو ادب بدر کرنے کی مہم شروع کر دی۔ قاسمی صاحب کے مراعات رسیدہ اور احسانات چشیدہ لوگ اس میں شامل ہیں۔ (۲۲)

فنون قاسمی گروپ کا نمائندہ مجلہ جبکہ اوراق وزیر آغا گروپ کا مجلہ بن کر رہ گیا تھا۔ دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف لکھا جاتا تھا۔ چند لوگ ایسے تھے جو کہ غیر جانبدار تھے اور جن کی تخلیقات دونوں مجلوں میں چھپتی تھیں۔ "اوراق" میں جب فتح محمد ملک کے مضمون کے بعد جو ردعمل آیا تو ستار طاہر نے ایک مسئلہ اُٹھایا کہ مدیر اگر کسی کے مضمون کے بعض حصے حذف کر دے تو اُس کی یہ حرکت کیا کہلائے گی؟ اس سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد کی مثال پیش کی گئی کہ اُنھوں نے علی عباس جلال پوری کا متنازعہ مضمون جو کہ علامہ اقبال پر ھامن وعن چھاپ دیا اور ساتھ ہی فٹ نوٹس میں یہ تحریر کر دیا کہ مضمون نگار سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ لیکن ستار طاہر کی یہ مثال ٹھیک نہیں کیونکہ فتح محمد ملک اور علی عباس جلال پوری کا موازنہ درست نہیں۔ جب علی عباس جلال پوری کا مضمون شائع ہوا تو اُس وقت وہ عالمانہ مقام پر تھے جب کہ فتح محمد ملک کی حیثیت ایک طالب علم کی سی تھی۔

یوں اس مضمون کے آغاز کے ساتھ ہی دن بدن یہ دشنامی مہم ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف تیز رہی اس کی زد میں نہ صرف ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ اسی گروپ کی طرف سے برسائے گئے تیروں کی زد میں آ گئے۔ وزیر آغا کا دفاع کرتے کرتے خود ڈاکٹر انور سدید کی ذات پر بھی حملے ہونے لگے۔ اُن کو طنز کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ کبھی یہ وار احمد ندیم قاسمی تو کبھی یہ عطاء الحق قاسمی کی طرف سے ہوتا۔ ڈاکٹر انور سدید بھی اپنے کالموں میں ان کا جواب دیتے یوں یہ معاملہ ادب سے زیادہ سیاسی رنگ اختیار کر گیا۔ اس قدر شدت کہ یہ لڑائی جھگڑے ادب کی حد سے نکل کر ذاتیات میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک احمد ندیم قاسمی صاحب نے فرمایا کہ "انور سدید کا نام لینے سے میری زبان پلید ہو جاتی ہے۔ "نہ صرف احمد ندیم قاسمی خود بلکہ اُن کے دوست عطاء الحق قاسمی

صاحب کی طرف سے بھی انور سدید پر طنز اور نازیبا جملے کسے گئے۔ جن میں "زبان دراز سرگودھی" اور "انور سدید کو مرے ہوئے پندرہ سال ہو گئے" اور "ڈاکٹر انور سدید، پانی سے نہیں بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا کے علم کی چاندنی سے غسل کرتے تھے" جس پر ادبی حلقوں میں رد عمل کا اظہار بھی ہوا اور اس رویے پر دُکھ کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے "وزیر آغا کا مزارع" کہا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کی اس لڑائی نے اُردو ادب کو کیا دیا اس کا جواب تحقیق و تدقیق اور جستجو سے ممکن ہے۔ لیکن تا حال کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ ادب میں وزیر آغا کی پہچان انشائیہ اور تنقید جب کہ احمد ندیم قاسمی کی پہچان افسانہ اور شاعری تھی۔ دونوں کے میدان یکسر مختلف تھے۔ قاسمی گروپ کی طرف سے بد ترین طنز اور دُشنام طرازیوں کے باوجود اُنھوں نے اپنی ذات اور انا کو پس پشت رکھتے ہوئے۔ ڈاکٹر انور سدید کی یہ کوشش تھی کی دونوں گروپ کے درمیان اس نام نہاد محاذ آرائی کو ختم ہونا چاہیئے۔ اس کے خاتمے کے لیے اُنہوں نے کوششیں بھی کیں جو کہ بارآور ثابت نہ ہو سکیں۔ تخلیق میں مجید اختر نے دونوں گروہوں کو ناراضی ختم کرنے کا مشورہ دیا اس کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> لاس اینجلس سے مجید اختر صاحب نے بڑا صائب مشورہ دیا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا گروپ اور قاسمی گروپ کے لوگوں کے معاندانہ خطوط اور مضامین کی اشاعت "نردبان" اور "معاصر" کے لیے مخصوص رہنے دیں لیکن اُنہیں شاید علم نہیں کہ میں نے وزیر آغا صاحب اور جناب احمد ندیم قاسمی کی "آویزش" ختم کرنے کے لیے دونوں کو اپنے گھر پر چائے کی دعوت دی تھی۔ اس پر متعدد اخبارات میں کالم بھی لکھے گئے، لیکن قاسمی صاحب نے نہ میری دعوت قبول کی اور نہ میرے خط کا جواب دیا۔ میری تجویز ہے کہ مجید اختر صاحب ان دونوں ارباب ادب کو لاس اینجلس بلائیں اور جب تک آپس میں صلح نہ کرالیں واپس نہ آنے دیں۔ (۲۳)

ڈاکٹر انور سدید نے وزیر آغا سے جہاں استفادہ کیا وہاں ادبی حلقوں میں انور سدید نے وزیر آغا کی نظریات کا دفاع کر کے وزیر آغا کو بھی فائدہ پہنچایا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید اور تخلیق کی فہم میں جتنا انور سدید کا کردار ہے۔ اُتنا باقی اوراق میں لکھنے والوں کا نہیں ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی اوراق سے وابستگی ایک طرف اُن کی شہرت کا باعث تھی جب کہ دوسری طرف اس گروپ بندی نے اُن کی بحیثیت نقاد، محقق اور تخلیق کار اُن کے

لیے نقصان دہ بھی تھا۔ کیوں کہ ادب میں اُن کی متنازعہ حیثیت نے اُن کی تخلیقی اصناف کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اب اُن کی تحریرون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کی ہر صنف میں اُن کا فن اور طرز فکر الگ اور منفرد تھی۔ تنقید اور تحقیق اُن کا اصل میدان تھا لیکن اس سے ہٹ کر وہ بہترین افسانہ نگار، شاعر بھی تھے۔ ادب کی اس دلچسپ صورتحال میں وہ تخلیقی اصناف میں مسلسل طبع آزمائی کرتے رہے۔ جو کہ اُن کی تنقیدی اسلوب پر بھی اثر آفرینی رکھتی تھی۔ اس ساری صورتحال میں اُن کی تخلیقی سرگرمی پوشیدہ رہی اور خود بھی وہ خاموش وابستگی رکھتے ہوئے لکھتے چلے جارہے تھے۔ اس لیے جہاں اس وقت کے معاصر ادب کی صورتحال اور مختلف نظریات نثر کے صورت میں پنپتے اور فروغ پاتے ملتے ہے وہاں اُن کی تخلیقی نظم و نثر میں بھی عملی طور پر بطور فن اور فکر کے دیکھا جاسکتا ہے۔۔ انہوں نے شاعری، افسانہ، تنقید نگاری، انشائیہ نگاری، سفر نامہ نگاری، دیباچہ نگاری اور تبصرہ نگاری الغرض ہر صنف ادب میں اُردو ادب کے میدان میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہے۔ انور سدید کی خوبی تھی کہ لامحدود علمی اور معاشرتی ترقی کے باوجود انسان کا وحشیانہ پن اور خود غرضانہ رویہ ختم نہیں ہوا اور قول و فعل کا تضاد مسلسل جاری ہے۔ انور سدید ادب میں اس صورتحال کو بدلنے کی آرزو رکھتا ہے ۔ وہ خود غرض جذبوں اور جبلتوں میں مقید انسان نما حیوان کو شعور کی رُو دکھانا چاہتا تھا۔ علمی و ادبی مصروفیات کے باوجود ان کی شخصیت کا یہ پہلو حیرت انگیز ہے کہ وہ اندر سے جمے ہوئے گھریلو قسم کے انسان تھے۔ تمام تر پیشہ وارانہ، علمی و ادبی مصروفیات کو گھریلو ذمہ داریوں پر حاوی ہونے نہ دیا اور ایک شفیق باپ اور شوہر کے طور پر اپنی ذمہ داریوں کو خوب نبھایا۔ ایک واقعہ اُن کے چھوٹے بیٹے بذل ندیم سے روایت ہے کہ جب ڈاکٹر انور سدید سرگودھا میں تعینات تھے وہ دفتر سے لوٹ کر اپنے دوست وزیر آغا کے ہاں چلے جاتے تھے اور پھر دیر تک وہاں علمی ادبی گپ شپ میں مصروف رہتے۔ جس کے نتیجے میں ہم بھائیوں کی توجہ تعلیم کی طرف سے ہٹ گئی اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر امتیاز اپنی کلاس کے کمزور بچوں میں شمار ہونے لگے۔ ایک دن ان کے استاد نے ڈاکٹر صاحب کو بلایا اور مشورہ دیا کہ امتیاز کو سائنس کی بجائے آرٹس کی کلاس میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ امتحان میں فیل ہونے کی بدنامی سے بچ سکے۔ اس پر انور سدید کو بہت صدمہ ہوا، انہوں نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ آپ مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ یعنی اگر گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد امتیاز آپ کے ٹیسٹ میں فیل ہو جائے تو آپ بڑی خوشی سے اسے آرٹس کی کلاس میں بھجوادیں۔ اس کے بعد انور سدید نے اپنا پروگرام یوں ترتیب دیا کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں اپنا قیام مختصر کرکے جلد گھر آجاتے اور انہیں پڑھاتے بھی تھے۔ جس کے نتیجے میں امتیاز صاحب نے نہ صرف اپنے استاد کا ٹیسٹ پاس کیا بلکہ میٹرک میں اعلیٰ نمبروں سے

کامیابی حاصل کی پھر ایف۔ ایس۔ سی اور ایم۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔ اور اس کے بعد ایف۔ آر۔ سی۔ پی کا امتحان پاس کر کے ماہر امراض بچگان بن گئے۔ اسی طرح اُن کے بیٹے مسعود انور نے کیمیکل انجینئرنگ اور ندیم نے ٹیکسٹائل انجینئر بن کر کامیابی حاصل کی۔ اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت ان کی خواہش تھی۔ جس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اُن کی سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ایف۔ ایس۔ سی کے زمانے میں اپنے بیٹے مسعود انور کو غیر نصابی سرگرمیوں اور شعر و شاعری کے پروگراموں میں حصہ لینے سے روک دیا تھا۔ بحیثیت شوہر اپنی شریک حیات سے زندگی بھر تعلقات مثالی تھے اور عمر بھر خوشحال زندگی گزاری۔ جس کے اثرات اُن کے اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت اور ذمہ داریوں کے احساس کی صورت میں نمایاں ہیں۔

دوستوں سے محبت انور سدید کی زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ تھا، دوستی میں وہ تقدیر کے قائل نہیں تھے۔ دیر آشنا طبیعت کے مالک تھے۔ لیکن جب دوست بن جاتے تو پھر اپنے دوستوں کے مقابلے میں کسی اور کو کم ہی درخور اعتناء جانتے۔ علمی و ادبی شخصیتوں یار فقاء کار سے ہی ان کی دوستی قائم نہ تھی بلکہ عام لوگوں سے جو ایک بار مراسم بن گئے ہمیشہ ان کی عزت، احترام اور پاس کرتے رہے۔

وضع داری، انکساری، خلوص، غم گساری، دوست نوازی اور مہمان نوازی انور سدید کی شخصیت کے روشن ترین پہلو تھے۔ اس کے علاوہ نوجوانوں کے مسائل اور ان کی راہنمائی سے انور سدید کی دلچسپی کا گزشتہ اقتباسات میں پہلے آچکا ہے۔ جس سے ان کی ہمدرد اور فیض رساں شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ نوخیز ادیبوں کی تربیت اور عملی زندگی میں اُن کی راہنمائی انور سدید کو بہت عزیز تھی۔

انسان کی شخصیت و کردار پر اثرات کا ایک اور پہلو گھر کا ماحول اور ذاتی خانگی حالات ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کی پہلی تربیت گاہ اس کا گھر ہی ہوتا ہے غلط نہ ہو گا۔ انور سدید کی والدہ ناخواندہ، مذہبی اور سادہ خاتون تھیں۔ مشرقی رسوم و رواج کے مطابق شوہر اور بچوں کی خدمت میں جتی رہیں۔ اُن کا اسم گرامی صالحہ خاتون تھا، سرگودھا سولہ بلاک میں گھر کا ایک کمرہ اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ جسے نماز پنجگانہ، تلاوت قرآن مجید اور درود و وظائف سے اپنی زندگی کے آخری سانس تک آباد رکھا اور تصوف کی طرف مائل رہیں۔ انور سدید والدہ کی زندگی کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> "ماں جی کی موجودگی میں مجال نہیں کہ گھر کا کوئی شخص نماز سے غفلت برتے اور قرآن خوانی باقاعدگی سے نہ کرے۔ ان کے وجود سے گھر روحانیت کی

خوشبو سے معمور ہو جاتا اور ہر طرف ایک عجیب سی مہک بکھری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر بند ہو جاتا اور ٹی وی صرف اس وقت جاگتا جب اس پر خبریں یا مذہبی پروگرام آرہا ہوتا۔ " (۲۴)

ڈاکٹر انور سدید کے والد کا نام مولوی امام الدین تھا۔ اُن کے والد محنت کش انسان تھے۔ گول چوک سرگودھا میں اُن کے پاس سلائی مشین کی ایجنسی تھی۔ سیونگ مشین کے حوالے سے انہوں نے درزی خانہ قائم کیا۔ جہاں نادار بچوں کو ٹیلرنگ کی تربیت دی جاتی۔ آخری عمر میں اپنے بڑے بھائی کی طرح اُن کا رجحان بھی تصوف کی طرف ہو گیا اور خانقاہ سراجیہ (کندیاں) کے حضرت خواجہ خان محمد صاحب سے بیعت کی اور اُن کی معیت میں کئی مرتبہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار کی زیارت کے لیے گئے۔ دو حج کرنے کے بعد اپنی خواہش کے مطابق کہ "میری عمر نبی اکرم ﷺ سے زیادہ نہ ہو" اور تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ڈاکٹر انور سدید نے جہاں والدہ محترمہ کی سحر انگیزی اور عبادت کا ذکر کیا، وہاں اپنے والد کی محنت مشقت اور شخصیت و کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے والدین کو آنگن میں دو ستارے قرار دیتے ہیں:

" میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے گھر کے افق پر دو ستارے جگمگاتے دیکھے۔ ایک ستارہ ہمارے گھر کے آنگن میں، دوسرا آنگن سے باہر چمکتا تھا۔ آنگن میں چمکنے والے ستارے کی روشنی دُودھیا تھی۔ گھر میں داخل ہونے والا خاندان کا ہر فرد اور اس میں پلنے والے سب بچے اس ستارے کی نرم دُودھیا چاندنی میں نہاتے نہاتے شرابور ہو جاتے، لیکن اس کی نرم تابانی میں کبھی کمی نہ آئی۔ یہ میری والدہ تھیں۔ ان کا نام صالحہ خاتون تھا۔ لیکن سب بچے " بے بے جی" کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ تہجد پڑھ کر فارغ ہوتیں تو فجر کی نماز تک قرآن مجید کی ناظرہ تلاوت کرتیں۔ نماز سے فارغ ہو کر آٹھ دس سیر گندم لے کر گوندھنے لگتیں۔ والدہ دودھ بلونے اور چاٹی میں گھمر گھمر مدھانی چلانے لگتیں۔ اسکول جانے والے سب بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ والدہ ہر بچے کو رات کی بچی ہوئی روٹیوں میں سے ایک ٹکڑا توڑ کر دیتیں اور بلوئے ہوئے دودھ کی سطح پر اگر مکھن آچکا ہوتا تو تھوڑا سا وہ بھی ڈال دیتیں۔ اس دوران والدہ پیتل کے مرادآبادی لمبے کلاس میں " آدھ رڑکا " ڈالتیں۔ ہم میں سے کوئی بچہ یہ کلاس اُٹھاتا اور بیٹھک میں چلا جاتا۔

جہاں مولوی صاحب اپنے شاگردوں کو پارچہ دوزی کی تربیت دے رہے
ہوتے تھے۔ " (۲۵)

انور سدید کے مزاج میں انکساری، سادگی، بے تکلفی اور ایثار اپنے والد محترم سے ودیعت ہوئی تھی۔ ان کے والد کو علم و دانش، مذہب اور تصوف کے ساتھ خاص وابستگی تھی۔ انور سدید کے والد سرگودھا کے مشہور و معروف بزرگ تھے۔ حسن اخلاق، خدا ترسی اور غریبوں کے دوست تھے۔ روایت ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہندو مسلم فسادات میں امن اور محبت کے جذبے کو فروغ دینے والوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اور اس وقت سرگودھا کے علاقے میں انسانی خون کو ارزاں نہ ہونے دیا۔ نیک سیرت اور پیام امن کے راہبر کی حیثیت سے آج بھی جب فسادات کے زمانے کا تذکرہ ہوتا ہے تو اُن کا نام بڑی عقیدت اور محبت سے لیا جاتا ہے۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی کے روایتی مسلمان گھرانوں کی طرح ذہنی و روحانی تربیت کے روایتی اصول انور سدید کے گھر میں بھی کار فرما تھے۔ انور سدید والد اور والدہ کی زندگی سے بے حد متاثر تھے۔ مذہبی لگاؤ، تصوف اور علم و دانش کی جستجو بچپن سے گھر سے ہی پروان چڑھی۔ انور سدید کی شخصیت کے پہلوؤں میں اُن کے والد کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ محنت، شفقت، خلوص، سادگی، ایثار اور انکساری جیسے دل آویز پہلوؤں میں مولوی صاحب کی تصویر نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

انسان کی شخصیت و کردار کی تکمیل میں جہاں ذاتی عائلی زندگی، ماحول، والدین کی تربیت، معاشرتی حالات و واقعات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہاں شخصیت کی تکمیل و تعمیر میں وہ شخصیات بھی مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔ جن کی صحبت میں انسان وقت گزارتا ہے، جس سے سیکھ کر تعلیمی مدارج طے کرتا اور ذہنی و جذباتی رشتے استوار کرتا ہے۔

انور سدید کی شخصیت و کردار پر جن اساتذہ کا رنگ موجود ہے۔ ان میں اولین اُن کے والد مولوی امام الدین تھے۔ جن کی شخصیت کا اثر، علم و ذکاوت، عجز و انکساری، درویشانہ زندگی اور تصوف کی پرچھائیاں بہت اہم ہیں۔ اپنی تعلیم و تربیت میں اپنے والد کی حصہ گیری راہنمائی اور کردار کے حوالے سے اقبال کے کلاسیکی نقوش کے دیباچہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

" اقبال سے میری اولین ملاقات تو طفولیت کی بیداری سے بھی شاید قبل
ہوئی۔ کیفیت اس اجمال کی یہ ہے کہ میرے والد گرامی شب بیداری کے

لیے اُٹھتے تو مولانا رومؒ کے ساتھ اقبالؒ کا کلام بھی پڑھتے۔ ان کی زیر لب آواز رات کے سناٹے میں گونج تو پیدا نہ کرتی، تاہم مجھے اکثر سوتے سے جگا دیتی میں دیکھتا کہ والد گرامی اقبال کے اشعار پڑھ رہے ہیں اور مسلسل رو رہے ہیں۔ درمیان میں کبھی وقفہ آجاتا، تب بھی وہ چُپ نہ ہوتے اور سسکیاں لیتے رہتے۔ اس زمانے میں، میں والد گرامی کی آواز کا تعاقب کرنے لگا۔ تو اقبال کے بہت سے اشعار زبان پر جاری اور قلب میں پیوست ہو گئے۔"(۲۶)

انور سدید کی کردار سازی اور ادب سے شغف کے فروغ میں مرزا ہاشم الدین کا کردار اہمیت کا حامل تھا۔ پرائمری تک انور سدید نے ان سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مرزا ہاشم الدین جو معروف ماہر اقبالیات مرزا محمد منور ہاشمی کے والد گرامی تھے۔ پرائمری سطح تک تعلیم اور ادبی ذوق کی پروان چڑھانے میں ان کا کردار نمایاں تھا۔ مولوی امام الدین، مرزا ہاشم الدین کے بعد تیسری شخصیت مولوی پیر بخش تھے۔ جنہوں نے ساتویں اور آٹھویں جماعت میں انور سدید کو پڑھایا اور ان کی تعلیم و تربیت اور سیرت سازی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سیکنڈری سطح پر نویں اور دسویں جماعت میں ماسٹر محمد عالمگیر نے انور سدید کی شخصیت سازی، ادبی ذوق اور راہنمائی میں اہم کردار ادا کیا۔ ایم۔ اے تک تعلیم بطور پرائیویٹ اُمیدوار حاصل کی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اُردو میں مقالہ "اُردو ادب کی تحریکیں" وزیر آغا کے زیر نگرانی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ محکمہ آبپاشی میں وزیر آغا سے ملاقات کے بعد دیگر ادیبوں سے بھی اکتساب فیض حاصل کیا تھا۔

انور سدید نے اُردو کے معاصر ادیب، ادبی تاریخ و روایت سے حسب ضرورت کسب فیض کیا۔ کئی شخصیات سے من پسند فن اور علم حاصل کیا۔ قدیم شعراء میں میر تقی میر، غالب، اقبال، جوش اور جدید شعراء میں میراجی، راشد فیض، حفیظ جالندھری وغیرہ سے جو فن پسند آیا، اپنایا اور منفرد اسلوب اور علم و حکمت کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

(iii) شخصی انفرادیت:

انور سدید کی شخصیت کا تفصیلی ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ گزشتہ تمام آراء اور مطالعہ سے اس امر کا سراغ لگانا ضروری ہے کہ انور سدید بطور شخص اور ادیب ایسی کون سی امتیازی خصوصیات ہیں۔ جن کی وجہ سے انور

سدید دیگر ادبا سے منفرد ہو جاتے ہیں۔ بطور عام آدمی ان کی ذات میں ایسے کون سے مخصوص رنگ اور امتیازی رجحانات ہیں۔ جو انہیں دیگر اشخاص سے ایک منفرد اور الگ شناخت دیتی ہیں۔

ان تمام سوالات کے جوابات انور سدید کی شخصی زندگی کے مطالعہ سے ملتے ہیں اور ہماری کھوج اور جستجو اس نتیجے پر پہنچ پاتی ہے کہ انور سدید کے درج ذیل منفرد رنگ ایسے ہیں جو اس کو دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں، مثلاً خانگی خوشحالی اور مضبوط خاندانی نظام، مذہبی لگاؤ رجحان اور محبت الٰہی، عشق رسول ﷺ، محنت، حق گوئی اور دیانت داری، اور کل وقتی ادیب و شاعر ہونا ہے۔

انور سدید کی ادبی شخصیت کے فروغ میں ان کے خانگی حالات اور مربوط خاندانی نظام نے بہت اہم کردار ادا کیا، والدین کی تعلیم و تربیت کا اثر ان کی تحریروں میں دوسروں کی تحریروں سے احترام کی صورت میں واضح نظر آتا ہے۔ خانگی خوشحالی اور مربوط خاندانی نظام کے اثرات ان کے پختہ خرد افروز افکار کے حالات میں نظر آتا ہے۔ ادب میں بہت کم ایسے ادیبوں کی مثالیں ملتی ہیں جو خانگی اور معاشی طور پر اس قدر مضبوط ہوں۔ اکثر کے ابتدائی حالات پسماندگی، کسمپرسی اور معاشرتی محرومیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ جن سے ان کی افکار میں توازن اور اعتدال کا فقدان ملتا ہے۔ لیکن انور سدید کے حالات زندگی سے ایسے کوئی آثار نہیں ملتے جہاں وہ محرومیوں کے شکار رہے ہوں، اُن کی زندگی شروع سے ایک تحریک کی مانند رہی ہے، جہاں کہیں وہ ڈگمگائے بھی تو جلد راہ راست پر آئے، یہی وجوہات ہیں کہ وہ محنت شاقہ اور بامقصد زندگی کے مفہوم کی تعبیر میں تعلیم کے حصول کو اپنا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ استقامت اور ثابت قدمی خانگی اور خاندانی ماحول کی بدولت ملتی ہے۔ جس پر اترائے ہوئے کہتے تھے کہ میرے والدین میرے گھر میں چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح تھے۔ ایک ستارہ گھر کے آنگن میں، دوسرا آنگن سے باہر چمکتا تھا۔

اُن کے گھریلو ماحول سے اُن کی شخصیت میں توازن، اعتدال اور سادگی کا رنگ چڑھا۔ جس کا اثر نہ صرف تحریروں بلکہ عملی زندگی میں احباب کے ساتھ حسن سلوک کی صورت میں نمایاں نظر آتا ہے۔

انور سدید کا تعلق چونکہ ایک مذہبی گھرانے سے تھا، اُن کے والد محترم جن کا رجحان تصوف کی طرف رہا اور اس کا اثر اُن کی اولاد پر بھی رہا، انور سدید کے بڑے بھائی بھی تصوف کی طرف مائل رہے۔ انور سدید صوم و صلوٰۃ کے پابند اور مذہبی رجحان کے حامل تھے۔ مذہب سے لگاؤ اور تصوف کی طرف رجحان کو میراثی کہا جاسکتا ہے۔ اسی کی بدولت اُن کی طبیعت میں عاجزی اور انکساری موجود تھی۔ اُن کا حمدیہ کلام میں مذہب سے لگاؤ، رجحان اور اللہ باری و تعالیٰ کے ہاں عجز و انکساری کی جھلک یوں ملتی ہے:

"کیوں کروں پیش مُدعا مولا؟
تجھ پہ ہے سب کھلا ہوا مولا
کر دے مجھ کو سمندروں پہ محیط
میں ہوں قطرہ حقیر سا مولا
اپنی رحمت سے بھر دے کاسہ مرا
میں ہوں بندہ فقیر سا مولا" (۲۷)

انور سدید کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان کے مراحل فیض رسول ﷺ سے ہی ممکن ہے، انور سدید کی نعت نگاری میں حضور ﷺ سے محبت اور عشق کا رنگ حد درجہ پایا جاتا ہے نبی کریم ﷺ سے عشق اور مدینہ منورہ کی زیارت کی حسرت، بے قراری کا اندازہ اُن کے اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے۔

"مجھے بھی مدینے بلا لیجئے
نہیں رہ سکوں گا میں دور آپ سے" (۲۸)

اُن کی پوری زندگی محبت الٰہی، عشق رسول ﷺ اور اطاعت و اتباع کا عملی نمونہ بنی رہی۔ ان کی طبیعت سادہ مگر باوقار تھی۔ انہوں نے اپنی باتوں اور محبت سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے تھے۔ وہ گفتار اور کردار کے متوازن شخصیت تھے۔ منوایا۔ انہوں نے عمل مسلسل سے ثابت کیا کہ تعمیری اور کارآمد زندگی کیا اور کیسی ہوتی ہے، زندگی کے آخری ایام تک قلم سے رشتہ نہ توڑا اور نہ ہی دماغی ریاضت سے دستبردار ہوئے، زندگی سے جڑی تمام تر ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے ایک اَن تھک قاری اور ادیب کا مقام مسلمہ حقیقت ہے۔ ایک انجینئر ہونے کے باوجود انہوں نے ادبی دنیا میں ناقابل تردید بڑا نام کمایا، اس طرح ان کی انجینئرنگ کی مہارت اور تعارف پوشیدہ رہ گیا ہے۔ لیکن ان کی ادبی و صحافتی اور تصنیفی زندگی عالمی سطح پر چھا گئی اور اسے تسلیم بھی کیا گیا۔ ادبیات کے تنوع موضوعات پر درجنوں کتابیں تصنیف و تالیف کر کے انہوں نے ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ انور سدید کی ادبی محنت اور ریاضت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

" پہلے مجھے یہ بتایئے کہ آپ کھاتے، پیتے اور سوتے کس وقت ہیں کیوں کہ
جس رفتار سے آپ کی معلومات افزاء کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کو دیکھ کر
گمان گزرتا ہے کہ آپ کے نظام الاوقات میں کھانے پینے اور سونے کا وقت

نظر نہیں آتا۔ بسیار نویسی اور لغز نگاری کا اجتماع آکر کہیں دیکھنا ہو تو انور سدید کے پاس ہے۔" (۲۹)

انور سدید کی متعدد تخلیقات سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ وہ بے تحاشا مطالعہ کرتے اور بے تحاشا قلم فرسائی کرتے ہیں۔ انہوں نے اُردو ادب کی بڑی محنت اور کاوش سے مطالعہ کیا، ان کے حافظے کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ اُن کی نظر سے گزر جاتا ہے وہ اُن کے حافظے پر نقش مرتب کر جاتا ہے۔ الغرض انور سدید کی گھریلو زندگی، پیشہ وارانہ زندگی یا ادبی زندگی ہو ان تمام میں محنت، ریاضت اور لگن کا پہلو ایک غیر معمولی مثال تھی۔

انور سدید کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کا کل وقتی ادیب و شاعر ہونے کا ہے۔ وہ ہمہ جہت ادیب ہے۔ انہوں نے بیک وقت تنقید، افسانے، شاعری، سفر نامہ نگاری، انشائیہ نگاری اور ترجمہ نگاری کی۔ ان کی تصانیف نے اُردو ادب کے ذخیرے میں بے بہا اضافہ کیا، ڈاکٹر انور سدید کی علمی و تخلیقی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۴ء سے ہوتا ہے، وہ پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے اور انہوں نے ساری پیشہ وارانہ زندگی محکمہ آب پاشی میں گزاری۔ وہ ۱۹۸۸ء میں اپنی ملازمت سے سبک دوش ہوئے اور ۲۸ سال ہمہ وقت تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ یوں انہوں نے ایک فانی زندگی میں پیشہ وارانہ اعتبار سے ہی بھرپور زندگیاں گزاری ہیں۔ ہمارے عہد میں ایسا کم کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ہمہ پہلو تخلیقی اور تالیفی شخصیات کے مالک تھے، انھوں نے تحقیق، تنقید، تخلیق، تالیف، ترجمہ جیسے مختلف النوع میدانوں میں اپنے قلم کو رواں رکھا اور بیش تر میدانوں میں وہ ایک کامیاب لکھنے والے تھے، ادب میں ایسی شخصیات کے ساتھ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اُس کی تصنیفی زندگی کا کوئی ایک پہلو اتنا نمایاں ہو جاتا ہے کہ دیگر پہلو دب جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ڈاکٹر انور سدید کے حوالے سے دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی نقاد کی حیثیت نے اُن کی دوسری حیثیتوں کو دبا دیا ہے۔ اب جب کہ وہ نقاد کی حیثیت سے نہیں رہے، اس لیے ان کی دوسری تحریروں کو بھی پڑھا جا رہا ہے اور اُن کے ادبی مقام و مرتبے کا زیادہ بہتر انداز میں تعین کیا جا رہا ہے۔ اُن کے ادبی کام پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے موضوعات کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ اُن کی تصنیفات کی تعداد ۸۰ سے زیادہ ہے۔ رسائل و جرائد میں غیر مدون کام بھی موجود ہے۔ وہ ایک ان تھک قاری تھے۔ انہیں بہت سے رسائل و کتب ہر ماہ ملتی تھیں، ان کو وہ پڑھتے اور مختلف اخبارات اور رسائل میں اُن پر تبصرہ کرتے۔ اس حوالے سے وہ ہر سال دو سو، سوا دو سو رسائل اور کتب پر مختصر اور تفصیلی تبصرے لکھا کرتے تھے۔ مضامین، مختلف موضوعات اور شخصیات پر مربوط کتابیں اُن کے علاوہ ہیں۔ ڈاکٹر امجد طفیل اُن کی تخلیقی زندگی پر لکھتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی زندگی پر بحث آتی رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اُن کے تحقیقی اور تنقیدی کام کا حجم ہے۔ جس کے سامنے اُن کا تخلیقی کام بہت کم ہے، لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انہوں نے نظم و نثر ہر دو اصناف میں تخلیقی کام کیا ہے۔ اُردو نثر میں انہوں نے افسانے، انشائیے، خاکے، شخصیے اور سفر نامے تحریر کیے۔ جب کہ شاعری میں غزل، نظم، قطعہ اور نعت نگاری کی۔ ان تخلیقی جہات کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترجمہ نگاری اور کالم نگاری کے جوہر بھی دکھائے، یوں جب وہ پچاس، ساٹھ سال کی تصنیفی زندگی گزار کر اس دار فانی سے رخصت ہوئے اپنے پیچھے یادگار کام چھوڑ گئے ہیں۔" (۳۰)

ڈاکٹر انور سدید کی علمی و عملی زندگی ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے ہر صنف ادب میں کامیابیاں حاصل کیں۔ڈاکٹر انور سدید کی تنقید کی اثر آفرینی کا تمام انحصار اس کے تخلیقی اسلوب کا مرہون منت ہے۔ ان کا اسلوب ایک نادر پہلو ہے جس کے اظہار بیان میں ایک طرف بے باکی، وقت نظر اور حق گوئی کی صفات ہیں جبکہ دوسری طرف تلخی، ترشی اور شیرینی کے امتزاج سے منفرد تنقیدی فلیور ہے۔ جو انور سدید کی نمایاں پہچان بن گئی۔ تخلیق فن ایک سنجیدہ عمل ہے۔ انور سدید کی ذات تخلیق فن کے عمل تک سنجیدگی و بردباری سے منسلک نظر آتی ہے، انور سدید نہ صرف تنقید نگار بلکہ اہم تخلیق کار ہے تو جس کی وجہ سے اُن کی تنقید کی صلاحیت اُن کی تخلیقی صلاحیتوں سے کم نہ تھی۔ اُن کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف کم و بیشتر تمام ہم عصر احباب نے کیا ہے۔

انور سدید نے اپنی تنقید میں ادبی حقائق کا سراغ لگانے، انہیں سمجھنے اور سمجھانے کی جو کاوشیں کی ہیں۔ مستقبل کے ناقدین جب اُردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو ایک مؤثر نقاد کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے اپنے تخلیقی کام میں تنقیدی نظریات کو ایک نئی زندگی بخشی۔ جدید ادب اور تنقید اور اس کے بنیادی نظریات کی تکنیکوں کا تجزیہ پیش کیا برہمی تنقید سے ہٹ کر فہم و فراست، بے باکی اور دقیق نکتہ آفرینی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ انور سدید تنقید سے قبل افسانہ نگاری کے سفر میں فنی پختگی کے بہت سے مراحل طے کر چکے تھے، اس لیے اُن کے اولین تنقیدی مضمون "مولانا سلاح الدین احمد کا اسلوب" کا مطالعہ

کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مضمون کے آغاز سے انجام تک اس کے تخلیقی اسلوب کی گرفت مضبوط اور مستحکم نظر آتی ہے۔

تحقیق میں انور سدید کی کتاب "اُردو ادب کی تحریکیں" اُردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب سے اُردو ادب کی تاریخ، اُس کے فکری رجحانات، شخصی اُپج، نظریاتی اختراعات، مقامی ایجادات، غیر ملکی اثرات، انفرادی اجتہادات اور عہد بہ عہد ہونے والی عصری تبدیلیوں کا احوال سمیٹ لیا ہے۔ یوں اس کتاب کے مطالعے سے اُردو ادب کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح اُن کی دوسری اہم کتاب اُردو ادب کی مختصر تاریخ کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

> "کوئی بھی ادبی تاریخ اس کے مصنف کی تخلیقیت کے بغیر محض کتابوں اور ادبی شخصیتوں کی ایک کھتونی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی اس کتاب کو محض احوال و آثار کا ایک ملغوبہ بنا کر پیش نہیں کیا، اُن کے عقب میں موجود سیاسی ،لسانی اور تہذیبی کروٹوں کو مس بھی کیا ہے۔" (۳۱)

ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت نگاری پر تحریر کی ہوئی کتب قابل توجہ ہے۔ انہوں نے ان ادبی شخصیات کے فکر و فن کا مطالعہ کیا، جو اُردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، انہوں نے تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اُن کی ذاتی اور ادبی زندگی میں تضاد اور تصادم کی کیفیت کو اجاگر نہ کیا بلکہ ان کی ذاتی زندگی میں اُن ادبی شخصیتوں کا رویہ یا طرز عمل کو الگ انداز سے پرکھا اور ادبی حوالے سے انہوں نے کوئی دوسری روش اختیار کر رکھی تھی، جو سادگی، شرافت، خلوص، سچائی، اُصول پرستی اور راست گوئی انہوں نے ذاتی زندگی میں اپنا رکھی، وہی طرز عمل جو انہوں نے علمی و ادبی زندگی میں برقرار رکھا۔ جس کی وجہ سے ان نامور ادباء اور شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کا مطالعہ فقط اُن کی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اُس عہد کی تصویر کشی ہی کرتا ہے۔ جس میں وہ عظیم ہستیاں سانس لے رہی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید ایک محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ اانشائیہ نگار بھی تھے۔ انہوں نے سفر نامہ نگاری، کالم نگاری، خطوط نگاری، خاکہ نگاری میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے، شاعری کے ذریعے بھی اپنے باطن کو منکشف کیا۔ تاہم بہ حیثیت انشائیہ نگار، انہوں نے اپنی تخلیقیت کا برملا اظہار کیا۔

اُن کے انشائیوں کے دو مجموعے "ذکر اُس پری وش کا" اور "آسمان میں تتلیاں" اُردو انشائیے کی تاریخ میں عمدہ اضافہ ہے۔ اور انشائیہ نگاری کے میدان میں انہوں نے اپنا ایک منفرد مقام قائم کیا ہے۔

کلاسیکی شعراء پر نقد و تحقیق کرتے وقت اولین تحقیق و تدقیق کو اہمیت دی جاتی ہے، عہد حاضر میں یہ روایت رہی ہے کہ کلاسیکی شعراء کے فن شاعری پر ہی قائم آراء کو بنیاد بنا کر اکثر اُن کی شاعری کا تجزیہ پیش کرنے کی سعی کی جاتی ہے، ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ کسی نقاد نے کلاسیکی شعراء کے بارے میں اپنے طور پر اُن کے کلام کا منفرد انداز میں از سر نو جائزہ لینے کی کوشش کی ہو۔

ڈاکٹر انور سدید نے کلاسیکی شعراء پر قلم اُٹھاتے وقت اپنے زاویہ نگاہ کو بروئے کار لانے کی حتی المقدور کوشش کی اور دوسرے نقادوں کی طرح چربہ سے گریز کیا۔ اور ہر چند نئے انداز سے محنت اور مشقت سے عظیم کارنامہ سرانجام دیا، اور محنت طلب اس تحقیقی کوشش میں بھی سرخرو دکھائی دیئے۔

اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اور "اُردو ادب میں سفر نامہ" اُردو ادب کی تحریکیں کے علاوہ تیسری اہم کاوش "پاکستان میں ادبی رسائل" کی تاریخ ہے۔ انور سدید کی محنت اور خلوص کی شاخسانہ کتاب تصور کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ادبی رسائل کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جو اس موضوع پر پہلی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور مستند حوالہ بھی تصور کیا جاتا ہے۔

انور سدید کے حالات و واقعات اور وسعت مطالعہ سے یہ اعادہ کیا جاسکتا ہے کہ انور سدید نے اُردو تنقید میں اپنے طرز تحریر کے ذریعے ایک خاص کاٹ پیدا کی ہے۔ اگرچہ کہ اس کاٹ میں جذباتیت یا فوری تاثر سے پیدا ہونے والی ہنگامی کیفیت بھی موجود تھی۔ جس نے اُن کی شخصیت کو متنازعہ بھی بنایا ہے۔ لیکن وہ جب بھی کسی ادبی شخصیت یا مسئلے کو احاطہ تحریر میں لاتے تو اس کے بطون میں کار فرما اُن عوامل کو کھوجنے کی سعی بھی کرتے جو قاری کی نظروں سے اوجھل ہوتے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی رائے قلم بند کر دیتے تھے۔ انور سدید نے تنقید میں دیانت داری کو برتنے اور زندہ رکھنے کی کوشش کی جو کہ بعض ادبی حلقوں میں جانبدار تھی۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ ریاکاری، منافقت اور نفرت سے گریز کرنے کے تاثر کو فروغ دیا۔ الغرض بنیادی طور پر نقاد کی حیثیت سے اُردو تنقید کے پیش افتادہ طرز تحریر سے ہٹ کر ایک ایسا اسلوب بیان اختیار کیا۔ جس میں دلائل و براہین کے برملا اظہار کے علاوہ اصل مدعا کو دوٹوک انداز میں قاری کے سامنے پیش کرنے کا چلن بہت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے تنقید کا آغاز کیا تو تھوڑے عرصے میں اس صنف میں اپنا نام پیدا کر لیا۔ وہ اُن معدودے چند خوش نصیب اہل قلم میں شامل تھے جنھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کی تعداد اور مقدار کے ساتھ ساتھ اُن کے معیار کو بھی ہمیشہ بلند رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ اپنے عہد کے اُن چند باخبر نقادوں میں شامل تھے۔ جنہیں ایوانِ ادب کے مختلف گوشوں میں ہونے والی ہر لرزش سے بخوبی آگاہی

رہتی تھی۔ اُردو ادب میں اُن کی علمی و ادبی خدمات اور ذخیرہ الفاظ ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان تھک محنت، لگن اور جذبے کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر انور سدید ۲۰ مارچ ۲۰۱۶ء کو فوت ہوئے۔ ۲۱ مارچ کے روزنامہ نوائے وقت، ایکسپریس، جنگ، دنیا اور دیگر اخبارات اور الیکٹرانکس میڈیا میں انور سدید کے انتقال پر ملال کی خبر چھپی اور ان کی ادبی و فنی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا۔ اس موقع پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز نے بھی ان کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ مختلف اخبارات میں جلی سرخی کے ساتھ انور سدید کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے اظہار تعزیت کیا گیا۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیئر نے ایک تعزیتی کالم "انور سدید۔۔۔۔۔۔۔ تمام اپنی صحبت ہوئی، والسلام" میں انور سدید کی فنی عظمت کو سراہتے ہوئے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ:

> "ابھی اُردو دنیا جمیل الدین عالی، انتظار حسین، ندا فاضلی، فاطمہ ثریا بجیا اور زبیر رضوی کے انتقال کے صدمے سے سنبھلنے نہیں پائی تھی کہ انور سدید کے سانحہ ارتحال کی خبر سننے کو ملی۔ اُردو دنیا پر بہت بھاری وقت گزر رہا ہے۔ اس نسل کے سب سے بڑے ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں جس نے سنتالیس سے پہلے آنکھ کھولی تھی، اور جس کے پاس زندگی، ادب، دنیا کی وہ بصیرت تھی، جو چند بڑے سانحات جھیلنے سے حاصل ہوئی تھی۔"(۳۲)

وفات سے قبل شدید ترین علالت میں بھی ان کا قلم نہیں رُکا تھا اور مسلسل لکھتے رہے۔ مارچ ۲۰۱۶ء کا ادبی رسالہ الحمراء میں موجود غزل سے ان کی علالت اور احباب کی کتب پر تبصرے کے حوالے سے اصرار پر شدید علالت کو اس غزل میں انور سدید نے بیان کیا ہے۔

> "میں سامنے جو آپ کے دو چار ان دنوں
> یاروں کے بھیس میں ہیں یہ اغیار ان دنوں
> کی اس طرح ضعیفی نے یلغار ان دنوں
> بے ربط ہوئی جاتی ہے گفتار ان دنوں
> کیجئے نہ تبصرے کا تقاضا کتاب پر
> انور سدید رہتا ہے بیمار ان دنوں" (۳۳)

مارچ ۲۰۱۶ء کے پہلے ہفتے میں اُن کے بیٹے انہیں سرگودھا لے آئے اور اپنی زندگی کے آخری چند روز اُنہوں نے کومہ کی صورت میں ہی گزارے۔ وفات سے قبل ان کی خواہش پر ان کو سرگودھا لایا گیا تھا۔ واپسی پر اپنے ہمراہ تحریر کا سامان نہیں بھولے لکھنے کی حسرت آخر دم تک کرتے رہے:

"جب سرگودھا کے لیے رخت سفر باندھا جارہا تھا تو خاص دو چیزوں کے متعلق ڈاکٹر انور سدید نے ہدایت کی کہ میرے سامان میں رکھی جائیں۔ ایک رائٹنگ پیڈ اور دوسری وہ ڈائری جس میں احباب کے ٹیلی فون نمبر اور رابطے (پتے) وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ " (۳۴)

غور و فکر کی بات ہے کہ اُن میں لکھنے کی خواہش کس قدر شدید تھی کہ اُنہیں یہ یقین تھا کہ جو بھی لمحے میسر آئے وہ اُن میں لکھنا چاہتے تھے۔ نیز اپنے احباب یا چاہنے والوں سے خیر خواہوں سے انہیں کس قدر اُنس تھا، وہ یقیناً آخر وقت تک اُن سے رابطے بھی رکھنا چاہتے تھے۔ محمد انوارالدین سے انور سدید تک کا سفر، کسی خاص منزل پر آکر رکنے کے لیے تھا ہی نہیں، وہ زندگی گزارنے کا ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے کہ جس سے معدوم ہو جانے کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے، اُنھیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(iv) ادبی زندگی کا آغاز:

انور سدید کی ادبی زندگی کا آغاز وارتقاء میں بنیادی کردار گھریلو ماحول واثرات کا ہے۔ والدہ کی تربیت اور بھائیوں کا ادب کی طرف رجحان ابتدائی طور پر انور سدید کی ادبی زندگی پر منعکس نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کو عام بچوں کی طرح کہانی سننے کا شوق اپنی والدہ محترمہ سے قصص الانبیا کی کہانیوں سے ہوا۔ وہ اپنے خاندان کی بیبیوں اور بچوں کو اپنے پاس بٹھالیتی تھیں اور انبیاء کے سبق آموز قصے سناتی تھیں۔ انوار الدین (انور سدید) جب لڑکپن میں داخل ہوئے، تو انہوں نے اپنے بڑی بھائی معراج الدین، جنہوں نے گھر میں "ہوم لائبریری" بنا رکھی تھی سے استفادہ کیا اس میں انہوں نے راشد الخیری، پریم چند، ظفر عمر، خواجہ حسن نظامی، ڈپٹی نذیر احمد اور دیگر معروف ادبا کی کتابیں جمع کر رکھی تھیں، چوری چھپے اس لائبریری کے ناول اور افسانوں کے مطالعہ سے اپنے ادبی شوق کی سیرابی کر لیتے تھے۔

ادب سے دلچسپی اور فروغ میں پرائمری سطح کے اساتذہ مرزا ہاشم الدین، مولوی پیر بخش کا کردار بھی شامل رہا۔ جن کی محنت اور تدریس کی بدولت ساتویں جماعت میں رسالہ گلدستہ میں ایم۔ انور میانوی کے نام

سے کہانی لکھی۔ ساتویں جماعت تک انور سدید کا رجحان افسانوی ادب اور شاعری کی طرف تھا، اور شاعری میں "تائب" تخلص استعمال کرتے تھے۔

"ساتویں جماعت ہی کے زمانے میں محمد انور میانوی نے "تائب" تخلص کے ساتھ شاعری بھی شروع کی۔ سکول کے ایک استاد نے انہیں پوچھا "میاں! کس چیز سے تائب ہوئے تھے" اس کا جواب بن نہ پڑا تو محمد انور میانوی نے "تائب" تخلص ترک کیا اور اس کے ساتھ "شاعری" بھی چھوڑ دی۔"(۳۵)

دوران تعلیم انور سدید ادب کی طرف شدید راغب تھے، نویں جماعت میں ماسٹر محمد عالمگیر کی راہنمائی میں سکول کی ڈرامہ کلب کے لیے ایک ڈرامہ "سوتیلی ماں" لکھا۔ یہی ڈرامہ انور سدید کی ادبی زندگی کی تاریخ کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں سے ادب کی طرف رجحان بڑھتا چلا جاتا ہے، اسی عمر میں بچوں کے رسائل میں کہانیاں لکھنے اور فیملی رسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب انور سدید F.Sc. میں آئے تو اس وقت، اذکار اور پارس رسائل کا مطالعہ کرتے رہے اور "چترا" میں اُن کا پہلا افسانہ "مجبوری" شائع ہوا۔ ۔ وہاں ایک دکاندار شیر محمد اپنے نام کے ساتھ "پاکستانی" لکھتے اور روزانہ تین اخبارات ملاپ، پرتاپ اور زمیندار کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ ملاپ اور پرتاپ کانگریسی اخبار تھے، انہیں پڑھ کر پاکستانی صاحب ان کے کانگریسیانہ, مضامین کو جواب مسلم لیگی اخبار "زمیندار" میں بھیجتے۔ شیر محمد پاکستانی ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ انور سدید نے اُن کے ذاتی لائبریری سے خوب استفادہ کیا. ادبی رسائل کے مطالعے کے شوق نے انور سدید کی ملاقات شیخ منظور الٰہی کلرک آف کورٹ سے کرائی۔ جن کی ذاتی لائبریری سے ادبی رسائل ہمایوں، عالمگیر، نیرنگ خیال اور ساقی تک رسائی ملی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک انور سدید کی ابتدائی حالات وواقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انور سدید صرف افسانوی ادب کی طرف راغب رہے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۴ء تک انور سدید اپنی پیشہ وارانہ استعداد بڑھانے میں تمام صلاحیتیں صرف کرتے رہے، ۱۹۶۴ء میں، میں جب سرگودھا بحیثیت SDO تعیناتی ہوئی تو اس وقت وزیر آغا کی سرپرستی میں سرگودھا علمی و ادبی حیثیت میں بہت ثروت ہو چکا تھا، اور دبستان کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور سرگودھا اکادمی بھی وجود میں آچکی تھی جس کی صدارت اس وقت کے ڈپٹی کمشنر وزیر آغا کر رہے تھے۔ اس وقت اُن کو ڈاکٹر سہیل بخاری، عبد الرحمان قریشی، نقوی صاحب، شفقت صاحب، باجوہ صاحب، رحمان قریشی، غلام جیلانی اصغر، ایف الدین، قاضی نذیر احمد، نعمت علیگ، میر عبد الرشید اشک، انور گوئندی، اخگر سرحدی، تاج الدین حقیقت، ملک عمر دراز، زیڈ یو خان، اثر چوہان، بیدار

سرمدی اور عاشق حسنین جیسے علم و ادب کے روشن چراغ ادباء کی تنقیدی مجالس نصیب ہوئیں۔ میونسپل کمیٹی سرگودھا لائبریری کے لائبریرین ملک خالق داد کے انتظام میں اکادمی سرگودھا کی باقاعدہ ہفتہ وار تنقیدی مجالس ہوتی تھیں اور ہر اجلاس کے بعد وزیر آغا ہم مذاق ساتھیوں کو اپنے ساتھ گھر لے جاتے اور غیر رسمی ماحول میں علم و ادب کی محافل سجاتے تھے، ۱۹۶۴ء میں انور سدید وزیر آغا کی "شام دوستاں" میں شریک ہوئے۔ وزیر آغاصاحب کی صحبت سے سب سے زیادہ فیض انور سدید نے حاصل کیے اور علمی و ادبی کتب سے دلچسپی وزیر آغا کی ترغیب پر ہوئی۔ انور سدید وزیر آغا کے گھر میں بے تکلف محفل اور وزیر آغا کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "اس گھر کا سب سے خوبصورت حصہ برآمدے کے آخر میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جو ادبیات عالیہ اور علوم جدید کی کتابوں سے مزین تھا۔ آغا صاحب کی نشست دن بھی یہیں رہتی تھی۔ شام کے وقت ایک ٹرالی میں چائے آتی ۔اس زمانے میں آغا صاحب کی چائے کے ساتھ رس گلے پیش کیے جاتے اور یہ آغا صاحب کی چائے کی پہچان بن گئے تھے۔ ان کی لائبریری میں ایک خاص سحر تھا، میں الماریوں میں سجی ہوئی کتابوں کو حسرت سے دیکھتا، لیکن مستعار لینے کی جرأت نہ کر سکتا۔ آغا صاحب ان دنوں "اُردو شاعری کا مزاج" لکھ رہے تھے۔ ایک دن بحث کے دوران میں کسی حوالے کی کتاب کا ذکر آیا تو آغا صاحب نے پوچھا "آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے؟" میں نے نفی میں جواب دیا، تو انہوں نے انگریزی کی یہ کتاب مجھے دی اور کہا "تین چار دن میں اسے پڑھ لو پھر اُردو شاعری کا مزاج" کے اس باب پر بحث ہو گی جو تہذیبوں کے انضمام کے بارے میں ہے۔ آغا صاحب سے کتابیں مستعار لینے کا یہ آغاز بے حد سود مند ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد آہستہ آہستہ ان کی لائبریری میرے گھر منتقل ہونے اور میرے مطالعے کو مہمیز لگانے کا باعث بننے لگی اور وہ وقت بھی آیا کہ آغا صاحب کو اپنی کسی کتاب کی ضرورت پڑتی تو اپنا آدمی بھیج کر مجھ سے اپنی کتاب منگوا لیتے اور میں اصرار سے کہتا کہ پڑھنے کے بعد مجھے واپس کر دیں۔"(۳۶)

انور سدید کی ادبی زندگی کا یہ سفر تنقید و تحقیق کی منزل کی طرف تھا۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک دو سال تک کتب بینی کی ریاضت میں محو رہے۔ ۱۹۶۶ء میں جب اوراق کا پہلا شمارہ زیر ترتیب تھا تو وزیر آغا صاحب نے محمد خالد اختر کا ناول "چاکی واڑہ میں وصال" اور سید قاسم محمود کے افسانوں کے مجموعے "قاسم کی مہندی" پر انور سدید کو تبصرہ لکھنے کا ٹاسک سونپا، دو سال کے طویل عرصے کے بعد انور سدید نے پھر سے قلم کو سنبھالا اور دو شگفتہ مضامین اوراق کے لیے تحریر کیے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا انہوں نے تحقیق و تنقید کو انتخاب کیا اور قلم فرسائی کرنا شروع کر دی، اور صلاح الدین احمد کے اسلوب نگارش پر پہلا مضمون لکھا جس کے بارے میں وزیر آغا کی رائے ہے کہ:

> "آج سے تقریباً سات برس قبل جب میری انور سدید سے تفصیلی ملاقات ہوئی اور میں نے ادب اور ادیب کے بارے میں ان کی جچی تلی آراء سنیں اور ہر رائے کے عقب میں مجھے اُن کے خلوص، منصفانہ رویے اور وسیع مطالعے کا احساس ہوا، تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ سنجیدگی سے تنقید کی طرف متوجہ ہوں۔ بات چونکہ دل سے نکلی تھی اس لیے اس نے قاعدے کے مطابق فی الفور اثر کیا اور چند ہی روز کے بعد انہوں نے ایک بے داغ مسودہ میرے سامنے رکھ کر اپنی مخصوص ملائمت اور انکساری سے مجھے بتایا کہ انہوں نے محض "ارشاد کی تعمیل میں یہ چندے بے ربط سطریں لکھی ہیں، ورنہ تنقید ان کا میدان نہیں ہے"۔ مضمون پڑھ کر میں دنگ رہ گیا۔ کہنے کو تو یہ ان کا پہلا تنقیدی مضمون تھا۔ مگر وہ آنِ واحد میں اس مقام پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں ناقدانِ کرام سالوں کی جانفشانی اور خجالت کے بعد پہنچتے ہیں۔ جب یہ مضمون "اوراق" میں چھپا تو احباب نے میری اس رائے کی توثیق کی اور یہ مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوب نگارش پر پہلا وقیع مضمون قرار پایا۔"(۳۷)

گویا یہ مضمون انور سدید کی تنقیدی اہلیت و صلاحیت کی ابتداء تھی، مولانا صلاح الدین کے اسلوب نگارش پر مبنی مضمون سے تحقیقی و تنقیدی سلسلے کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ جو ارتقائی مراحل طے کر کے اُن کے پہلے تنقیدی مجموعے "فکر و خیال" کی صورت میں ۱۹۷۱ء کو اور "اختلافات" ۱۹۷۵ء کو منظر عام پر آتے

ہیں۔ انور سدید کے تنقیدی سفر اور فنی ارتقاء میں مولانا کا مضمون اہم ثابت ہے، تو دوسری طرف ان کے اولین مجموعۂ مضامین "فکر وخیال" اس مضمون سے قدرے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس مجموعے میں دو مضامین فکر وفن کے حوالے سے بلاشبہ انور سدید کے فنی ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" مقالہ دیہات اور اس کے پس منظر میں لکھے جانے والے شاہکار افسانوں اور نمائندہ افسانہ نگاروں کا از سر نو ادبی مرتبہ متعین کرتا ہے اور ان کے چھپے ہوئے گوشوں کو افشاں کرتا ہے۔ جبکہ دوسرا مضمون "اُردو ادب کی چند فکری تحریکیں" انور سدید کے فنی سفر کا نقطۂ آغاز ہے، اس مقالہ میں انور سدید کے اُردو علم و ادب کا وسیع مطالعہ نظر آتا ہے۔ اس مقالہ میں ولی دکنی کے عہد سے لے کر علامہ اقبال اور علامہ اقبال سے لے کر ڈاکٹر وزیر آغا کے زمانے تک فکر کے دبستانوں کا اس انداز سے جائزہ پیش کرنا کہ یہ فکری تحریک اور دبستان اپنے سیاق وسباق سے نمایاں ہو جاتا ہے۔

انور سدید کو ابتدائی ادوار میں شعر وادب کا فطری ذوق تھا، اولاً شاعری کی، بعد میں داستانیں پڑھنے کا شوق ہوا تو افسانہ نگاری "ہمایوں" اور "نیرنگ خیال" جیسے جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۴۴ء میں جب ڈاکٹر وزیر آغا نے اوراق جاری کیا تو انور سدید ایک محقق اور نقاد کی صورت میں سامنے آئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ترغیب ہی پر ڈاکٹر انور سدید تنقید و تحقیق کی طرف مائل ہوئے۔ اس پلیٹ فارم سے انور سدید نے ادبی زندگی کو بام ارتقاء تک پہنچایا۔ ادب پڑھنا اور ادب لکھنا ان کی عبادت کا درجہ اختیار کر گیا۔ اپنے اس غیر معمولی، علمی تجسس اور فکری انہماک کی بناء پر انہوں نے نہایت وسیع موضوعات پر درجنوں گراں قدر تحقیقی و تنقیدی کتب پیش کیں اور اُردو ادب کو اس کے مجموعی تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کے نقطۂ نظر کی بنیاد بے باکی، دقت نظر، حق گوئی اور صدق فہمی کے امتزاج پر استوار ہے۔ موضوع اور اسلوب کی ترویج میں انور سدید پر ڈاکٹر وزیر آغا کی شرافت، فنی اسلوب اور ادبی آدرش کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> "اگر مجھ سے دریافت کیا جائے کہ میری ادبی زندگی پر سب سے زیادہ اثر کس نے ڈالا ہے۔ تو میں بلا توقف ایک نام لوں گا ڈاکٹر وزیر آغا۔" (۳۸)

انور سدید ماہنامہ اوراق کے ساتھ بحیثیت رکن ۱۹۶۴ء میں شامل ہوئے۔ ماہنامہ اوراق کی پالیسی اور اس کا معیار برقرار رکھنے میں ڈاکٹر انور سدید کے مشوروں کا خاصا عمل دخل رہا ہے۔ ایک عرصہ تک اس ضمن میں انہوں نے اوراق کی تدوین و ترتیب میں مدیران اوراق کی معاونت کی اور جون، جولائی ۱۹۸۹ء میں بطور

مدیر اوراق سے باقاعدہ منسلک ہو گئے۔ ۱۹۹۲ء کے چار سال بعد اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس منصب سے الگ ہو گئے۔

انور سدید کی جرأت، راست گوئی کی عادت، مقابلہ کرنے کی ہمت، ان کے بے پناہ تخلیقی قوت اور تنقیدی قوتوں کے اعتراف میں اوراق نے ان پر خصوصی گوشے کا بھی اہتمام کیا اس میں انور سدید کے فن اور شخصیت پر مختلف مشاہیر ادب کے مقالات و مضامین شائع کیے گئے۔ اپنے ادارتی نوٹ میں اوراق نے نومبر، دسمبر ۱۹۸۳ء کے شمارے میں ۱۹۸۳ء کو انور سدید کا سال قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

> "منافقت کے اس دور میں انور سدید سچ بولنے کی عادت میں مبتلا کیے ہیں اور بادشاہ سلامت ننگے ہیں، کا اعلان کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ چناں چہ اکثر ادبی بادشاہ ان سے ناراض رہتے ہیں اور اُن کے جاں نثار انور سدید پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ مگر اس مرد جری نے ٹوٹنا تو سیکھا ہے، جھکنا نہیں سیکھا۔ چناں چہ وہ تن تنہا ایک زمانے سے بر سرپیکار رہے اور دشنام طعن و تشنیع اور توہین آمیز کلمات کا ہمہ وقت مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں۔"(۳۹)

بالا مباحث سے پتہ چلتا ہے کہ انور سدید کی ساری ادبی زندگی ڈاکٹر وزیر آغا اور اوراق سے عبارت ہے۔ اُن کے اَن گنت شب و روز اوراق اور ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ بسر ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں اُنہوں نے گراں قدر علمی و ادبی خدمات سرانجام دیں۔ وزیر آغا کی زندگی اور ادب سے کافی متاثر تھے۔ اور ان کی شاگردی کو اختیار کر لیا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید نے وزیر آغا کے پیش رو اور شاگرد ہونے کا کردار عمدگی سے نبھایا۔ اُن کی کتاب "وزیر آغا مطالعہ" وزیر آغا کے ساتھ ایک طرف دلی عقیدت کا اظہار ہے تو دوسری طرف انہوں نے وزیر آغا شناسی میں اہمیت کا حامل ہے۔ ویسے تو انور سدید اور وزیر آغا کے حوالے سے "اُردو ادب کی تحریکیں" ایک معروف کتاب ہے، بحوالہ گہرے علمی و ادبی رشتے کی مستحکم حیثیت بھی تصور کی جاتی ہے۔ وزیر آغا شناسی کے فروغ میں اس علمی و ادبی گہری رغبت کا تاثر موجود ہے۔ وزیر آغا ایک مطالعہ انور سدید نے ان کے ۶۰ ویں سالگرہ کے موقع پر منظر عام پر لائے۔ اس کتاب میں "فصلیں اور خوشے" کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر آغا کا تخلیقی سفر مختلف حوالوں سے پیش کیا گیا ہے، انور سدید اُن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

"وزیر آغا نے میرے دل میں ادب کی بجھی ہوئی قندیل کو دوبارہ روشن کیا۔ نیز ادب کو حصولِ مقاصد کا وسیلہ بنانے کے بجائے مجھے اس کے لیے خونِ دل جلانے کا ذوق و شوق عطا کیا۔ اُنھوں نے مجھے اس کوہ کنی کا عادی بنایا جس کا حاصل یہ "شیریں" ہے۔ اور نہ "جوئے شیر" بل کہ جس کا ثمر تخلیقی نکتہ آفرینی کی وہ لذت حیات آفریں ہے۔ جس سے روح سبکسار ہو جاتی ہے اور بدن کا تمام زنگ اتر جاتا ہے۔"(۴۰)

انور سدید جہاں وزیر آغا کے فن اور فکر سے متاثر نظر آتے اور ادب اُن کو اپنے اُستاد کا درجہ دیتے ہے۔ وہاں اقبال کی تحریروں سے بھی متاثر نظر آتے ہے۔ اقبالیات اور اُس کا مطالعہ اُن کا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کی شاعرانہ، فنی و فکری، ادبی حیثیت پر انہوں نے اقبال کے کلاسیکی نقوش، اقبال شناسی اور ادبی دنیا، اقبال شناسی اور اوراق جیسی تنقیدی کتب تصنیف کیں۔۔ انہوں نے اقبال کی فکر و فن کی تفہیم اور اُس کی پرچار میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُن کے نزدیک علامہ اقبال ایک شاعر نہیں بلکہ انیسویں صدی کے اواخر میں سماجی اضطراب، فکری تحرک اور سیاسی تموج کی ایک نمایاں لہر کو فعال ادبی تحریک کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اقبال کی تحریک نے اپنے عہد کو متاثر کیا اور اب نئے حالات میں بھی ایک زندہ اور فعال تحریک ہے اور اپنے دائرہ اثر کو پھیلا کر مزید نئی تحریکوں کو جنم دے رہی ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی شاعری میں ایک مسلسل ارتقاء ملتا ہے اس طرح ان کی شاعری میں رومانیت بھی مائل بہ ارتقاء ہے۔ انہوں نے شاعری میں اپنے رومانی تصورات کو منفرد انداز میں پیش کیا اور انسان کے داخل اور خارج میں ہم آہنگی پیدا کی۔ اقبال کی مثبت رومانی عمل نے فرد کے متزلزل یقین کو ثبات مہیا کر دیا اور زندہ رہنے اور زندگی کو عمل مسلسل میں تبدیل کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ جس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

"اقبال کی رومانیت انفعالیت کے برعکس بے حد فعال ہے اور اس کی تخلیقی لپک نے برصغیر کا تاریخی، فکری، ثقافتی نقشہ بدلنے میں مثبت اور اہم کردار سرانجام دیا ہے۔"(۴۱)

اقبال کے کلاسیکی نقوش میں علامہ اقبال کی شاعری کا فنی و فکری مطالعہ کیا، اور مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے اقبال کے فن اور فکر پر رائے دیتے ہیں کہ: اقبال کی یہ خوبی ہے کہ وہ ایک ہی نظم میں موضوعات کی بو قلمونی کے باوصف نظم کی کلاسیکی تعمیر کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں اور وحدت خیال سے قاری کو

اپنے فکری مرکز سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ ان کی نظموں کی ہیئت اور ایجاد غزل کی کلاسیکی روایت کا آئینہ دار ہے۔ تاہم اس ایمائیت میں ایجاز کے بطون میں ایک جہاں معنی چھپا ہوتا ہے اور اقبال کا قاری تلمیحات، تشبیہات اور علائم ورموز کے حوالے سے مرکزی خیال کو ایک سے زیادہ زاویوں سے گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال ایک اخلاقی اور ملی نصب العین کے تابع نظر آتے ہیں اور وہ نظم کی ترکیبی وحدت سے خرد کے غیر تراشیدہ جذبات کی تہذیب و آرائش میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں اور یوں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں اور یوں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ضبط و نظم قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ عمل چونکہ کلاسیکی خاصیت کا حامل ہے۔ اس لیے اس کا پرتو اقبال کی شاعری کے مجموعی کل پر محیط ہے۔ اور ان اوصاف کی بناء پر جب اقبال کی شاعری کا مزاج متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو ان کی تخیلی بلند پروازی کے ساتھ موضوع کی عظمت، تخلیقی عمل کا توازن، فکر کا اعتدال اسلوب کا جلال اور مجموعی طور پر اقبال کی تہذیبی شخصیت اور منضبط رویے کو بھی یکساں اہمیت دی جاتی ہے اور ایک ایسا شاعر قرار دیا جاتا ہے جن کے ہاں کلاسیکیت کا دوام ابد بھی موجود ہے۔

اقبال کی شاعری اور ان کے افکار کی افہام تفہیم کا عمل اکیسویں صدی میں بھی جاری و ساری ہے۔ اس عمل میں انور سدید کی اقبالیاتی مطالعہ بھی معاون و مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ ان کی کتاب اقبال کے کلاسیکی نقوش، جو پانچ مضامین اقبال کی تحریک، رومانیت، مخزن اور اقبال، اقبال کی عبوری دور کی غزل اور اقبال کا تصور حیات و مرگ پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں انور سدید اقبال کی فکری ارتقاء کا فلسفیانہ تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ اقبال کی شخصیت و فن اوائل عمری کی شعری مجالس، ادبی ماحول، سیاسی، تہذیبی، ادبی صورتحال اور امت مسلمہ کی ہمہ پہلو حالت زبوں حالی کے اثرات اور اقبال کی شعری ارتقاء پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اُن کا یہ مطالعہ اُن کی تخلیقی اصناف فکر و فن کی صورت میں کہیں کہیں ملتا ہے۔ جس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے فن اور فکر کی تقلید میں فخر محسوس کرتے ہے۔

(v) ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ:

انور سدید کی علمی و عملی زندگی مسلسل جدوجہد نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے ان دونوں میدانوں میں کامیابیاں سمیٹیں۔ اُنہوں نے ادبی زندگی کا آغاز افسانے سے کیا ہے۔ عصمت علیگ کے مجلے "اردو زبان" سے وابستگی کے بعد ان کا رجحان انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہوا۔ لیکن جب اُن کی پہلی تنقیدی کتاب " فکر و خیال " شائع ہوئی تو اس کو کافی پذیرائی ملی۔ فکر و خیال انور سدید کا پہلا تنقیدی مضامین پر

مشتمل مجموعہ ہے۔ جسکے مکتبہ اُردو زبان سرگودھا نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ یہ مجموعہ اُن کے فنی ارتقاء کی ابتدائی منزل اور سنگ ہائے میل تصور کیا جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل مضامین "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" اور "اُردو ادب کی چند فکری تحریکیں" دیہات کے پس منظر میں لکھے جانے والے شاہکار افسانوں اور نمائندہ افسانہ نگاروں کا از سر نو جائزہ لے کر اُن کا ادبی مرتبہ ان مضامین میں مرتب کیا۔ یہ مضامین تحقیق و تنقید کا نہایت حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ یہ مضامین ایک طرح سے تحقیقی خاکہ ہیں۔ جو بعد میں جا کر "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" اور "اُردو ادب کی تحریکیں" کے عنوان سے تحقیقی کتب کی صورت میں شائع ہوئیں۔ یوں تنقیدی حیثیت نمایاں ہوئی اور دیگر تخلیقی سرگرمیاں ماند پڑی رہی تھیں۔ یوں تحقیق اور تنقید کی کامیابیوں نے اُن کے اس سلسلے کو طویل کر دیا اور کثرت سے تصانیف کی طرف رجحان بڑھتا گیا فکر و خیال کے چار سال بعد ۱۹۷۵ء میں دوسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ عنوان "اختلافات" کے نام سے مکتبہ اُردو زبان سرگودھا سے شائع ہوا۔ اختلافات میں کل مضامین کی تعداد ۱۷ ہیں۔ اس تنقیدی مجموعے میں انور سدید نے زبان، ادب، تاریخ، ابلاغ، جدیدیت، انشائیہ، تنقید، صحافت، نظم، سوشلزم اور روحِ عصر کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے، جسے انور سدید نے اپنی نئی فکر کے ساتھ نہ مس کیا ہو۔ اس کتاب کے دو نمائندہ مضامین "ممتاز شیریں کی تنقید" اور دوسرا "اُردو نظم میں صنف نازک کے جنسی رجحانات" اہمیت کے حامل ہیں۔ اول الذکر مضمون میں انور سدید نے ممتاز شیریں کی معیار کو پیش نظر رکھ کر اُردو ادب کی تنقید اُن کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا۔ جب کہ دوسرے مضمون میں انور سدید نے نظموں کے حوالے سے شاعرات کے شعری باطن کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اولین دونوں مجموعے انور سدید کی وسعت مطالعہ ژرف نگاہی، ادبی خلوص اور نئے تنقیدی فکر اور نظریات کی منفرد مثال ہیں۔ جب کہ اور تصنیف "کھردرے مضامین" تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۵ء کو فنون پریس، لاہور سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا اور اپنی تحریروں پر مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے تنقیدی مضامین کا جواب کھردرے انداز میں دیا، جس میں ادبی مسائل کو فوقیت دی گئی ہے اور ادبی آراء کی قدر، اختلاف رائے اور رد عمل کے بارے میں اپنا نظریاتی مؤقف دیا۔ "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" اردو تحقیق میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۸۳ء کو الٰہ آباد (بھارت) سے شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن انور سدید کے حیات ہی میں اکبر امین پریس، لاہور سے ۲۰۰۵ء کو شائع ہوا۔ "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" ایک مضمون تھا۔ جو ۱۹۵۷ء کو اوراق میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ۱۹۷۱ء میں یہ مضمون پہلی تنقیدی مجموعے فکر و خیال میں بھی

پیش کیا۔ موضوع کی مقبولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے انور سدید نے اسے وسعت مطالعہ سے پھیلاؤ دیا اور ایک جامع تصنیف کی صورت میں پیش کیا۔ اس کتاب میں افسانہ نویسوں کی دیہاتی زندگی پر روشنی ڈال کر اپنے نقطۂ نظر سے پرکھا اور منشی پریم چند سے سے لے کر مرزا حامد بیگ تک اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش کو مختلف زاویوں سے پیش کیا۔ اُردو افسانوں میں دیہات کی پیش کش کے منفرد زاویوں کو ایک کتاب میں مقید کر کے ڈاکٹر انور سدید نے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے فطری حُسن کو دیکھنے، سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کی طرف ایسی رہ گزر فراہم کی جس سے قاری نت نئے تجربات حاصل کر سکتا ہے۔ یہ کتاب تحقیقی زاویے سے انفرادیت کی حامل ہے۔ جب کہ "انشائیہ اُردو ادب میں "ڈاکٹر انور سدید کی عرق ریزی کا ثمر ہے۔ یہ کتاب انور سدید کی تنقید کے توازن استدلال کی عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے انشائیہ پر ٹھوس مؤقف پیش کیا۔ اور تنقیدی وضعداری سے مدلل انداز میں رائے کا اظہار کیا۔ جس کے نتیجے میں انشائیہ کے اصول و ضوابط کے علاوہ تعمیر و تشکیلِ فن کے زاویے ایک عام قاری پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ اب انشائیہ کے فنی نقطۂ نظر سے اور اصولی طور پر بہتر سمجھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب صرف انشائیوں کی نہیں بلکہ ۲۰ ویں صدی کے مجموعی ادب پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اُردو انشائیہ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انشائیہ میں تحقیقی سفر کے لیے واضح راہنمائی بھی کرتی ہے۔ "ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ " ۱۹۸۳ء کو مکتبہ جدید پریس، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر انور سدید نے انشائیہ کے حوالے سے وزیر آغا کے فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید نے انشائیہ کا خلاصہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ انشائیہ شعور اور لاشعور کے سنگم پر تخلیق ہوتا ہے۔ انشائیہ وحدت میں کثرت کا جلوہ دکھاتا ہے۔ انشائیہ میں موضوع ہمہ وقت مرکزی نقطہ اور شخصیت کے درمیان پنڈولم کی طرح حرکت کرتا رہتا ہے ۔ انشائیہ کا تجربہ زندگی کے کٹھن ریاضت ہی کا ثمر ہے۔ موضوع انشائیہ میں پتنگ کی مانند ہوتا ہے جو کھلی فضا میں پرواز کرتا ہے۔ انشائیہ غیر رسمی اور شگفتہ انداز بیان پسند کرتا ہے۔ انشائیہ موضوع کی تازہ کاری اور اسلوب کی ندرت سے تشکیل پاتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے وزیر آغا کے عہد کی ادبی تاریخ کا احاطہ کیا۔ جو ایک قابل قدر کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ "اُردو ادب میں سفر نامہ "ڈاکٹر انور سدید کی کامیاب کاوش ہے۔ جس کی اشاعت کا اہتمام ڈاکٹر وحید قریشی نے کیا۔ ۴۴۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سفر ناموں کی ابتداء اور روایت پر روشنی ڈالی گئی۔ اُردو ادب کے ذخیرے میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ اور تحقیق کے اعتبار سے منفرد اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ اُن کی یہ عالمانہ اور محققانہ تالیف اہل علم و فن کے سامنے اعلیٰ معیار کی ایک

عمدہ تصنیف ہے۔ "بر سبیل تنقید" کتاب ۱۹۹۰ء مقبول اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی۔ بر سبیل تنقید ۲۵ تنقیدی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہیں۔ کتاب کا انتساب مشفق خواجہ اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے نام ہے۔ کتاب میں ممتاز مفتی، جوگندر پال، بلراج کومل، ہرچرن چاولہ، محمد اسفر ساجد اور ملک مقبول احمد کی آراء بھی شامل ہیں۔ یہ مضامین اوراق، سیپ، نقوش، ماہ نو، صحیفہ اور جام نو میں شائع ہوئے تھے۔ جن کو ترتیب دے کر "بر سبیل تنقید" میں کتاب کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ انور سدید کے یہ مضامین اُن کے تحقیقی مزاج کا آئینہ ہیں۔ "مکالمات" اکتوبر ۱۹۹۱ء میں مکتبہ فکر و خیال، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا ایک عہد ساز شخصیت کے متعلق کچھ انٹرویوز جو ریڈیائی اور پرنٹ میڈیا میں شائع ہوئے۔ ۱۹۹۱ء تک کے تمام انٹرویوز کو کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں وزیر آغا سے لیے گئے مختلف ادیبوں کے انٹرویو شامل ہیں۔ جن کی کل تعداد ۲۷ ہے، ان میں مصاحبہ کے عنوان سے انور سدید کا لیا گیا انٹرویو بھی شامل ہے۔ وزیر آغا کے خطوط (انور سدید کے نام) مارچ ۱۹۸۵ء کو شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شامل خطوط سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ڈاکٹر انور سدید کی علمی و ادبی قدر و منزلت کا کس واضح انداز میں اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی مختلف تحریروں کے بارے میں انور سدید کا بہت سا تحقیقی مواد ان خطوط میں موجود ہے۔ انور سدید نے کتاب میں شامل خطوط پر جو بے لاگ تبصرہ کیا ہے وہ وزیر آغا شناسی میں مدد دیتا ہے۔ اس کتاب میں خطوط کے علاوہ کئی نادر تصاویر بھی شامل ہیں۔ خطوط نگاری کی روایت اور وزیر آغا کے ہاں خطوط کی اہمیت اور قدر و منزلت کے اہم نکات پر بحث کی جاسکتی ہے۔ محققین اُردو کے لیے خطوط نگاری کے موضوع کے حوالے سے منفرد اہمیت کی حامل تصنیف ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "غزل کے رنگ میں" اُن کے حلقہ احباب سے تعلق رکھنے والے شعراء کرام، عصر حاضر کے ممتاز شعراء کے علاوہ قدیم شعراء، جدید شعراء کی غزلیات پر تبصرہ و تنقید کی گئی ہے۔ ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیار پوری، تابش دہلوی اور شکیب جلالی کو اُردو غزل کے ارباب اربعہ میں شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون "اُردو غزل چند ابتدائی باتیں" میں کلاسیکل شعراء کے علاوہ دورِ جدید کی غزل کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ "جدید نظم کے ارباب اربعہ" میں ن۔م۔ راشد، مجید امجد، ڈاکٹر وزیر آغا، عزیز احمد مدنی کو پاکستان میں جدید اُردو نظم کے ارباب اربعہ کا درجہ دیا ہے۔ عارف عبد المتین (ترقی پسند تحریک کی آواز)، الطاف گوہر (حلقہ ارباب ذوق کی آواز) کے بارے میں بھی ڈاکٹر انور سدید نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ "اُردو ادب کی تاریخ" کے حوالے سے بہت کتابیں اعلیٰ پایہ کے مصنفین لکھ چکے ہیں۔ جو کہ کئی شہرہ آفاق تصانیف بھی شمار

ہوتی ہیں۔ سب کا انداز اور اسلوب مختلف ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی یہ تصنیف فہرست مضامین کے لحاظ سے الگ اسلوب اور تحقیقی انداز لیے ہوئے جو عام قاری با آسانی سمجھ سکتا ہے اور تاریخ کا مطالعہ بھی کر سکتا ہے، نوخیز اُردو طالب علموں کے لیے یہ کتاب مشعل راہ ہیں۔ جو معلومات کا وافر ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ انور سدید اس کتاب کی تخلیق کی وجہ ڈاکٹر وحید قریشی کو قرار دے رہے ہیں۔ اُنہی کے فکر کو ایک مختصر جلد میں اُردو ادب کی مختصر تاریخ مرتب کی جائے، انور سدید نے اس خواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جو ان کی مطالعاتی اور تحقیقی سنجیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ انور سدید کی یہ کتاب اس لحاظ سے منفرد کی کہ انہوں نے موجود تاریخی، سیاسی، سماجی لسانی اور تہذیبی کروٹوں کو مس بھی کیا ہے۔ "غالب کا جہاں اور" اس تصنیف میں انور سدید نے روایت سے ہٹ کر اپنی تنقیدی بصیرت اور فکر و نظر سے نئے مفاہم دریافت کیے اور غالب کی شخصیت اور زندگی کو شاعری سے پرکھا، غالبیات کے ضمن میں یہ ایک منفرد اضافہ ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے قاری کو بصیرت ملتی ہے اور غالب کی تفہیم میں آسانی میسر ہے۔ کتاب کم تعداد میں چھپنے اور تقسیم ہونے کے بعد اس دور میں نایاب ہے۔

اوپر بیان کیے گئے تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی کتب کا مختصر تبصرہ اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ انور سدید کے تخلیقی زاویے پر تجزیہ اور اس پر رائے کے لیے انور سدید کے ان چند نمائندہ تنقیدی و تحقیقی کتب کا مطالعہ ضروری تھا۔ ان کتب کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے سے یہ بات انور سدید پر صادق آتی ہے کہ اُن کا مطالعہ وسیع تھا، موضوعات کی ترتیب، اعتدال، توازن اور ترتیب کا عنصر نمایاں ہے۔ اگرچہ کئی تصانیف پہلے سے موجود موضوعات، مضامین جو مقدمہ کی صورت میں تھے یا کسی باب کے ضمنی حصے میں تھے۔ اُن کو وسعت دے کر کتابی شکل میں پیش کیا۔ اُردو ادب میں اُن کی گراں قدر خدمات ہے۔

انہوں نے شاعری، افسانہ، تنقید نگاری، انشائیہ نگاری، سفر نامہ نگاری، دیباچہ نگاری اور تبصرہ نگاری الغرض ہر صنف ادب میں اُردو ادب کے میدان میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہے۔ انور سدید کی خوبی تھی کہ لامحدود علمی اور معاشرتی ترقی کے باوجود انسان کا وحشیانہ پن اور خود غرضانہ رویہ ختم نہیں ہوا اور قول و فعل کا تضاد مسلسل جاری ہے۔ انور سدید ادب میں اس صورتحال کو بدلنے کی آرزو رکھتا ہے۔ وہ خود غرض جذبوں اور جبلتوں میں مقید انسان نما حیوان کو شعور کی رُو دکھانا چاہتا تھا۔ اُن کی زبان شگفتہ، انداز بیان دلکش اور خیالات حسین تھے۔ وہ انتہائی مخلص دوست، بہترین باپ، کامیاب شوہر، نرم دل بااصول افسر اور بے حد ہر دل عزیز دوست تھے۔ انہوں نے دوستی کو ہمیشہ ذات کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور کبھی مشینی عمل کا حصہ نہ

ہونے دیا۔ وہ ایک حساس اور انسانوں سے بے پناہ محبت کرنے والے آدمی تھے۔ جو اپنے خارجی تحریک سے وابستگی اپنی ذات کے حوالے سے استوار رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے فن کو کبھی پروپیگنڈہ نہیں ہونے دیا۔ اور ایسی شخصیت ہے کہ جو شہرت کے پیچھے نہیں بھاگی بلکہ شہرت خود اس کے پیچھے رہتی تھی۔ انور سدید جامع الصفات انسان تھے اور علم و ادب کی دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت کے حامل شخص تھے۔ ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔ رکھ رکھاؤ اور بے تکلف طبیعت کے حامل ہونے کی وجہ سے نئے ملنے والوں کا خیر مقدم کرتے۔ اُن کی زندگی میں کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں تھی۔ بالکل صاف، سیدھی، ہموار اور واضح طور پر زندگی گزارنے والے شخص تھے۔ یہی تمام تر پہلو ان کے فن میں بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اُن کی تمام تحقیقی اور تخلیقی اصناف ادب میں وسعت مطالعہ اور علمیت جھلکتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی تحریروں میں بے تکلفی اور احساس کا تاثر ملتا جو انور سدید کی زندگی کا خاصہ ہے۔ اُن کا ذہن داخلی تاثرات کے ساتھ ساتھ خارجی محرکات سے بھی شدید تحریک لیتا ہے۔ زندگی میں اعتدال، توازن اور اخلاص کا پہلو ہمیشہ تھامے رکھا، زندگی میں علم سیکھنے، بانٹنے اور محنت و خدمت گزاری سے جینے کے سلیقے کا درس ملتا ہے۔ انور سدید کو زندگی ابتداء سے یعنی گھریلو ماحول، اساتذہ کا کردار اور حلقہ احباب سے قدرتی طور اپنے فن اور جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اُن کے ساتھی رفقاء میں مشفق خواجہ، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سہیل بخاری، وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر اور دیگر علم و ذہانت کے پیکر اشخاص موجود تھے۔ الغرض انور سدید کا شمار اُردو ادب کے ان ادباء میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے ادب کے ساتھ اپنی وابستگی کو تادم مرگ جاری رکھا۔ مصروف پیشہ وارانہ اور ادبی زندگی کی بدولت ان کی طبیعت میں نظم و ضبط تھا۔ اردو ادب کی کثیر الجہت اصناف کا مطالعہ اور مہارت سے اُن پر قلم فرسائی، اُن کی شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں کو آشکار کرتی ہے۔ ادب میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ مطالعہ کو تخلیق کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔ ڈاکٹر انور سدید کی تحریروں میں جہاں ہمیں داخلی زندگی اور خارجی مظاہر کا امتزاج ملتا وہاں اُن کا وسعت مطالعہ اور مشاہدہ کے اثرات بھی گہرے ملتے ہیں۔ اُن کی تحریریں میں گفتگو نظریاتی، تنقید ماورائی، اور شاعری میں حُسن و عمل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جس سے اُن کی ادبی رویوں میں تشکیل اور ارتقاء کا تسلسل ہے۔ اُردو ادب میں اُن کا وافر ذخیرے کو دیکھ کر ان کے علمی و ادبی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بطور نقاد، انشائیہ نگار، شاعر، افسانہ نگار، کالم نگار اور محقق ان کا کام انتہائی غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ جو کہ ناقابل فراموش ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر انور سدید: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، (انٹرویو)، از محمد اسلم حیات، ماہنامہ، صدائے انقلاب، لاہور، مارچ ۱۹۹۱ء

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، (انٹرویو)، از رضی الدین رضی / شاکر حسین، ماہنامہ، قومی آواز، ملتان، یکم جولائی ۱۹۸۸ء

۴۔ سجاد نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر انور سدید: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۸

۵۔ ایضاً، ص ۱۹

۶۔ مسرت شاہین، ڈاکٹر انور سدید: اُردو ادب کی مایہ ناز شخصیت، (مشمولہ)، سہ ماہی اسالیب، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۲۳، ص ۳۲

۷۔ ایضاً، ص ۳۳

۸۔ فرخندہ لودھی، بھائی صاحب، (خاکہ) سہ ماہی، روشنائی، کراچی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء، شمارہ ۱۲، جلد دوم، ص ۲۱۰

۹۔ ہارون الرشید تبسم، انوارِ ادب، مقبول اکادمی، لاہور، جون ۲۰۱۶ء، ص ۳۴۶

۱۰۔ عذرا اصغر، درویش ادیب، (مشمولہ)، سہ ماہی روشنائی، کراچی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء، شمارہ ۱۲، جلد دوم، ص ۳۰۲

۱۱۔ سجاد نقوی، پروفیسر، انور سدید ایک رابطہ، (مشمولہ)، اوراق، لاہور، مارچ، اپریل ۲۰۰۴ء، شمارہ ۱۳۵، ص ۲۰۷

۱۲۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، انوارِ ادب، مقبول اکادمی، لاہور، جون ۲۰۱۶ء، ص ۴۸۹

۱۳۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، انوارِ ادب، مقبول اکادمی، لاہور، جون ۲۰۱۶ء، ص ۶۸

۱۴۔ ملک مقبول احمد، آپس کی باتیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۷۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، انوارِ ادب، مقبول اکادمی، لاہور، جون ۲۰۱۶ء، ص ۳۴۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۸۹

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۲۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۲۲۔ خسروی، انجمن خیال، مکتوب، مطبوعہ، ماہنامہ تخلیق، شمارہ ۷۔ جلد ۱۹۸۰، ۱۱ء، ص ۱۲۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۲۴۔ سجاد نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر انور سدید: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶

۲۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، زندہ لوگ، (تالیف)، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱

۲۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اقبال کے کلاسیکی نقوش، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۳

۲۷۔ سجاد نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر انور سدید: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۴۵

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۴۸

۲۹۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، انوارِ ادب، مقبول اکادمی، لاہور، جون ۲۰۱۶ء، ص ۴۸۷

۳۰۔ ایضاً،، ص ۳۰۷

۳۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، (مشمولہ)، ہفت روزہ، کوہسار، بھاگل پور، انڈیا، ۶ دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۳

۳۲۔ ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر، انور سدید۔۔۔۔ تمام اپنی صحبت ہوئی، والسلام، (مشمولہ)، سہ ماہی اسالیب، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۲۳، ص ۶

۳۳۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، انوارِ ادب، مقبول اکادمی، لاہور، جون ۲۰۱۶ء، ص ۳۵۰

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۴۸

۳۵۔ سلطانہ مہر، گفتنی، مہر بک فاؤنڈیشن، لاس اینجلز، امریکہ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۴

۳۶۔ انور سدید، اوراق پینتیس سالہ، (مشمولہ)، اوراق، لاہور، مارچ، اپریل ۲۰۰۲ء، خصوصی نمبر، ص۳۵

۳۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۵ء، ص۹

۳۸۔ انور سدید، اوراق پینتیس سالہ، (مشمولہ)، اوراق، لاہور، مارچ، اپریل ۲۰۰۲ء، خصوصی نمبر، ص۳۵

۳۹۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، انوار ادب، مقبول اکادمی، لاہور، جون ۲۰۱۶ء، ص۴۵۳

۴۰۔ ایضاً، ص۶۸

۴۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اقبال کے کلاسیکی نقوش، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۱۰۷

باب دوم:

ڈاکٹر انور سدید کی افسانوی نثر، تجزیاتی و اسلوبیاتی مطالعہ

(الف)ڈاکٹر انور سدید کی افسانوی نثر، مطالعاتی جائزہ:

(i) افسانوی ادب روایت اور رجحانات مختصر جائزہ:

اُردو میں افسانہ نگاری کی تاریخ ڈیڑھ سو سال پر محیط ہے۔ افسانہ نگاری کے اولین نقوش کے متعلق محققین تضاد روا رکھتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک ابتدائی افسانہ نگاری کی روایت کو راشد الخیری کے افسانہ " نصیر اور خدیجہ " کو بنیاد قرار دیتے ہیں جبکہ بعض کا خیال ہے کہ اُردو کے پہلے باقاعدہ افسانہ نگار پریم ہے اور " دنیا کا سب سے انمول رتن " اُن کا اولین افسانہ تصور کیا جاتا ہے جو ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ جب کہ بعض کے نزدیک سجاد حیدر یلدرم اُردو کے اولین افسانہ نگار ہیں۔

افسانہ نگاری سے پہلے داستانوی دور تھا، پھر داستان کی جگہ ناول نے لے لی اور بعد میں افسانہ صنف متعارف ہوا۔ درحقیقت مغربی ادب کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اُردو ادب بھی متاثر ہوتا رہا ہے، الغرض دیگر اصناف کی طرح افسانہ بھی مغربی ادب کا اثر لیے ہوئے ہے۔ جیسے جیسے نئے تخلیق کاروں نے فن افسانہ نگاری میں طبع آزمائی شروع کی تو افسانے میں بہت ساری تشبیہوں، استعاروں اور علالت کا تبادلہ ہوا، جیسے جیسے یہ روایت پختہ ہوتی گئی اور ساتھ ساتھ تحریکوں کے عناصر اس میں شامل ہوئے تو افسانے کے قدم بھی مضبوط ہوتے گئے۔ اس سلسلے میں رومانوی اور ترقی پسند تحریک کے گہرے نقوش افسانے پر مرتب ہوئے، جو آج تک افسانے پر موجود ہیں۔ جب جب نئے افسانہ نگار اس صنف میں قدم رکھتے ہیں اکثر ابتداء میں رومانوی انداز اپنائے ہوئے ہیں۔

اگر بیسویں صدی کی پانچویں یا چھٹی دہائی میں افسانہ نگاری کا جائزہ لیں تو اس تناظر میں افسانہ نگاری میں بڑے ناموں کے ساتھ ساتھ کم معروف اور نئے افسانہ نگار بھی حلقۂ اُردو ادب میں نظر آتے ہیں۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ اُردو ادب کی معروف علمی و ادبی شخصیت ڈاکٹر انور سدید نے بھی اپنی زندگی کا آغاز بطور افسانہ نگار کیا تھا۔ انور سدید کی اُردو ادب میں بنیادی شناخت تنقید نگاری تھی لیکن اُن کی تخلیقی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ بہ طور محقق، نقاد، مؤرخ اُن کی حیثیت، مقام اور انفرادیت ادبی حلقوں میں نمایاں ہے

لیکن اُن کی افسانہ نگاری کی تخلیقی جہت ادبی حلقوں کی نظر سے پوشیدہ ہے۔ اُردو افسانہ نگاروں کی صف میں انور سدید کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اس سوال کے پیش نظر اُن کے معاصرین کے پس منظر میں انور سدید کا مقام و مرتبہ متعین کیا جانا چاہیے۔ تاکہ یہ ادراک کیا جاسکے کہ انہوں نے افسانے کے کس رجحان سے متاثر ہو کر افسانہ نگاری شروع کی۔ لہٰذا یہ امر ضروری ہے کہ انور سدید کی افسانہ نگاری کا جائزہ لینے سے قبل معاصر افسانوی ادب میں نمائندہ رویوں اور رجحانات کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس وقت اُردو افسانہ پر تین قسم کے رجحانات معاصر افسانے پر غالب رہے ہیں۔

۱۔ معاشرتی اصلاح پسندی

۲۔ ترقی پسندی / حقیقت نگاری

۳۔ رومانیت پسندی

ادبی فن پارے کی ماہیئت، اُس کے اصول اور فن پارے کی تفہیم کے ضوابط ہر عہد میں تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کہ افسانہ میں ابتداء رومان اور پھر حقیقت نگاری کے ساتھ راوی، بیانیہ، کردار، واقعہ، منظر، فضا اور منشائے مصنف کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ پھر تقسیم، ہجرت اور غریب الوطنی کے مسائل نے جس طرح افکار کو تحریک دی اور فنکارانہ ضابطوں میں اضافہ کا جواز فراہم کیا۔ جدیدیت کے رجحان نے بڑی حد تک وجودی طرزِ فکر و احساس کو فروغ دیا۔ فرد کی تنہائی، بے بسی، مایوسی، گم شدہ شناخت، منقسم شخصیت، اجنبیت جیسے مسائل افسانوں کے موضوع بن گئے اور طرز فکر ترویج کرتے کرتے علامتی بیانیہ تک جا پہنچا۔

بیسویں صدی نے اُردو افسانے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں اُردو افسانے کے اولین نقوش سیدھے ہیں۔ لیکن اُردو افسانے کا باقاعدہ آغاز و ارتقاء بیسویں صدی میں ہوا۔

اسی صدی میں اُردو افسانے نے ترقی کے منازل طے کیے۔ موضوع، تکنیک اور اسلوب کے لحاظ سے افسانے میں متعدد تبدیلیاں موضوع پذیر ہوئی ہیں۔ اسی طرح مختلف تحریکات، میلانات، رجحانات اور رویوں کی یلغار کے سبب افسانے نے نشیب و فراز کے کئی دشوار مراحل گزارے۔

افسانہ کی ابتداء اور آغاز میں اُردو ادب پر اصلاح پسندی کا رجحان غالب رہا۔ جس کے نمائندہ افسانہ نگار راشد الخیری تھے۔ اُن کا پہلا افسانہ نصیر اور خدیجہ، اشاعت ۱۹۰۳ء نمائندہ افسانہ تھا۔ انہوں نے اپنے

افسانوں میں مسلم تعلیم یافتہ لڑکیوں کی اخلاقی زبوں حالی اور معاشرتی انحطاط کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اُردو افسانے میں اصلاح پوشیدی اور قوم پرستی کے حوالے سے دوسرا بڑا نام سلطان حیدر جوش کا ہے۔ اُن کے افسانوں میں قوم پرستی کا ردعمل واضح دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرتی سطح پر مغرب کی تقلید پر بے باک تنقید کی ہے۔

قوم پرستی اور اصلاح پسندی کے حوالے سے ترقی پسند سوچ کی حامل شخصیت پریم چند اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے بھی سلطان حیدر جوش کی طرح حب الوطنی کے جذبے اور قوم پرستی کے مقصد کے تحت انگریز راج کی مخالفت کی۔ اُن کے افسانے "عشق دُنیا" اور "حب وطن" وطن کی محبت سے سرشار ہونے کے عمدہ نمونے ہیں۔

قوم پرستی اور مقصدیت کی اس روایت میں ہندووانہ نقطۂ نظر سے اُردو افسانے میں اصلاح پسندی کا آخری نمائندہ سدرشن (۱۸۹۶ء۔۱۹۶۷ء) ہے۔ اُس نے سیاسی و سماجی حوالوں سے ہندو طبقے کے عمومی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اُردو افسانہ پر اثرانداز ہونے والے رجحانات میں سے اہم رجحان حقیقت پسندی یا ترقی پسندی کا ہے۔ پریم چند جنہیں بالاتفاق اُردو کا اولین افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے افسانے کو حقیقت پسندی کی مضبوط و مستحکم بنیاد فراہم کی۔ انہوں نے نہ صرف اُردو افسانے کے خدوخال کو واضح کیا بلکہ زندگی کے اہم مسائل کو افسانے کا موضوع بنایا۔ پریم چند کی اس کاوش کو سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی نے تقویت اور تحریک دے دی۔ جبکہ سجاد حیدر یلدرم نے رومانیت کو افسانے میں روشناس کرایا اور حسن و عشق کے معاملے سے زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ ساتھ نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش، ال احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی نے اُردو افسانے میں رومانیت کے رجحان کو فروغ دیا، یوں رومان پسندی نے ایک رجحان کے طور پر حقیقت پسندی کے متوازی اُردو افسانے کی پرداخت میں اہم کردار کی حیثیت اختیار کرلی۔

افسانے میں رومانوی رجحان کی فراوانی کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن اظہار رائے کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

> "رومانیت نے ہر جذبہ کو اس کی انتہائی شکل میں پسند کیا۔ قوت و حیات کے مجسمے تراشے، انہیں تابندگی اور تابناکی کے پرچم عطا کیے۔ کبھی انسانِ کامل کے خواب دیکھے تو کبھی مافوق البشر کی تصویر سے اپنے آئینہ خانے سجائے۔

کبھی مشیت کے آگے مجبور انسان کی افسردگی اور کرب کو اختیار کیا۔ کبھی
حسن اور سینٹ اگنز کی شام کے تقدس میں کھو گئے۔"(۱)

ابتداء میں اُردو افسانے میں موضوعات کی سطح، حسن و عشق، حب الوطنی، جدوجہد آزادی، دیہی اور قصباتی زندگی اور ان کے مسائل نظر آتے تھے، لیکن "انگارے" کی اشاعت کے ساتھ ہی اُردو افسانے کے موضوع نے پلٹا کھایا اور ایک نئی جہت وجود میں آئی۔ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی شعور کو، اظہار کو نئی زبان دی، بے باکی اور حقیقت پسندی کو نیا رخ دیا۔ یوں ترقی پسند تحریک کی صورت نمودار ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب کی بساط پلٹ دی اور دیگر اصناف کی طرح افسانے پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ پریم چند کی حقیقت نگاری کو نئے زاویے اور پہلو میسر آئے اور اب زندگی کی حقیقی ترجمانی میں مقصدیت کے رنگ بھرے جانے لگے۔ اُردو افسانے کے اس دور کو زیریں دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں افسانے لکھنے کا رجحان بڑھا اور کثیر افسانوی ادب لکھا جانے لگا۔

اس عہد کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، اختر اورنپوری، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری، شکیلہ اختر، محمد حسن عسکری، احمد علی، رفیہ سجاد ظہیر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، شوکت صدیقی اور دیگر اہم افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ اُردو افسانے کے کارواں میں شامل ہو گیا۔ انسانی زندگی میں شامل ہونے والے نئے مسائل تنازعات، خارجی عناصر، انقلابات، حب الوطنی، قومی یکجہتی، اجتماعیت، مزدوروں، کسانوں اور پسماندہ طبقات کے مسائل، ان کے تنازعات اور مسائل، محبت، نفرت کے جذبات جیسے منفرد رنگ افسانے کی موضوعات کا حصہ بنے۔ اس عہد میں افسانے کی تکنیک کے شعبے میں تغیر اور استحکام آیا اور فن کی نئی راہیں متعین ہو چکی تھیں۔ انور سدید ترقی پسند تحریک کو طوفانی تحریک قرار دیتے ہیں اور اس کا جائزہ لیتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

"ترقی پسند تحریک اُردو ادب کی ایک طوفانی تحریک تھی۔ اس تحریک نے نوجوان طبقے کو بالخصوص اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ اس دور میں جتنے نئے افسانہ نگار سامنے آئے وہ کسی نہ کسی انداز میں ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ان افسانہ نگاروں میں سے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اختر انصاری، سہیل عظیم آبادی،

خواجہ احمد عباس ، معنت سنگھ صدیقہ بیگم پہو ہاروی ، مسعود شاہد ، اختر اورنپوری، دیوندر ستھیار تھی، رامانند ساگر، پریم ناتھ در وغیرہ چند ایسے نام ہیں جنہوں نے اُردو افسانے کو معاشی اور معاشرتی تضادات سے پیدا ہونے والے حقائق سے آشنا کیا۔ دوسری طرف افسانہ نگاروں کی ایک ایسی جماعت بھی منظر عام پر آئی۔ جس نے انسان کے داخل میں آباد کائنات کا کھوج لگایا اور جنسی جذبے کو ایک فعال قوت کے طور پر پیش کیا۔ ان افسانہ نگاروں نے فطرت کے ایک نادر دریافت برا عظم کو دریافت کیا۔ اور سگمنڈ فرائیڈ کی جنسی اور نفسیاتی دریافتوں کو اُردو افسانے میں اہم موضوعات کی حیثیت دے دی۔ ان افسانہ نگاروں میں ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری، شیر محمد اختر، عزیز احمد ، شمس آغا ، قدرت اللہ شہاب اور پر تھوی ناتھ شرما کو اہمیت حاصل ہے۔"(۲)

اس عہد میں تخلیقی افسانہ نگاروں کی بڑی تعداد پہلی بار منظر عام پر آئی ۔ اُردو افسانہ نگاروں نے معیاری افسانے لکھے اور اُردو افسانے کا دامن وسیع کر دیا، اس عہد کے شاہکار تخلیقات میں ، میلہ گھومنی ، الاؤ، گرجن کی شام ، کالو بھنگی ، ہتک ، نیا قانون ، گرہن ، صرف ایک سگریٹ ، چوتھی کا جوڑ ، روپیہ آنہ پائی ، بچھو پھوپھی ، آخری کوشش ، آنندی ، بابا نور ، لو ایک قصہ سنو ، انوکھی مسکراہٹ ، ڈائن ، آیا اور دوسرے افسانے عمدہ نمونہ ہیں۔

برصغیر میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد جو حالات و واقعات رونما ہوئے وہ کسی ہولناک خواب سے کم نہ تھے۔ ملک گیر سطح پر خوفناک تصادم برپا ہوا اور انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ قافلہ در قافلہ لوگ آرام و سکون اور پناہ کی تلاش میں جانکلے۔ قتل وغارت ، لوٹ مار کا بازار گرم تھا، زندگی بری طرح متاثر ہوئی ، سماجی مسائل میں ایک خاص تغیر رونما ہوا، ادب نے زندگی کے ان تغیر پذیر رنگوں کو نئے انداز میں لفظوں کا جامہ پہنایا، دیگر اصناف کی طرح افسانے میں بھی اس کے رنگ امڈ آئے۔ اُردو افسانے پر تقسیم ہند کے اثرات انتہائی گہرے رنگ میں وقوع پذیر ہوئے۔

فسادات ہجرت ، پناہ گزین کیمپوں کی صورت حال ، معاشی اور سماجی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو افسانے نے موضوعاتی طور پر قبول کیا ، اور اُردو ادب کو چند شاہکار افسانے ملے ، ٹوبہ ٹیک سنگھ ، کھول دو ،

موذیل، ٹھنڈا گوشت، پشاور ایکسپریس، جانور، ہم وحشی ہیں، لاجونتی، شکر گزار آنکھیں، پرمیشر سنگھ، یاخدا، سردار جی، گڈریا، جلاوطن، ایک شہری پاکستان کا، ایسے افسانے ہیں جسے اُردو کا بیش قیمت سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد کے افسانے کے عہد کا جائزہ لیتے ہوئے انور سدید بیان کرتے ہیں کہ:

"برصغیر کی آزادی کے بعد اُردو افسانے میں دو واضح کروٹیں رونما ہوئیں۔ آزادی کے فوراً بعد آبادیوں کے تبادلے سے پیدا ہونے والے مسائل نے اُردو افسانے میں ایک اہم موضوع کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ اُردو افسانے نے اب جو نئی کروٹ بدلی اس کے مطابق کردار کو اہمیت حاصل ہوئی۔ فسادات کے گھمسان سے اُبھرنے والے بیشتر کرداروں کا دامن اگرچہ انسانی خون سے آلودہ تھا۔ لیکن سطحی واقعات کے پس پردہ بلند تر انسانیت کو ابھارنے اور شر کے داخل سے خیر کا زاویہ تلاش کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ اس دور میں جن افسانہ نگاروں نے چند زندہ رہنے والے کردار تخلیق کیے۔ ان میں ابو سعید قریشی، اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب، آغا بابر، میرزا ادیب، رام لعل اور رحمٰن مذنب کو اہمیت حاصل ہے۔ بلاشبہ آزادی برصغیر کے باشندوں کا ایک دیرینہ خواب تھی۔ لیکن آزادی کے ساتھ قتل وغارت گری کا طوفان بھی امنڈ آیا تھا اور انسان کے داخل سے اچانک حیوان نکل کر سطح پر آگیا تھا۔ ادیب نے ان افسانوں کو جمع کرنے کی سعی کی جو ہندوستان سے پاکستان آنے والی شاہراہ کے دونوں کناروں پر بکھرے پڑے تھے۔"(۳)

۱۹۴۷ء تک مختصر افسانہ دیگر اصناف پر چھایا ہوا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد نئے مسائل نے موضوعات کو وسعت دی۔ تقسیم ہند کے منفی رد عمل کو دور کرنے کے لیے افسانہ نگاروں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ افسانے کے ذریعے انسانیت کے احترام کا سبق زیادہ ملتا ہے۔ اس عہد کے سبھی افسانہ نگاروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن تین نام میری رائے میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ "ہم وحشی ہیں" اور خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا مجموعہ "میں کون ہوں"، سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اس عہد کے افسانوی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، مہندر ناتھ، بلونت سنگھ، عصمت چغتائی کے علاوہ قراۃ العین حیدر، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رام لعل، صادق حسین، انور عظیم، قاضی عبد الستار، اقبال متین اور واجدہ تبسم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان بلند پایہ افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگاروں کی فہرست بھی طویل ہے۔ فسادات، قتل و غارت گری اور سسکتی تہذیب کے اُردو افسانے پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ آرام و سکون کی پاداش میں دُکھ درد جھیلنے والے جب وطن میں آباد ہوئے تو نااُمیدی اور یاست کے بادلوں نے آن گھیر لیا اور زندگی کے نئے مسائل سے دوچار ہو گئے۔ اب افسانہ نگاروں کے موضوعات نے پلٹا کھایا، نئی مملکت کے مسائل، خوابوں کے ٹوٹنے کا المیہ اور لوٹ کھسوٹ کے دور کا آغاز ہوا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کی نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے افسانے کے فن و تکنیک میں تبدیلی کی اور اب مختصر افسانہ، علامتی افسانہ یا استعاراتی افسانہ بن گیا۔ شعور کی تکنیک کو بھی اپنایا جانے لگا اور موضوعات میں خارجی مناظر نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ ڈاکٹر رشید امجد ساٹھ کی دہائی کے افسانے کو باطنی مسائل، شناختی بحران کا جزو، اسلوبیاتی تبدیلی، علامت و تجرید کا زمانہ قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> "ترقی پسند افسانہ نگاروں کا سارا زور خارجیت اور حقیقت نگاری پر صرف ہوا۔ ساٹھ کی دہائی میں اُس حقیقت نگاری اور بیانیہ کا تصور بدل گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ معاشرے میں ہیرو اور واضح نصب العین موجود نہ تھا۔ اور ہیرو کی غیر موجودگی میں ٹھوس کردار کی بجائے سایہ سایہ کردار وجود میں آئے۔ ساٹھ کی دہائی کے یہی موضوعات ہیں یعنی داخلیت، فردیت، غیر وابستگی، دوسری ذات کی تلاش، شناخت کا بحران۔ ساٹھ کی دہائی میں علامتی افسانے کا آغاز اچانک نہیں ہو گیا۔ اس سے پہلے منٹو کا پھندنے آچکا تھا۔ کرشن چندر، عزیز احمد اور کچھ دوسرے سینئر لکھنے والوں کے یہاں بھی تبدیلی کا احساس جنم لے رہا تھا۔ منٹو کی موت کو اگر ایک عہد کا خاتمہ کہا جائے تو اب نئے عہد کی بنیادیں سوکھی جا رہی تھیں۔ "استانزے" اور "ماخذ" کے دیباچوں میں نئی لسانی تشکیلات کی بات چل نکلی۔ نئے لکھنے والے اس سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس میں کچھ سینئر لکھنے والوں کا نئے لوگوں

کے ساتھ رویہ بھی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر تحریک کے آخری دور کی طرح ترقی پسند تحریک بھی جمود کا شکار ہونے لگی تھی۔ بیانیہ، حقیقت نگاری اور موضوعات کی یکسانیت نے خارج کو اتنی اہمیت دے دی تھی کہ باطنی دنیا گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا ردعمل بھی اتنا ہی شدید ہوا یعنی ایک تو غیر وابستگی کا اعلان اور دوسرے خارج کے برعکس تمام تر توجہ باطنی عوامی کی طرف یہ دونوں انتہاء تھیں بعد میں اس میں وہ معتدل اور متوازن پیدا ہو جو صحیح معنوں میں نئے افسانے کی بنیاد ہے۔"(۴)

ساٹھ کی دہائی ایک بے یقینی کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی حوالے سے الجھن تھی۔ پاکستانی افسانے نے اس دور میں سیاسی پس منظر کو اپنے موضوع کا حصہ بنایا اور غلامی انداز کے ذریعے سیاسی جبر کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں اجتماعیت نے فرد کی انفرادیت اور فردیت کو ایسی کاری ضرب لگائی کہ انسان اپنے خارج سے باطن کی طرف ایک ایسے سفر کی ابتدا ہوئی جس نے اجتماعیت کے ماحول میں دم توڑتی ہوئی فردیت کو بحال کرنے کا کام کیا۔ زندگی کے مسائل میں پیدا ہونے والے تغیر کو لوگ محسوس کر رہے تھے۔ اُردو افسانے میں ایک بالکل نئے رجحان نے کروٹ لینی شروع کی۔ یہ رجحان جدیدیت کے نام سے موسوم ہو گیا۔ جس نے روایت سے ہٹ کر اُردو افسانے کے بیانیہ کو پس پشت ڈال کر ایسے افسانے پر زور دیا جس میں سب سے زیادہ توجہ ذات کے مسائل اور وجودیت پر تھی۔ اس نسل کے افسانہ نگاروں نے علامتی اور تجریدی افسانوی منظر نامے پر ایک بالکل نئی تحریر کے نشان ثبت کیے۔ علامت نگاری، تجرید یا تمثیل کا افسانے میں استعمال اتنا آسان نہ تھا۔ یہ ہر کس و ناکس سے لکھنا تو آسان تھا لیکن سمجھنا مشکل تھا، قاری اس اسلوب سے اکتاہٹ کا شکار ہو گیا۔ ایک نہایت معنی خیز علامت ایک معمولی فنکار کے ہاتھوں نہ صرف منہ چڑانے لگی ہے بلکہ مہمل بن کر رہ جاتی ہے۔ گوپی چند نارنگ اس پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"غور طلب ہے کہ وہ افسانہ نگار جن کے تجربے کی شدت یا احساس و شعور کی پیچیدگی اس کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ تو علامتی کہانی لکھیں گے ہی ورنہ کیا ضروری ہے کہ وہ افسانہ نگار بھی جو سیدھی سادھی کہانی لکھنے پر بھی قادر نہیں، وہ بھی

علامتی کہانی کے چکر میں ایسی تحریروں کے انبار لگا دیں جو کھینچ تان کر بھی نہ
کہانی کہی جا سکتی ہیں اور نہ انشائیہ اور نہ کچھ اور۔۔۔"(۵)

جدیدیت میں شامل رجحان کے منفی رویوں، گم نام علامتوں، استعاروں، تاریخی اور فلسفہ کے عناصر نے افسانے میں گنجلک کی کیفیت پیدا کر دی، قاری کے دلچسپی کے عناصر اور ترسیل کے مسائل نے اُردو افسانہ اور قاری کے درمیان فاصلے بڑھا دیے۔ ابھی جمود، اکتاہٹ، بے زاری اور مایوسی کا وقفہ طویل نہ ہوا تھا۔ نئی نسل نے افسانے کی حالت زار دیکھی اور ہوش مندی اور دانش مندی کا مظاہرہ کیا اور جدیدیت کی ضرورت سے زیادہ علامتیت، مہملت، لایعنیت، ذات پرستی اور یگانگت سے انحراف کیا اور نت نئے مسائل کا نئے انداز سے اظہار کرنے کا نیا رویہ افسانے میں اپنایا جس میں سماجی سروکار، بیانیہ کی واپسی، کہانی اور قاری سے نئے رشتے استوار کرنے اور تہذیبی جڑوں سے جڑنے کا شعور بھی تھا۔ ڈاکٹر رشید امجد ساٹھ کی دہائی کے بعد ستر کی دہائی تک بدلتے مناظر کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ:

"ستر کی دہائی میں خارجی منظر نامہ بدل گیا۔ ۱۹۶۸ء کی تحریک نے اجتماعیت کے تصور کو پھر تازہ کر دیا۔ اسلوب اور فن کی بحثیں نئے انداز سے شروع ہو گئیں اور نئی اصطلاح "نو ترقی پسندی" وجود میں آگئی۔ ستر کی دہائی کے افسانے میں شناخت کا مسئلہ تو موجود ہے۔ لیکن اب اس میں وجودی اثرات بھی شامل ہو گئے تھے۔ فرد کی جگہ اجتماعیت نے لے لی تھی۔ لیکن گمشدگی کا احساس اب بھی موجود تھا۔ یہ گمشدگی کی لاشعوری احساس کا نتیجہ تھی۔ اس زمانے میں عربی، عجمی روایت کی طرف واپسی اور زمینی تحریک کی باتیں بھی زور و شور سے ہوئیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے ان میں ایک رنگ بھر دیا اور پہلی بار پاکستانی ادب میں زمین کی اہمیت کا احساس اُجاگر ہوا۔ اسے پاکستانی ادب کا آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ محمد حسن عسکری نے پاکستانی ادب کی بات پہلے کر دی تھی۔ اس لیے اسے مناسب پذیرائی نہ مل سکی لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ نے زمین اور ادبی قومیت کے احساس کو ٹھوس دلیل فراہم کی۔ یہ نو ترقی پسند کے آغاز کا زمانہ بھی ہے۔ ایک بار پھر وابستگی کی اصطلاح وجود میں آئی۔ لیکن نئے عنوان کے ساتھ جس میں موضوع اور فن کی وحدت پر زور دیا گیا۔ یوں

یہ وابستگی ترقی پسند تحریک کی وابستگی سے مختلف تھی۔ اس نو ترقی پسندی میں
عام آدمی سے وابستگی کے ساتھ فنی جمالیات کو بھی اہمیت دی گئی۔"(۶)

اسی کی دہائی میں پاکستان بہت سے سیاسی اور سماجی مسائل میں گھرا رہا، بالخصوص سقوط ڈھاکہ کے سانحہ کے بعد ہجرت کے موضوع کو پھر تقویت ملی جبکہ ۱۹۷۸ء میں سیاسی عدم استحکام سے مارشل لاء کے نفاذ نے مزاحمتی ادب کو جنم دیا۔ یہ دور سیاسی، سماجی سطح پر درد، کرب، مایوسی اور بے بسی کا دور ہے۔ چنانچہ اس دور میں مزاحمت کے ساتھ ساتھ اضمحلال اور افسردگی کے رویے علامتی انداز میں تقریباً ہر کہانی میں موجود ہیں۔

اس بحث کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ہر دور کے تحت افسانے میں موجود میلانات اور رجحانات درج ذیل ادوار کی صورت میں نمایاں ہیں۔ پہلا دور ۱۹۰۰ء تا ۱۹۳۶ء، دوسرا دور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء، تیسرا دور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء، چوتھا دور ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ء، پانچواں دور ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۰ء ہے۔ اُردو افسانے کے ابتدائی دور میں اصلاح پسندی اور رومانیت کے دو خاص میلانات اُردو افسانے میں غالب نظر آتے ہیں۔ جبکہ دوسرے دور میں افسانہ نگاروں نے سیاسی اور سماجی زندگی سے متعلق اشتراکی نظام سے متاثر ہو کر طبع زاد اور دیگر زبانوں کے تراجم کر کے افسانے تحریر کیے اور "انگارے" کی اشاعت کے بعد اُردو افسانہ حقیقی زندگی کے مسائل سے جڑ گیا۔ افسانہ نگاروں کے ہاں اشتراکیت، جمہوریت، آزادی، غلامی، آمریت، مذہبی اجارہ داری، طبقاتی تنگ نظری، نسلی برتری، معاشی جبریت، نفسیاتی پیچیدگیوں، جنسی، الجھنیں، معاشرتی ناہمواریوں، سبھی زیر بحث آئیں۔ اس دور میں ماحول کی تخصیص کا رجحان عام ہوا، کچھ افسانہ نگاروں کے دیہاتی زندگی کے آثار بھی ملتے ہیں۔ اس دور کے افسانوں میں فطرت کا مشاہدہ گہرا نظر آتا ہے۔ اس دور کے افسانوں کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع نظر آتا ہے۔ فطرت، حسن، جنس، مخصوص رومانی مناظر، طنز و مزاح، نفسیاتی محرکات کا کھوج اور مارکس اور فرائڈ کے تصورات میں رنگے افسانے ملتے ہیں اُردو افسانہ کے تیسرے دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کے دور میں ترقی پسند تحریک موجود تھی اور لکھنے والوں کی مؤثر تعداد بھی موجود تھی۔ لیکن انھوں نے ترقی پسند تحریک کے موضوعات کو بیانیہ حقیقت نگاری میں بھی تنوع دروازے کھول دیے۔ افسانوں میں شہری زندگی کے ساتھ، دیہات کی زبوں حالی اور فسادات کا المیہ، محرومی اور انسانی جانوں کے ضیاع پر دکھ اور غم، ہجرت کے مسائل اور ایک نئی طرح کی تنہائی اور مایوسی کو افسانے کا موضوع بنایا۔ چوتھے دور میں افسانے نے علامتی، تجریدی اور تمثیلی انداز اختیار کیا اور جدیدیت کا رجحان بڑھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے قومیت اور زمین کے تصور کو اُجاگر کیا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک اُردو افسانہ موضوعات کے ساتھ

ساتھ فنی سطح پر بھی تغیر پذیر رہا۔ ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ نے شناخت، وجودیت اور ہجرت کے نئے مسائل سے افسانے کو روشناس کیا جبکہ ۱۹۷۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد مزاحمتی ادب کے فروغ نے اُردو افسانے کے موضوعات کو ایک نئی جہت سے روشناس کیا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۸۰ء تک اُردو افسانہ مختلف فنی اور فکری تحریکات کے زیر اثر رہا جس سے موضوعات کا دائرہ بھی وسیع ہوا اور ہیئت و تکنیک اور اسلوب و اظہار کے نئے نئے تجربوں کی راہیں کھلیں۔

(ii) انور سدید کی افسانہ نگاری، ارتقائی سفر:

انور سدید کی پہچان اُردو ادب میں ایک نقاد کی ہے، لیکن تنقید نگاری کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ پایہ کے افسانہ نگار بھی ہیں۔ اُن کے احوال و آثار اور ادبی زندگی کے مطالعے سے یہ سراغ ملتا ہے کہ انور سدید نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور افسانوی ادب ان کی محبوب صنف رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے تیس سال تک افسانے تحریر کیے۔ بہت کم قارئین اُن کی افسانہ نگاری کے جوہر سے واقف ہیں۔ اس تصنیف میں کل انیس افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ افسانوی ادب میں شغف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مزید افسانے بھی تحریر کیے ہیں۔ جو مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں جن کی دریافت اور یکجا کر کے اشاعت کی جاسکتی ہے۔

انور سدید نے ۱۹۴۴ء کے لگ بھگ افسانوی زندگی کا آغاز کیا۔ افسانوی ادب پر اُن کا مطالعہ گہرا تھا۔ غالب گمان ہے کہ اس وسیع تر مطالعاتی دلچسپی نے اُن کو افسانہ کی تخلیق پر آمادہ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں وزیر آغا سے ملاقات، لاہور میں قیام اور انور گوئندی مرحوم کے ماہ نامہ "کامران" سے وابستگی نے افسانہ نگاری کے فن میں تخلیقی جوہر دکھانے کے لیے فکری تقویت بخشی۔ ذیشان علی میراں انور سدید کے افسانہ نگاری کے ابتداء کے متعلق رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "ڈاکٹر انور سدید کا ماہنامہ "کامران" میں پہلا افسانہ "غم محرومی جاوید" شمارہ نمبر ۱۱ جلد نمبر ۱، اگست ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا، اس کا باقاعدہ اظہار انھوں نے "نوائے وقت" کے کالم میں بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید کی انور گوئندی سے دوستی بس "کامران" تک محدود نہ تھی۔ بل کہ یہ دوستی "کامران" کے علاوہ بھی تھی۔ انور گوئندی کی ایک صاحب زادی "شاہدہ انور" جو چار سال

کی عمر میں ٹانگے کے ایک حادثے میں انتقال کر گئیں ان کی وفات پر انھوں
نے ایک افسانہ "بے بی گڑیا" بھی لکھا تھا۔"(۷)

سجاد نقوی جن کا شمار انور سدید کے قریبی ساتھیوں میں کیا جاتا ہے اور غلام الثقلین نقوی کے بھائی ہیں۔ انور سدید کے افسانہ نگاری کے ابتداء کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر انور سدید کی اولین محبت اور تخلیقی جہت افسانہ نگاری تھی۔ انور سدید
کا پہلا افسانہ " مجبوری" ہفت روزہ چترا، لاہور میں دسمبر ۱۹۴۲ء کو شائع ہوا
اور اس کی مکرر اشاعت "انجام" دہلی میں ہوئی۔"(۸)

ڈاکٹر انور سدید ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۲ء تک مختلف معروف ادبی رسائل سے منسلک رہے۔ جن میں چترا، مشہور، روحِ ادب، کامران، نظام، انجام، اوراق اور ہمایوں شامل ہیں۔

ان رسائل میں انور سدید کے افسانے چھپتے رہے ہیں اور زیادہ تر افسانے قارئین کے دلچسپی اور فرمائش پر بار بار شائع کیے گئے ہیں۔ اُن کی افسانوی مجموعے میں کل انیس افسانے شامل ہیں۔ جن میں کچی مٹی کا بند، سجدہ سہو، غم محرومی جاوید، رباب کے تار، لاوارث، سینہ چاک، پچھتاوا، باسی پھول، خودکشی سے پہلے، ستاروں کے شکار میں، جب پردہ ہٹا، ابھی امتحان اور بھی ہیں، نیلی رگیں، ستاروں کے موتی، نیل کنٹھ، ڈبڈباتی آنکھیں، دل ناتواں، وکٹوریہ کراس اور شیش محل شامل ہیں۔ انور سدید نے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۴۲ء میں کیا اور ہفت روزہ "چترا" میں اُن کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ لیکن جو افسانہ اُن کی شہرت اور پہچان کا سبب بنا وہ مایوس آنکھیں تھا۔ یہ افسانہ ۱۹۴۶ء میں ماہنامہ "مشہور" دہلی میں شائع ہوا، اس وقت صادق الخیری نے اس افسانے کو معیاری اعلیٰ پایہ اور ایک مقابلے میں اول درجے کا افسانہ قرار دے دیا تھا جو مختلف ادبی رسائل میں متعدد بار شائع ہوتا رہا ہے۔ انور سدید کے مختلف جرائد میں شائع افسانوں سے اُن کے افسانوں کی ترتیب کچھ اس طرح معلوم ہوتی ہے۔ "مجبوری" ہفت روزہ چترا، دہلی ۱۹۴۲ء، "ڈبڈباتی آنکھیں" ہفت روزہ "نظام" ۱۴ اپریل ۱۹۴۶ء، "مایوس آنکھیں"، ماہنامہ "مشہور" دہلی جولائی ۱۹۴۶ء، "وکٹوریہ کراس" ہفت روزہ "نظام" نومبر ۱۹۴۶ء، "نیل کنٹھ" ماہنامہ "مشہور" دہلی دسمبر ۱۹۴۶ء، "ستاروں کے موتی"، "چمنستان" دہلی، فروری ۱۹۴۷ء، "نیلی رگیں"، "نیرنگ خیال" لاہور دسمبر ۱۹۴۸ء، "دل ناتواں"، "بیسویں صدی" دہلی، جنوری ۱۹۵۰ء، "ستاروں کے شکار میں"، "ہمایوں" لاہور، جنوری ۱۹۵۰ء، "خودکشی سے پہلے"، "ہمایوں" لاہور فروری، ۱۹۵۰ء، "باسی پھول"، "ہمایوں" لاہور، مئی ۱۹۵۰ء، "ابھی امتحان اور

بھی ہیں "، ہمایوں، لاہور، ستمبر ۱۹۵۰ء "جب پردہ ہٹا"، "ہمایوں" لاہور مارچ ۱۹۵۱ء، " غم محرومی جاوید "، " کامران " لاہور، اگست ۱۹۵۵ء، "پچھتاوا"، "کامران" لاہور، مارچ ۱۹۵۷ء، "رباب کے تار"، "کامران" لاہور ، جون ۱۹۵۸ء، "لاوارث"، "کامران" لاہور، جولائی ۱۹۵۹ء "سینہ چاک" "کامران" لاہور، نومبر ۱۹۵۹ء "سجدہ سہو" "اوراق" لاہور، جنوری ۱۹۶۷ء "کچی مٹی کا بند" "اوراق" لاہور، مارچ ۱۹۶۷ء "شیش محل" "بیسویں صدی" لاہور کو اس زمانی ترتیب سے شائع ہوئے۔

اُن کے کئی افسانے مختلف اوقات میں متعدد بار معروف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے درست زبانی ترتیب کا تعین کرنا مشکل تھا۔ لیکن انور سدید کے افسانوں کی میسر زمانی ترتیب سے ان کی افسانہ نگاری میں فن اور فکر کے ارتقاء اور تحریکی اثرات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

انور سدید نے افسانہ نگاری کا صرف ذائقہ لینے کے لیے اس صنف کا آغاز نہیں کیا بلکہ مسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ افسانہ نگاری کرتے رہے۔ جو یہ تاثر دیتی ہے کہ افسانہ ان کی محبوب صنف رہی ہے۔ اُن کے افسانوں کی صحیح تعداد کی کھوج کا مزید کام کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۲ء تک اُردو ادب کے اہم رسائل و جرائد میں افسانے لکھتے رہے۔ ذوالفقار احسن نے چند معلوم افسانوں کو شائع کیا ہے۔ جب کہ مزید افسانے مختلف رسائل میں دریافت کیے جاسکتے ہیں۔

بیسویں صدی کی پانچویں یا چھٹی دہائی میں افسانہ نگاری کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ چند بڑے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ کم معروف اور نئے افسانہ نگار بھی افسانوی ادب کے میدان میں نظر آتے ہیں۔ جب انور سدید نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو اس وقت تک افسانہ اُردو ادب کی مستحکم صنف کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور مختلف تحریکی اثرات کو قبول کر چکا تھا۔ اس عہد میں معاشرتی اصلاح پسندی، ترقی پسندی، حقیقت نگاری اور رومانیت پسندی کے رجحانات افسانہ نگاری میں نمایاں نظر آرہے تھے۔ انور سدید کے معلوم افسانوں کے سن اشاعت اور موضوعاتی اور اسلوبیاتی مطالعہ سے یہ ادراک کیا جاسکتا ہے کہ انور سدید کا معاصر افسانوی ادب اور تحریکاتی اثرات کے وسیع مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے ہر رجحان کو قبول کیا۔ " انور سدید کے خوابیدہ افسانے " میں شامل انیس افسانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ہاں موضوعات متنوع ہیں۔ اس کتاب میں شامل گیارہ افسانے " کچی مٹی کا بند "، " غم محرومی جاوید "، "رباب کے تار "، " سینہ چاک "، " باسی پھول "، "جب پردہ ہٹا"، " نیلی رگیں "، "ستاروں کے موتی "، " نیل کنٹھ "، " شیش محل " اور "دل ناتواں " رومانیت پسندی اور رومانوی عناصر کے زیر اثر معلوم ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں

تقسیم ہند کے بعد ہجرت کے پس منظر میں دو افسانے "لاوارث" اور "ابھی امتحان اور بھی ہیں" گھریلو مسائل پر دو افسانے "پچھتاوا" اور "خودکشی سے پہلے" معاشرتی رویوں پر مشتمل ایک افسانہ "ستاروں کے شکار میں" دیہاتی زندگی پر ایک افسانہ "ڈبڈباتی آنکھیں" اور طوائف کے موضوع پر دو افسانے "سجدہ سہو" اور وکٹوریہ کراس" شامل ہیں۔

(ب) انور سدید کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ:

انور سدید کے افسانوں میں موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ اُن کی موضوعات کا پس منظر دیہات ہے۔ لیکن اُنہوں نے معاصر ادب کی تحریکوں اور رجحانات کو قبول کیا ہے۔ اور درج ذیل تین موضوعات اُن کے افسانوں میں نمایاں ہے۔

۱۔ رومانویت اور سماجی حقیقت نگاری

۲۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت اور فسادات پر مبنی افسانے

۳۔ معاشرتی مسائل اور دیہات کی پیش کش

(i) ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں میں رومانیت اور سماجی حقیقت نگاری:

انور سدید کی پہچان اُردو ادب میں ایک نقاد کی ہے، لیکن تنقید کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور فن کے جوہر دکھائے۔ انور سدید نے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۴۲ء میں کیا اور اُن کا پہلا افسانہ "مجبوری" ہفت روزہ، چترا، لاہور میں شائع ہوا۔ انور سدید کے خوابیدہ افسانے " میں شامل انیس افسانوں سے اُن کے موضوعات کی وسعت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہیں۔ انور سدید نے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں بہت کم لکھا ہے۔ لیکن اُن کے افسانوں کے موضوعات میں بے پناہ وسعت ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو اُن کے افسانوں میں رومانوی عناصر کی چھاپ نمایاں تھی۔ رومانی ماحول کی منظر کشی اور عکاسی ابتدائی افسانوں کا خاصہ ہے۔ یہ افسانے اس دور کے ہیں، جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاری اپنے عروج پر تھی۔ حقیقت نگاری کے اس دور میں انہوں نے افسانے کے قاری کو رومانیت کی طرف مائل کیا لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ حقیقت نگاری یا ترقی پسند ادب سے وابستہ نہیں تھے بلکہ رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کا امتزاج بھی اس دور کے افسانوں میں ملتا ہے۔ در اصل ان کا مقصد ان مسائل کی نشان دہی تھا۔ جن کی طرف ترقی پسند تحریک لوگوں کو شعور دے رہی تھی۔ ڈاکٹر انور

سدید ترقی پسند تحریک کے فکری پہلو سے وابستہ تو تھے۔ مگر ان کے ہاں ہمیں شدت کا تاثر نہیں ملتا بل کہ وہ ان مسائل کو دیکھتے ہیں اور لفظوں کے پیرائے میں ذریعہ اظہار بناتے ہے۔

جب وہ اُردو افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے تو اس وقت وہ محکمہ انہار میں ملازمت کرتے تھے، اُن کے پیشے سے منسلک واقعات بھی اُن کے افسانوں میں بطور موضوع ملتے ہے۔ "کچی مٹی کا بند" میں انھوں نے اپنے ساتھ بیتے سچے واقعے کو علامتی رنگ کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں رومانویت اور محبت کا گہرا تاثر ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اولین دور کے افسانے "کچی مٹی کا بند"، "غم محرومی جاوید"، "رباب کے تار"، "سینہ چاک"، "باسی پھول"، "جب پردہ ہٹا"، "نیلی رگیں"، "ستاروں کے موتی"، "نیل کنٹھ"، "شیش محل"، اور "دل ناتواں" میں رومانوی عناصر غلب نظر آتے ہیں اور ان کی کہانیاں کلاسیکی انداز اور رومان کا گہرا اثر رکھتی ہیں۔ جس میں سماجی عناصر ایک تحریک کی شکل اختیار کرتے نظر آتے ہے۔ جب کہ ماحول سے بیزاری اور بغاوت کے پہلو واضح دکھائی دیتے ہے۔ "کچی مٹی کا بند" میں انہوں نے رشتوں میں ماں کے اس غصے اور غم کو بھی "کچی مٹی" کہا جو بیٹی کے گھر سے غائب ہو جانے پر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ماں جو پورے گاؤں میں بے عزتی کا نشانہ بن رہی ہوتی ہے۔ بیٹی کے مل جانے پر اس کو سزا دینے والوں کے لیے "کچی مٹی" کا بندھ بن جاتی ہے اور سماج کے سامنے یہ بتاتی ہے کہ میری بیٹی مجھ سے پوچھ کر گئی تھی۔ بیٹی کے لیے ڈھارس اور سماج کے لیے "کچی مٹی" بن جاتی ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ انھوں نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو علامتی انداز سے اُجاگر کیا وہ غلام یا نوکر کی آواز کو "کچی مٹی" کہتے ہیں وہ سیلاب کو روکنے کے لیے جو بند باندھے جاتے ہیں اس کو "کچی مٹی" کہتے ہیں وہ اُٹھتی ہوئی نوجوان زندگی جو نئے جذبے نئے خواب لے کر بیدار ہو رہی ہوتی ہے ان جذبوں کو کچی مٹی سے مماثلت دی۔ وہ پہلی محبت کی پہلی بوندوں کو جب "کچی مٹی" پر پڑے تو جذبوں کی سوندی خوشبو کو بھی کچی مٹی کہتے ہیں۔ یہ علامت معاشرتی اقدار کی وضاحت کرتی ہے۔ جس میں ایک پلکھوندی کی طغیانی اور دوسری طرف رمضان اور فلکو کی محبت کا تذکرہ ہے۔ اس افسانہ کی کہانی اُن کی ذاتی پیشہ وارانہ زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ انھوں نے اس افسانہ میں پیشہ وارانہ زندگی کی ذمہ داریوں اور ناگہانی آفات میں مستعد حالات اور محبت کے سچے جذبے کو کچی مٹی میں گوندکر پیش کیا۔ ایک طرف ناگہانی آفت سے نمٹنے کی فکر اور دوسری طرف رمضان اور فلکو کی محبت میں گرفتار ہو کر گھر سے بھاگ جانا، غیرت و حمیت کے درد اور اذیت ناک لمحوں کی تکلیف اُن کو تذبذب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جسے انھوں نے سماج کے ساتھ جوڑا اور معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ایک طغیانی سے بند ٹوٹنے کا ڈر اور دوسری طرف معاشرتی اقدار کی

پامالی کے خدشے کچی مٹی کا بند سے کیا۔ اُن کے نزدیک معاشرتی اقدار کچی مٹی کا بند ہے۔ جن کے ٹوٹنے سے طغیانی آسکتی ہے۔ "کچی مٹی کا بند" کا شمار بہترین افسانوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اس افسانے میں رمضان، فلکو اور پلکھوندی کے کرداروں کی ایک مثلث بنتی ہے۔ لیکن اس میں ایک اہم کردار اُن کی ذات بھی ہے انہوں نے ایک حقیقی واقع کو علامتی رنگ دے کر دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔ افسانے کا موضوع مشرقی سماج کی جکڑ بندیوں اور سماج سے بغاوت کا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا یہ افسانہ گاؤں کی منظر نگاری کرتے ہوئے مسلسل واحدانیت اور دلچسپی کا دامن تھامے ہوئے رکھتا ہے۔

افسانے میں لفظ مٹی دیہات اور اس کے اقدار کی ترجمانی کرتا ہے، انھوں نے اس افسانے میں بدی کی شکست اور پاک دامنی کی فتح کو انجام ٹھہرایا ہے۔ اس طرح "سجدہ سہو" ایک طوائف تاجی کی کہانی ہے۔ جو گناہ کی زندگی سے اپنا دامن چھڑانا چاہتی ہے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی اسے دوبارہ اس دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔ اس افسانے میں عورت کے فطری رویوں کی طرف بھی واضح اشارہ ملتا ہے کہ عورت ہمیشہ ایک گھر چاہتی ہے اور گھریلو زندگی جس میں ایک مرد کی محبت اور رومانی تسکین کی خواہش ہوتی ہے۔ تاجی کی خواہش تھی کہ وہ طوائف کا دھندا چھوڑ کر کسی سے شادی کرے اور شرافت کی زندگی گزارے۔ تاجی کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی اور وہ اُسی گندگی میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو کر بے بس ہو جاتی ہے۔ "سجدہ سہو" قاری کو ایک بے بس دنیا اور معاشرے کے دوغلے پن سے بھی آشنا کرتا ہے۔ اس افسانے میں کردار نگاری کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ "جیواں" اور "شیدا چرسی" کے کردار امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ "اُس بازار" کے ماحول کو بھی کمال ہنر مندی سے بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کے بیان کا انداز دلچسپ ہے جو قاری پر ایک سحر طاری کر دیتا ہے۔ افسانے کا عنوان "سجدہ سہو" معنی خیز ہے اور معاشرے پر بھرپور طنز ہے۔ افسانہ مجموعی طور پر فکری تحریک کو تقویت دیتا ہے اور سوچنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ انھوں نے اس افسانے میں زندگی کے ایک ایک پرت کو آشکار کیا ہے۔ جب کہ "غم محرومی جاوید" انور سدید کا یہ افسانہ محبت کے لطیف جذبوں کو رعنائی اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ "غم محرومی جاوید" ایک دلکش پریم کہانی ہے جو قاری کو محبتوں کے طلسم میں لے جاتا ہے۔ یہ افسانہ خجی کے پامسٹ چچا کی پیش گوئی پر صادق آتا ہے۔ اس پامسٹ کی پیش گوئی بھی، پیہم مایوسی، مسلسل سوگواری اور شباب کی موت، کی مثلث کے گرد گھومتی ہے۔ دوسری طرف ایک عاشق کے دلی جذبات کا مظہر بھی ہے کہ جو اپنی محبت کو یادوں میں مہکتا محسوس کرتا ہے۔ اس افسانے میں محبت کی چھیڑ چھاڑ اور رومانوی رنگ غالب ہے۔ افسانے کے اس اقتباس میں رومانیت کے رنگ کو ملاحظہ کیجئے۔

"تم نے کہا تھا جب تنہائیوں کی ویران اُداسیاں مجھے ڈسنے لگیں گی اور ماضی کی پُر بہار یادوں کے تیز نشتر میرے دل میں کچوکے لگانے لگیں گے تو میں چاند کی رتھ میں سوار ہو کر ۔۔۔۔۔ چاندنی کی دودھیا لباس پہنے ۔۔۔۔۔ سر پر کرنوں کا نقرئی تاج اور پاؤں میں ستاروں کی جھانجھنیں باندھ کر ۔۔۔۔۔ تمہیں ملنے آؤں گی اور میں نے کہا تھا۔ یہ محض تصور کا واہمہ ہے میں تو اس مادی دنیا میں سنجوگ کا قائل ہوں۔ زندگی بھر تم نے مجھے وعدوں کے تاج محل دکھائے ہیں۔ مر جانے کے بعد بھلا کون کسی کو یاد کرتا ہے اور جنت کے دل ربا باغوں سے کون کسی کو ملنے کے لیے اس دکھیا دیس میں آتا ہے!۔ تم نے میرے ہونٹوں پر اپنی شمعی انگلیاں رکھ دیں ۔ آنکھوں کے اداس گوشوں سے ایک التجاء ٹپک پڑی ۔ اور مجھے تمہارے کہے پر یقین کرنا پڑا۔"(۹)

رباب کی تار بھی رُشدی اور رحمان کی پریم کہانی ہے۔ رُشدی جو رحمان کی شرارتوں سے تنگ اور چڑچڑاتی تھی۔ مصور انکل اور بیگم فیروز کی خواہش پر جب اُسے رحمان سے شادی کا کہا جاتا ہے۔ تو وہ رحمان سے شروع سے بے زار تھی اور مصور چچا کی اس بات پر کہ اس کی شادی رحمان سے کرادی جائے پریشان نظر آتی ہے۔ جس کا علم رحمان، بیگم فیروز اور مصور چچا عزیز کو ہو جاتا ہے۔ رُشدے کو راضی کرنے کے لیے وہ ایک ترکیب سوجھتے ہیں۔ رُشدی کو جیلس کرنے کے لیے سوئٹزرلینڈ سے آئی سہیلی رفعت کو گھر بلاتے ہیں۔ رحمان اور رفعت رُشدی کو احساس دلانے کے لیے ڈرامائی محبت کی کہانی گھڑتے ہیں۔ جس کا علم رُشدی کو ہو جاتا ہے وہ حقیقت سمجھ کر اس رقابت سے جیلس ہوتی ہے اور اس کے دل میں رحمان کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جب مصور چچا اُس سے رحمان کے ساتھ شادی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، تو شرماتے ہوئے ہاں میں جواب دے دیتی ہے اور رحمان کے ساتھ اس کی شادی کرادی جاتی ہے۔ شادی کے بعد رحمان رُشدی کو مکمل حقیقت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ کہانی کا کلائیمکس کچھ اس طرح ہے:

"بہار کی ایک حسین شام کو رحمان اور میں بائیں باغ میں ٹہل رہے تھے۔ رُشدی تمہیں تو میری شرارتیں اچھی نہیں لگتی تھیں ۔ پھر میرے ساتھ شادی کے لیے کیسے راضی ہو گئیں تم! رحمان نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا اور شرمانے لگی۔ مصور چچا یہ جانتے تھے، رحمان نے پھر کہا" کہ تم میرے ساتھ

شادی پر رضامند نہ ہو گی اس لیے تمہیں منوانے کے لیے انھوں نے ایک ترکیب کی۔ جانتی ہو کیا"۔ میں چونکی "کیا ترکیب" میں نے مجسم سوال بنتے ہوئے اُن کی طرف دیکھا۔ "تمہیں وہ رات یاد ہے جب تم دریچے میں کھڑی تھیں اور رفعت اور میں نیچے باغ میں باتیں کر رہے تھے"۔ ہاں۔ خوب یاد ہے۔ اور میں نے اسی رقابت سے جل کر مصور عزیز کی بات مان لی۔ رحمان ہنس پڑے "رُشدی ہم تم ایک رباب کے دو تار ہیں"۔ "کیوں" اور وہ پھر ہنسنے لگے اور میں نے شرما کر منہ پھیر لیا۔" (۱۰)

رباب کے تار میں محبت کے جذبے کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا۔ جس میں تہذیبی رویوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ غم محرومی جاوید، رباب کے تار، سینہ چاک، باسی پھول، نیل کنٹھ، ستاروں کے شکار میں اور پچھتاوا میں محبت کی چھیڑ چھاڑ میں پروان چڑھنے والی پیار، محبت کی کہانیاں ہیں۔ ان تمام افسانوں میں اُن کا موضوع محبت ہے لیکن محبت سے جڑے جذبات اور رویوں کو ہر افسانے میں منفرد اور الگ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ پچھتاوا میں انور سدید نوشین اور اعجاز کی محبت کی کہانی کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ نوشین اور اعجاز دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں۔ روزمرہ معمولات کی مصروفیات اِن دونوں کے بیچ خلیج پیدا کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے شکوک و شبہات اور بے یقینی کی کیفیت جنم لیتی ہے۔ نوشین کا بے یقینی کا رویہ جو کہ اعجاز کے تھکن اور دوست کے لیے مکان کے تلاش کی فکر خواب میں بھی بے سکون رکھتی ہے اور خواب میں اُس کی بیوی سے مسئلے کے حل کے لیے بڑبڑاتے ہوئے صفیہ، صفیہ کا تکیہ کلام کرتا ہے۔ نوشین جو کہ عرصہ سے اُن کی مصروفیات کی وجہ سے بے یقینی کا شکار رہتی ہے۔ شک کرنا شروع کر دیتی ہے اور عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اعجاز کے معمولات زندگی معمول پر آتے ہیں۔ تو وہ نوشین سے سب معاملات کا اظہار کرتا ہے۔ یوں نوشین کو محبت کا احساس ہوتا ہے اور اپنے رویے پر شرمندگی اور پچھتاوے کا اظہار کرتی ہے۔ افسانہ "پچھتاوا" بھی اپنے اندر رومانی انداز لیے ہوئے ہے۔ جبکہ "دل ناتواں" میں اشوک کی لاغرضی اور ارملا کی بے بسی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ کہانی کا منطقی عروج اشوک اور ارملا کی عنبریں زلفوں کی خوشبوؤں کے احساس پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ رومانویت ایک خاص دائرے کے اندر مفید ہے۔ جو اس دائرے کی حدوں کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کرتی ہے۔

انور سدید نے اپنے افسانوں میں گاؤں کی معصومیت اور خالصیت کو بر قرار رکھتا ہے۔ "نیلی رگیں" میں ڈاک گھر کا بابو اور گوراں کی محبت ہر دور میں کسی نہ کسی قائم علی جیسی محبت کے ازلی دشمن ہر سماج کا حصہ رہے ہیں۔ "ستاروں کے شکار میں" میں ایک نوجوان اور کوشل نامی لڑکی کی محبت کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن مادیت پرستی دونوں کی محبت میں خلیج کا سبب بنتی ہے۔ لڑکا دِق کا مریض ہوتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اگر کوشل کو اس بات کا علم ہو گیا تو وہ اُسے چھوڑ دے گی کیوں کہ اس کا والد بڑا جاگیر دار اور اعلیٰ حکومتی عہدیدار ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے راک فیلر شخص ڈھونڈ رہا تھا۔ لڑکے کا تعلق جاگیر دار طبقے سے تھا اور تعلیمی قابلیت بھی اچھی تھی۔ حکومت وقت نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا، لیکن دِق کی بیماری نے متوقع مسرتوں کا ارمان کر دیا۔ اس افسانے میں محبت کے ساتھ ساتھ مادیت پرستی کے عمومی رویوں کو دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کے آخر میں کہانی کا اختتام دل پذیر اسلوب میں کیا گیا ہے۔

> "اس بات کو ایک سال ہو چکا ہے۔ میں موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ہوں، اور ان لمحوں کو یاد کر رہا ہوں۔ جب میں نے موہوم مستقبل کی امیدیں کہکشاں کے راستے پر ناچنے والے رخشندہ ستاروں کو شکار کرنا چاہا اور اسی میں۔۔۔۔۔"(۱۱)

اس افسانے میں معاشرتی طنز بھی موجود ہے، بڑے امرا جب اپنی بیٹی کی شادی کروانا چاہتے ہیں تو بیٹی کو خود مواقع دیتے ہیں کہ اپنی مرضی کا شوہر ڈھونڈے۔ رائے بہادر گپتا رام جس کو سرکار کی طرف سے انعام کے طور پر خطاب ملا تھا ایک پارٹی رکھتا ہے۔ جس میں بڑے بڑے امیر اور پڑھے لکھے لوگوں کو دعوت پر بلایا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی بیٹی اپنی پسند کا شوہر منتخب کر سکے اور "میں" جو، اس افسانے کا ہیرو ہے وہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے اور شلپا جو رائے بہادر کی بیٹی ہے۔ افسانے کے ہیرو کو پسند کرتی ہے۔ مگر کچھ دن بعد شلپا کو پتہ چلتا ہے کہ ہیرو تپ دق کا مریض ہے تو شلپا اُسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ افسانے میں اس طبقے کے رویے پر اتنا گہرا طنز ملتا ہے کہ قاری آس پاس نظر دوڑاتا ہے کہ کہیں ایسا ہو رہا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے گا کہ واقعی آج کل کی محبت دکھاوے کی ہے اور اگر کسی امیر کی محبت ہو بھی تو اپنے معیار کے مطابق ہو گی۔ اُن کے لیے سب سے ضروری چیز صرف اور صرف جائیداد ہوتی ہے۔ آج سے تقریباً ۲۵ سال پہلے جن واقعات کی نشان دہی کی گئی تھی اب بھی ویسا ہو رہا ہے۔ جب کہ "نیلی رگیں" میں محبت کی کہانی کے ذیل میں عصری صورت حال، نو

آبادیاتی ہندوستان میں انگریز حاکموں کے عوام کے ساتھ رویے، درمیانے طبقے کے مسائل، شہری اور دیہاتی زندگی کے امتزاج اور گاؤں کی رسومات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے عالمی سیاسی اور سماجی منظر نامے کو اگر دیکھا جائے تو اس دور میں متعدد جنگیں لڑی گئیں۔ ان میں جنگِ عظیم اوّل، جنگِ عظیم دوم، جنگِ بلقان، جاپان اور روس کی جنگ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر رہے۔ برصغیر چوں کہ اس دور میں برطانیہ کی نو آبادیاتی تھا۔ اس لیے یہاں کی عوام نے ان جنگوں سے براہ راست اثرات قبول کیے۔ ماحول کی تبدیلی، اقتصادی بدحالی، سیاسی انتشار اور معصوم جانوں کے ضیاع سے لے کر نفسیاتی عدم توازن کی کیفیات تک ریکارڈ کی گئی ہیں۔ بیسویں صدی میں لڑی جانے والی ان جنگوں کا خمیازہ ہماری نسلیں آج تک بھگت رہی ہیں۔ ایک احساس اور باشعور ذہن اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی صورت حال سے کس طرح بے خبر رہ سکتا ہے۔ انور سدید نے بھی اس افسانے میں نو آبادیاتی عہد میں لڑی جانے والی ان جنگوں کے اثرات کو موضوع بنایا ہے۔ افسانہ کا بیشتر حصہ دیہاتی سماج کو منعکس کرتا دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر برصغیر کا وہ سماج جو بیسویں صدی کے آغاز میں جنگی صورت حال کے اثرات قبول کر رہا تھا۔ اس افسانے میں شہری اور دیہاتی زندگی کا موازنہ کرنے کی بھی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ افسانے کی بیش تر فضا، دیہاتی زندگی کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہے، چوں کہ افسانے کے مرکزی کردار کا تعلق لاہور شہر سے ہے۔ اسی لیے بڑے شہر کی زندگی اور وہاں کا تمدن افسانے کی کہانی کا حصہ بنا ہے۔ شہر تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں، جب کہ گاؤں کی آبادی میں کمی آتی جا رہی ہے۔ سہولیات کے لیے گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت بھی کہانی کا موضوع ہے۔

(ii) ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں میں تقسیم ہند، ہجرت اور فسادات کے عناصر:

اُن کے ہاں دیگر ادیبوں کے طرح فسادات کے متعلق موضوعات بھی ملتے ہیں جس میں انہوں نے انسانی المیے کا مناظر کو ایک الگ روپ میں پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند پر بے شمار افسانے لکھے گئے، بالخصوص ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ہجرت کے واقعات سے متاثر ہو کر تقسیم ملک کے بعد رونما ہونے والے قیامت خیز فسادات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، منٹو کے افسانے، سیاہ حاشیے، ٹھنڈا گوشت، شریفن، کھول دو، گورکھ سنگھ کی وصیت، موذیل اور ٹوبہ ٹیک سنگھ ہجرت کے موضوع پر نمائندہ افسانے ہیں۔ اس کے علاوہ کرشن چندر "ہم وحشی ہیں"، حیات اللہ انصاری کے "ماں بیٹا"، "شکر گزار آنکھیں"، احمد ندیم قاسمی کا "پرمیشور سنگھ"،

عصمت چغتائی کا "جڑیں"، خواجہ احمد عباس کے "سردار جی، میں کون ہوں اور انتقام"، راجندر سنگھ بیدی کا "لاجونتی"، عزیز احمد کا "کالی رات"، سہیل عظیم آبادی کا " اندھیارے میں ایک کرن"، خدیجہ مستور کے "ٹامک ٹوٹے، مینوے چلا بابا"، ہاجرہ مسرور کے " امت مرحوم، بڑے انسان بنے بیٹھے ہو"، ممتاز حسین کا "سورج سنگھ"، صدیقہ کا "گوتم کی سرزمین" وغیرہ کامیاب افسانے ہیں۔ جن میں انھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

انور سدید نے بھی فسادات کو اپنے افسانے کے فن کا موضوع بنایا۔ انور سدید ہمدرد اور انسانیت سے محبت کرنے والے حساس ادیب تھے۔ ہجرت کے موضوع پر اُن کے دو افسانے ہیں۔ "لاوارث" اور "ابھی امتحان اور بھی ہیں"۔ فسادات کی قیامت خیزی سے انور سدید بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ جنہیں وہ نئی صناعی کے ساتھ افسانے کے سانچے میں ڈھال کے لے آئے۔ اُن کے افسانے "لاوارث" کا موضوع تقسیم کے بعد درپیش آنے ولی ہجرت ہے۔ ہجرت کرنے والی لڑکی اور اُسے بچانے والا بوڑھا اس کے مرکزی کردار ہیں انہی مرکزی کرداروں سے متعلق پھر ایک ثانوی کردار، لڑکی کے کردار کی نسبت سے اُس کے شوہر کا کردار اور بوڑھے کے کردار کی نسبت سے ایک نوجوان کا کردار سامنے آتا ہے۔ انہوں نے ہجرت کے عمل سے دوچار ایک لڑکی اپنے عزیز و اقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ سفر پر نکلتی ہے۔ مگر راستے میں حملہ آوروں کے حملہ کی وجہ سے اپنوں سے بچھڑ جاتی ہے۔ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگتی ہے اور ایک درخت کی اوٹ میں آنکھیں موندھے کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہاں ایک دم سے اُس کی کلائی سخت انگلیوں والے "کریہہ صورت" بوڑھے کی گرفت میں ہوتی ہے۔ وہ بوڑھے کے ساتھ چل پڑتی ہے۔ لڑکی جس ملک کی طرف ہجرت کرنا چاہتی ہے، اسی ملک میں فسادات کے دوران یہ بوڑھا اپنی عزت و ناموس کی خاطر اپنی جوان بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے کے بعد خودکشی سے منع کرتا ہے اور اس ملک آنے کا کہتا ہے۔ بوڑھا اس لڑکی کو اسی لڑکی کے گاؤں کے ایک گھر میں لے آتا ہے۔ گھر میں پہنچ کر لڑکی کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بوڑھا تو بہت نیک مزاج ہے، جو اُسے ہر طرف پھیلی درندگی سے بچا کر گھر میں پناہ دینے کی خاطر لایا ہے۔ یوں ہی دن رات گزرتے جاتے ہیں اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ طویل مدت کے بعد وہ سرکاری طور پر اُس ملک کی طرف چل پڑتی ہے، جس طرف کو اُس کے اپنے گئے تھے۔ وہاں کیمپ کا انچارج لڑکی کا شوہر ہوتا ہے۔ وہ اس کی گود میں بچے کو دیکھ کر اس کے کردار پر شک کرتا ہے اور اپنانے کی بجائے لاوارث لڑکیوں کے کیمپ کی طرف بھیج دیتا ہے۔ افسانے کے

ابتدائی اقتباس کے جملوں سے افسانے کے موضوع اور ہجرت کے ایک المیہ واقع کی تصویر یوں نمایاں ہوتی ہے۔

"تم سے بچھڑ کر میری آنسو برساتی ہوئی آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے تھے اور یہ احساس بھی مردہ ہو گیا تھا کہ زندگی میں پھر کبھی تمہیں مل سکوں گی مگر میرے پیروں کا تحرک مجھے اپنے پرانے وطن ہی کی طرف لے جارہا تھا، سچ پوچھو تو اس وطن سے دور جانے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔"(۱۲)

اس اقتباس سے واضح ہے کہ وہ اپنے شوہر سے بچھڑنے کے کچھ دیر بعد اس بوڑھے سے ملتی ہے اور بوڑھے کے جملے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے فوراً لڑکی کے ماں بننے کا معلوم ہو جاتا ہے یعنی کہ اس کی زچگی کے آثار نمایاں ہیں، تو شوہر سے یہ آثار چھپے رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ لہٰذا آخر میں شوہر کا اس پر شک کرنا اور بچے کے بارے میں شکوک ہونا، کہانی کا عیب ہے۔ اس افسانے میں لڑکی کا کردار ایک تائب کردار کے اوصاف رکھتا ہے۔ یہ ایک روایتی عورت کی طرح عورت کی فطری کمزوری کی بھی قائل ہے اور اپنے بچے کے لیے قربانی اور شوہر سے محبت کے جذبے سے بھی لبریز ہے۔ مگر اس کی محبت پر شک ہوتا ہے۔ جب یہ اپنے شوہر سے دور بوڑھے کو دیکھ کر ان خیالات کا اظہار کرتی ہے۔

"اس کے بعد کئی سورج طلوع ہوئے کئی روشن دنوں پر سنولائی ہوئی راتوں کے گرد پڑی، دین بیتتے گئے۔ اُس کی شفقت میرے زخموں کا اندمال بنتی گئی مگر تمہاری یاد اُس وقت بھی میری زندگی کا حاصل تھی ۔۔۔۔۔ میں اپنی ویران آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتی تو مجھے تمہارا چہرہ نظر آنے لگتا۔ میرے اندر سے کوئی کہتا۔ انھیں اب تم سے نفرت ہو گئی ہے، وہ اب تمہیں بھول گئے ہیں۔"(۱۳)

بوڑھے شخص میں اپنے شوہر کا چہرہ دیکھنا، اس لڑکی کی فطری خصلت کی طرف اشارہ ہے، جس میں ہر تحفظ دینے والے پر عورت کا اپنے پن کا احساس جاگتا ہے۔ اسی سبب اُس کا دل اُسے باور کروا رہا ہے کہ اس کا شوہر اُسے بھول چکا ہے۔ اور وہ اپنے شوہر کے روپ میں اُس بوڑھے کو دیکھ رہی ہے۔

افسانے میں یہ تینوں کردار اُس عہد کے نمایاں ترین رویے ہیں۔ لڑکی کا کردار، اُن لوگوں کی ترجمانی کر رہا ہے جو ایک پرانے وطن کو چھوڑ کر نئے وطن کی طرف آتے ہوئے، اپنے عزیز و اقارب، مال و متاع سب

لٹا چکے ہیں۔ ان کا دل اپنے پرانے وطن سے جانے کو نہیں چاہ رہا مگر اس پرانے وطن کے کچھ باسی اب ان کے وجود کو گوارہ بھی نہیں کر رہے، پرانے وطن کے باسی غیر بن چکے ہیں۔ یہ نئے وطن کی طرف اِس جذبے سے آتے ہیں کہ نئے وطن والے اِن کے اپنے ہیں اور یہاں ضرور پناہ ملے گی۔ اِس نئے وطن کے اپنوں کی عکاسی اِس کے شوہر کے کردار سے ہوتی ہے۔ مگر یہاں ان کے اپنے ہی ان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اپنے ان کو جانتے پہچانتے ہوئے لاوارث کیمپ میں بھیج دیتے ہیں۔ بوڑھے کا کردار پرانے وطن میں رہنے والے سچے اور پُر خلوص لوگوں کی علامت ہے۔ جو اُس بے سہارا لڑکی کو پناہ دیتا ہے۔ پرانے وطن کے بوڑھے کی اپنائیت کے سبب لڑکی افسانے کے آخر پر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ "کاش میں وہی رہ جاتی"۔ افسانے میں تینوں کرداروں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد لوگوں کو جن محرومیوں، پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اس کی وجہ سے اضطراب کی کیفیت نمایاں تھی۔ ہجرت کے بعد افسانوی اور شعری ادب میں ہجرت کے بعد کے پس منظر اور حالات و واقعات سے بڑھتی بے چینی کو انور سدید نے منفرد اور ایک الگ انداز میں بیان کیا ہے۔

اس افسانے میں جمال اور صابی کی محبت کو اندر سدید نے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ افسانے میں ابتداء سے اختتام تک رومانوی عناصر کا غلبہ نظر آتا ہے۔ دونوں کی محبت کو خوبصورت رنگ میں اُجاگر کیا ہے۔ افسانے کا دلکش اسلوب قاری کو مقید کر لیتی ہے۔ اسلوب کی رعنائی، منظر نگاری، سراپا نگاری اور تصویر کشی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

> "فضا خاموش اور اس خاموشی میں صابی کا گیت شراب سی گھول رہا تھا۔ اُس کی آواز میں ستاروں کی تبسم اور آبشاروں کا ترنم اور مسکراتے ہوئے غنچوں کی رعنائی تھی اور لوگ اس تبسم، ترنم اور رعنائی میں یوں بکھرے کھوئے جا رہے تھے کہ وقت کا تحرک ہی سب کو بھول گیا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی گہرے طنز سے دور بھاگتے ہوئے محبوب سے کہہ رہا ہوں۔ تم زیر لب آہستہ، آہستہ کیوں مسکراتے ہو یہی ہنسی تو میرا دل چھین رہی ہے اور پھر مجھ سے دور کیوں بھاگ رہے ہو! اے میرے محبوب!"(۱۴)

انور سدید کی افسانوی کائنات تنوع رنگوں اور مختلف موضوعات کی ایک کہکشاں پر مشتمل ہے۔ انہی موضوعات میں انہوں نے "ابھی امتحان اور بھی ہیں" میں ہجرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اپنوں سے بچھڑنے،

لٹنے اور برباد ہونے کا غم اس افسانے میں پوری طرح روشن نظر آتا ہے۔ انور سدید نے افسانے کی ان سطروں میں کہانی کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ جب افسانے کا ہیرو اپنوں کی تلاش میں پاکستان پہنچتا ہے تو لکھتا ہے:

"اُمید کی اسی کرن کے سہارے وہ پاکستان پہنچا۔ سرحد عبور کرتے وقت اس کا دل خوشی سے معمور تھا۔ لیکن ساتھ ہی ایک موہوم سا ڈر بھی اس کے ذہن پر طاری ہوا جارہا تھا اور پھر والٹن کیمپ سے لے کر کراچی کے ساحل سمندر تک اُس نے دنیا چھان ماری مگر اُسے اپنے پیاروں کا کچھ پتا بھی نہ چلا۔ صورت آشنا چہروں سے دریافت کیا۔ پرانے شناساؤں سے پوچھا۔ ہر ایک نے یہی کہا کہ ٹرین پر حملہ ہوا تھا اور حملے کے بعد کی ہمیں کچھ خبر نہیں کہ کون زندہ رہا، کون مرا، کون اغواء ہوا، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ کئی بار مایوسیوں نے اس کے حوصلے پست کرنے چاہے لیکن ہر بار اُمید اُسے تازہ کر دیتی۔ شاید وہ سب مل جائیں اور وہ تازہ اُمید کی یہ نئی مشعل لے کر پھر اُن کی جستجو میں نکل کھڑا ہوتا۔"(۱۵)

انور سدید کے افسانوں میں دیہات کے پیش کش کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ افسانوں میں دیہی اقدار، انسان، انسان کی زندگی اور محبت کے لطیف احساسات، جذبات کی طور مستحکم موضوع کے ملتے ہیں۔ انھوں نے دیہی زندگی اور انسانی مسائل کو قریب سے دیکھا ہے۔ انھوں نے دیہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں، مختلف رنگوں کی آمیزش سے تیار کی ہیں اور دیہی زندگی کے مسائل، اقدار، روایات اور ثقافت کو دلکش رنگ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے "نیل کنٹھ" میں شفیق اور بتول کی محبت کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ اور "ڈبڈبائی آنکھیں" میں دیہات کے تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی ترجمانی کرتے ہے۔ اس افسانے میں جب شہری بابو، نوراں کے بارے میں اپنی بدنیتی ظاہر کرتا ہے تو" نازو" اپنی غیرت و ہمت کے بل بوتے پر اس کو لہولہان کر دیتا ہے۔ انور سدید دیہات کی زندگی کی ترجمانی اس کے تہذیبی اور اخلاقی مناظر میں کرتا نظر آتا ہے۔ دوسری طرف شہری تہذیب ہمیشہ دیہاتی تہذیب کی مغلوب نظر آتی ہے۔ نازو مردانگی کا مجسمہ ہے جس نے چودھری کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا ہے۔ "وکٹوریہ کراس" ۱۹۴۷ء بہت خاص موضوع لیے ہوئے تھا، یعنی برطانوی سامراج سے اظہار نفرت جو جرمنی کے ہٹلر کے ہاتھوں یورپ میں ہر جگہ لپٹ رہا تھا بالآخر اس نے معمولی ماہانہ مشاہدے کے عوض ہندوستانی جوانوں کو فوج میں بھرتی کر کے دوسری جنگ عظیم کی بھٹی میں

جھونک دیا۔ انہوں نے ہر محاذ پر داد شجاعت دی۔ انگریزی آقا نے خوش ہو کر ایک ہندوستانی کو فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی۔ مصنف نے واضح کیا کہ غیروں کی بقا کی خاطر اپنی جان قربان کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے ملک میں رہ کر ملک کی خدمت کی جائے۔ یہ صرف ایک افسانے کی مثال تھی، جس میں انور سدید نے ایک ایسے دُکھ کو اُجاگر کیا۔ جو برصغیر کے بے شمار گھرانوں کا دُکھ تھا، لاتعداد لوگ اپنے پیاروں کی بے مقصد موت پر خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ انہوں نے شہری اور دیہی معاشروں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مختلف مسائل پر بھی لکھا۔ یوں ۱۹۴۲ء سے اگلے برسوں میں وہ جتنا لکھتے گئے، اُن کا فن نکھرتا اور آگے بڑھتا گیا۔ اُن کا ایک ہی ماٹو تھا" حقیقت نگاری" اور اس کے لیے انھوں نے معاشرے کے سیاہ گوشوں، لوگوں کے تشنہ لبی، نوجوانوں کی حسرتوں اور بے تعبیر خوابوں کو چنا، لیکن مسائل کو ضرورت سے زیادہ نمایاں کر کے مایوسی نہیں پھیلائی بل کہ اکثر ایک روشنی آمیز مستقبل کی نوید دی۔ رواں دواں قلم نے ثابت کیا کہ اُن کے ہاں زندگی افسانہ نہیں بنتی بل کہ افسانہ بہتر زندگی کی راہ دکھاتا ہے۔ وہ کسی خاص "ازم" یا مثالیت کے پرچارک بھی نہیں بنے اور نہ ہی خواہ مخواہ فینیٹی کا استعمال کیا۔ ان کے ۱۹۴۷ء تک کے افسانے ایک ایسے عہد رفتہ کے مرقع ہیں۔ جس میں ایک رسی بسی تہذیب تھی اور بظاہر سکون بھی لیکن اس کی تہ میں ایک معاشرتی جبر اور طبقاتی و مذہبی استحصال بھی تھا۔

> "زندگی کی لکیریں کتنی بہم ہیں؟" اس نے سوچا" کون جانتا ہے" کس کے علم میں ہے کسے معلوم ہے کہ وہ کب ان لکیروں کی بھول بھلیوں میں کھو جائے اور پھر ساری عمر اصل راستے کی تلاش میں گزار دے۔ وہ بھی تو ایک بار انہی بھول بھلیوں میں کھو گئی تھی۔ سرمایہ داری کے تاریک ہیولے نے اس کی روح کے ارد گرد بھی تو ایک تانا بانا سا بن دیا تھا، پیچ در پیچ بالکل مکڑی کے جالوں کی طرح عین اسی وقت رضی اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ اندھیرے میں نور کی ایک شعاع چمکی اور اس نے بڑھ کر ساری تاریکی کو زائل کر کے ہر شئے کو منور کر دیا۔ گناہ کی زندگی کا اچانک خاتمہ ہو گیا اور وہ ایک عورت بن گئی۔"(۱۶)

اس افسانہ میں مشرقی عورت کے رویے کہ اس کا گھر بسانا ہی سب کچھ ہے کو دکھایا گیا۔ اس افسانے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بڑی سے بڑی پڑھی لکھی اور نچلے درجے کی عورت کی بھی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی

ہے کہ اپنا گھر ہو اور اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہے۔ دراصل یہ مکالماتی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں جذبات کے ساتھ ساتھ خواہشوں کا بھی بھرپور عمل دخل ہے۔ یہ افسانہ دو کرداروں پر مشتمل ہے۔ نزہت جو اس افسانے کی ہیروئن ہے بیک وقت اس کے دل میں بہت ساری خواہشیں پنپ رہی ہیں اور اسی بنیاد پر وہ اپنی غلطی کا اعتراف بھی کرتی ہے۔ بل کہ وہ رضی کو اپنی پرانی زندگی کے متعلق سارا کچھ بتا دیتی ہے اور رضی اس سے شادی کر لیتا ہے۔ شادی کے ایک سال بعد ننھا اصغر پیدا ہوتا ہے اور رضی فوج میں کیپٹن بھرتی ہو کر چلا جاتا ہے اور نزہت کو ہر ہفتہ خط لکھتا ہے لیکن خطوط آنا بند ہو جاتے ہیں۔ ایک دن نوکر آکر اس کو خط دیتا ہے جس میں اس کے شوہر کے مرنے کی اطلاع ہوتی ہے۔ نزہت کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کو سانس دے کر کسی نے چھین لی ہو۔ فوج والے اس کی بہادری پر اس کو انعام دیتے ہیں جو نزہت نفرت سے دوسری طرف پھینک دیتی ہے۔ افسانے کے آخر میں دلچسپ جملے ملاحظہ فرمائیں۔

> "نزہت کا دل دھک سے رہ گیا" وکٹوریہ کر اس" اس نے غصے سے کہا اور غصے میں تار پھاڑ دیا۔ دور افق پر کے پاس بادلوں کا ایک ٹکڑا حرکت میں آگیا اور ستارے ٹوٹ کر لمبی لکیریں بناتے ہوئے فضا میں تحلیل ہو گئے۔"(۱۷)

(iii) ۔ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں میں معاشرتی مسائل اور دیہات کی پیش کش:

انور سدید نے دیہات نگاری اور اس سے منسلک محبت کے سچے جذبوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور انہوں نے اپنے افسانوں میں دیہات کو مضبوط قلعے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس قلعے میں رہنے والوں کی اپنی تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی اقدار ہیں۔ انور سدید کے افسانوں میں شہر، دیہات پر یلغار تو کرتا ہے مگر مذکورہ خصائص کے بل بوتے پر دیہات اپنے آپ کو اس کے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔۔ ذوالفقار احسن اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> "ڈاکٹر انور سدید کا عقبی دیا" دیہات" ہے۔ اُن کے اولین افسانے" مجبوری " سے لے کر" لاوارث "تک کے افسانوں میں انھوں نے بالعموم دیہاتی زندگی سے بھولی بھالی تکلف سے عاری، سچے جذبوں میں گندھی ہوئی زندگی سے بھرپور کہانیاں چنی ہیں۔ مثلاً مجبوری مطبوعہ "انجام" (دہلی) ایک دیہاتی لڑکی کی محبت میں ناکامی کی داستان الم ہے۔ انور سدید کے دیگر

افسانوں "ستاروں کے موتی"، " نیل کنٹھ "، "وکٹوریہ کراس"، "دل ناتواں "، "شیش محل"، "پوپھٹے " اور "مایوس آنکھیں"، "شکست"، "صاحب بہادر " میں مرکزی کردار تو لڑکا ، لڑکی کے نہیں مگر ان میں دیہاتی معاشرے کی مروجہ اقدار کو انور سدید نے کہیں مجروح نہیں ہونے دیا۔ لڑکا لڑکی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مگر ان کی محبت فطری اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ "نیل کنٹھ " کے شفیق اور بتول، "ستاروں کے موتی " کے اشفاق اور صفیہ، "وکٹوریہ کراس " کے رضی اور نزہت، "دل ناتواں " کے اشوک اور ارملا، "ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں " کے نازو اور نوراں اور "شیش محل " کے ہاشمی اور روزا کے درمیان انور سدید نے محبت کا ایسا ہی پاکیزہ سنجوگ پیدا کیا ہے۔ دیہات میں مرد کا حسن اس کی مردانگی اور شجاعت ہے اور عورت کا زیور اس کی حیا اور غیرت ہے۔ انور سدید نے اپنے افسانوں میں مرد اور عورت کے کردار میں ان خصائص کو ہر جگہ پیش نظر رکھا ہے۔ ہر چند انور سدید کے نسوانی کردار غریب ہیں مگر بے غیرت نہیں۔ ان میں جب کبھی کسی پر ایسا وقت آتا ہے تو وہ اس شہوت بھرے ہاتھ کی کلائی مروڑ کر اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ انور سدید نے اپنے افسانوں میں مرد اور عورت کے کردار میں ان خصائص کو ہر جگہ پیش نظر رکھا ہے۔ "[۱۸]

ان کے ہاں موضوعات متنوع ہیں جس طرح ہر ادیب انسان دوستی کی بناء پر معاشرتی ناہمواریوں پر کڑی نظر رکھتا ہے اور اپنے تخیل سے ایک مثالی معاشرے کا تصور رکھتا ہے۔ اس تصور کی میزان کو وہ اپنے اردگرد ہونے والے واقعات حالات اور معاشرتی تعلقات کو جانچتا ہے اوراپنی تخلیقات میں اس تنقیدی بصیرت سے تخلیقی حسن میں سموتا اور پیش کرتا ہے۔ جو اپنے عہد کی بنیادی حقیقتوں اور سچائیوں کا ادراک کرتا ہے۔ انور سدید کے افسانوی ادب میں بھی یہ روش عام ملتی ہے۔ ان کا سماجی افہام و تفہیم کا انداز منفرد آرٹ کا نمونہ ہے۔ انھوں نے جمالیاتی تصور کو زندہ رکھا یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے رومانیت کی فضا سے سرشار نظر آتے ہیں۔ انور سدید کے افسانوں میں محبت اور رومانویت کے افسانے کثیر تعداد میں ہے۔ اُن کے ہاں جہاں رومانویت کا رنگ، کردار اور ماحول حاوی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ سماجی سچائیاں بھی اُن کے افسانوں میں ملتی ہے۔ جن کا اُن کو گہرا شعور اور احساس تھا۔ انھوں نے سماجی حقیقتوں اور رومانویت کو یکساں اپنایا، دونوں میں

امتیاز کا عنصر نہیں ملتا البتہ اُن کے افسانوں میں محبت اور رومانویت کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ ان کے ہاں رومانویت کلاسیکی نہیں ہے۔ بلکہ اُنھوں نے روایت کے خلاف اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف بغاوت کا تاثر دیا ہے۔ "نیلی رگیں" اُن کا ایسا افسانہ ہے۔ جس میں محبت کی کہانی میں عصری صورتحال، نو آبادیاتی ہندوستان، انگریز حاکموں کے عوام کے ساتھ رویے، درمیانے طبقے کے مسائل، شہری اور دیہاتی زندگی کے امتزاج اور گاؤں کی رسومات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے عالمی، سیاسی اور سماجی منظر نامے کو اگر دیکھا جائے تو اس صدی کو عالمی سیاسی پس منظر میں جنگوں کی صدی بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں متعدد عظیم جنگیں ہوئیں۔ جن میں قابل ذکر جنگ عظیم اول، عظیم دوم، جنگِ بلقان، جاپان اور روس کی جنگ ہیں۔ برصغیر میں برطانیہ کی نو آبادیاتی نظام اور ان جنگوں نے عوام پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ معاشرتی تقسیم، فرقہ واریت، اقتصادی بدحالی، سیاسی انتشار اور افراد کی جانوں کی ضیاع سے لے کر نفسیاتی عدم توازن کی کیفیات کو جنم دیا گیا۔ ان جنگوں کے دورس نتائج نکلے جیسے آنے والی نسلیں بھی بھگت رہی ہیں۔ اُنہوں نے نو آبادیاتی عہد میں لڑی والی جنگوں کے اثرات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اور اُن اثرات کو اپنی کہانی میں یوں بیان کرتے ہے کہ:

> "اور اسی طرح روز اس کے پاس دیہاتی جن کے بیٹے جنگ ختم ہو جانے کے باوجود میدان سے واپس نہیں آئے تھے اور اسکے خیالات کا تسلسل برہم ہو جاتا۔ وہ انھیں دلاسا دیتے ہوئے کہتا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ اب کے ایسا خط لکھوں گا کہ ساتھ ہی کھنچا چلا آئے گا"۔ اور دیہاتیوں کے چلے جانے کے بعد خیالات کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر جُڑ جاتا۔ آنکھوں کے آگے "گوراں" کی تصویر پھر رقص کرنے لگتی اور اس کے دل کو پھر طمانیت و سکون محسوس ہونے لگتا۔"(۱۹)

اُن کے اس افسانے میں جنگ کی صورت حال پورے افسانے میں داخلی ربط قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔ ہر واقعہ میں ربط کے پس پردہ جنگ کا خوف اور نو آبادیاتی صورت حال کے قبیح اثرات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انور سدید افسانے کی فکری و فنی اور اس کے تخلیقی لوازمات سے بخوبی آگاہ تھے۔ اُن کا یہ افسانہ فنی اور فکری اعتبار سے بھرپور ہے۔ جو رواں اسلوب کے ذریعے آغاز سے انجام تک قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے اور وحدت تاثر کی خصوصیت قاری کو ایک سحر میں مبتلا کر دیتی ہے، اگرچہ یہ محبت کی کہانی ہے۔ لیکن بیان ساری صورتحال نو آبادیاتی نظام کے متعلق ہے۔ جو تقسیم ہندوستان سے

پہلے موجود تھی۔ جس میں سماجی حقیقت نگاری، معاشی برابری اور سماجی شعور کو بیان کیا گیا ہے۔ اُن کا افسانہ در حقیقت داستانوی طرز اور رومانوی رجحانات کے رد عمل کا نتیجہ ہے۔ انور سدید نے اس افسانے میں خواب و خیال کی مصنوعی حیثیت کو کھوکھلی کائنات سے نکال کر حقائق کی سنگلاخ دنیا سے منسلک کر دیا ہے۔ مختلف کرداروں کو عوامی زندگی کے نئے مسائل سے ہم آہنگ کیا۔ سماجی شعور کو بیدار، بے بس و مظلوم افراد، سماجی انتشار، اخلاقی گراوٹ، تہذیبی استحصال، طبقاتی کشمکش سے پیدا ہونے والے مسائل کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے کر نہ صرف معاشرے کی مسخ ہوتی ہوئی تصویر کا پختہ نقشہ پیش کیا۔ بلکہ اس کو سنوارنے کا کام بھی کیا۔ یہ تصویریں مزدوروں کی فاقہ کشی، سماج کے ٹھیکیداروں، جاگیرداروں کے جبر اور تشدد کی ہیں۔ افسانہ کا قاری ان رنگارنگ تصویروں کی سچائی بھانپ کر بلبلا اُٹھتا ہے۔ کیوں کہ سماجی حقیقت نگاری میں زندگی کی سچائی کا اقرار اور سماج کا جیتا جاگتا پیکر نمایاں ہوتا ہے۔

انور سدید کا قلم محبتوں اور اداسیوں کا پرچار اس انداز میں کرتا ہے کہ قاری کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی ہے۔ انور سدید نے جس حسن کاری سے رومانوی افسانے تحریر کیے۔ اس حیثیت سے وہ پیش رُو اور ہم عصر افسانہ نگاروں کے ہم پلہ ہیں۔ اُن کے ہاں محبت و رومان کے منفرد رنگ ہیں۔ اُنہوں نے افسانوں میں موضوعات کا انتخاب اپنے گردوپیش کے بھولے بھالی دیہی سماج سے کیا ہے۔ انسان اور محبت ان کا بنیادی موضوع ہے۔ اُنھوں نے اپنی تمام زندگی محبت کے سمجھنے میں گزاری اور تمام فکر کا محور انسان اور اس کی بیش قیمت محبت ہے۔ جس کے سبب اُن کے ہاں انوکھی اور دل آویز صورتیں اور کیفیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ جنھیں دیکھ کر محسوس کر کے عقل انسان محو حیرت ہو جاتی ہے۔ دِل ناتواں میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> "اس نے مسہری کا پردہ اُٹھاتے ہوئے نیند کا خمار دور کرنے کے لیے اپنے دونوں بازو ہوا میں پھیلا دیئے اور ابھی بازوؤں کا تناؤ کم نہیں ہوا تھا کہ اس کی نگاہیں سامنے قد آدم آئینے کی دبیز سطح سے ٹکرائیں۔ ایک حسین تصویر اسے آئینے کے پیچھے سے جھانکتی نظر آئی اور چند لمحوں کے لیے وہ اپنے آپ بھی بے خبر ہو کر اسے دیکھنے میں محو ہو گئی۔ شب خوابی کے لکیر دار لباس میں شکنیں پڑ گئی تھیں۔ وہ دراز زلفیں رات بھی کی نیند کے بعد پریشان ہو گئی تھیں اور آنکھوں سے نیند کا خمار ابھی تک جھلک رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے محسوس ہوا کہ وہ بے حد خوبصورت ہے۔ اتنی کہ ایک ہی نگاہ میں کسی

نوجوان کے دل کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دے۔ وہ چارپائی سے اُٹھ کر کھڑی
ہوئی اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی قدم قدم آئینے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔
سفید مرمریں گردن میں نکلس پہن کر ایک بار پھر اس نے اپنے جسم کا جائزہ
لیا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھل گئی۔"(۲۰)

انور سدید کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے افسانوں کے موضوع گرد و پیش کے حالات و واقعات سے لیے ہیں اور خالصتاً ذاتی مشاہدہ سے اخذ ہیں۔ انھوں نے عمومی اور خاص دونوں مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح اُن کی فنی تکنیک بھی مقلد نظر نہیں آتی بلکہ مشاہدہ، عمیق مطالعہ ادب اور فنی آگاہی کے سبب تجربات کی صورت میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اُن کی کہانیوں میں منطقی ربط و تسلسل شامل ہے۔ مجموعی طور ان کے افسانوں میں انسان دوستی، انسان سے محبت کا تاثر پختگی سے ملتا ہے۔ ان کے تمام افسانوں کی فکر کا محور انسان ہے۔ انور سدید نے جس عہد میں افسانہ نگاری کی اس عہد میں موجود افسانہ نگاروں کے موضوعات کو بھی اپنایا۔ بے پناہ تخلیقی صلاحیت سے ہیئت اور تکنیکی تجربات بھی کیے۔ انور سدید نے موضوع کی دلچسپی کے لیے اسلوب میں تازگی، نقاط آگہی اور احساس جمال کو اُجاگر کرتے ہوئے انسانیت کے جذبے کو فروغ دیا۔ اُن کے فن کا یہ اعجاز اُن کے بے پناہ تجربات اور عمیق مشاہدے کی بدولت تھا۔

(ج)۔ انور سدید کے افسانوں کا اسلوبیاتی مطالعہ:

ادب میں کسی بھی موضوع پر لکھنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہتی ہے، لیکن ادب میں جو چیز ادیب کو انفرادیت دلاتی ہیں۔ وہ اس کا اسلوب ہوتا ہے۔ جو اسے دیگر سے جدا کرتی ہے یا مقام مرتبہ کا تعین کرتی ہے یا پھر اسلوب جو انہیں معاصرین میں انفرادیت دلاتا ہے۔

"اسلوب سے مراد یہ ہے کہ کسی بلیغ انداز میں اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ
سارے وسائل بروئے کار آئیں جس سے بات موثر اور حسین بنتی ہے۔ ادبی
اسلوب کسی ادیب یا انشاء پرداز کا وہ منفرد انداز تحریر ہے۔ جو اسے اس کے
ہم عصر ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی طرز تحریر ہر شخص کو
حاصل نہیں ہوتا۔ صرف خاص شخصیات ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا طرز تحریر
ان کی شخصیت کی نمایاں چھاپ لیے ہوتا ہے اور جسے دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ

یہ فلاں ادیب کی تحریر کا انداز ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب کا موضوع اور
خیال سے گہرا تعلق اور موضوع اپنا اسلوب ساتھ لاتا ہے۔"(۲۱)

بعض اوقات موضوع ایک ہوتا ہے لیکن زاویہ نگاہ انفرادیت اور شخصیت کی الگ چھاپ ادیب کی اسلوبیاتی شناخت بن جاتی ہے۔ انور سدید نے جس دور میں افسانے لکھے اُس دور میں ترقی پسند ادب بہت عروج پر تھا۔ اور نامور افسانہ نگار افسانے لکھتے رہے۔ جو نہ صرف رجحان، موضوع اور تکنیک کے وجہ سے منفرد تھے۔ بلکہ افسانے کے فکر و فن میں انقلابی تبدیلیاں لا رہے تھے ایسے میں انور سدید کا شمار کم معروف ادیبوں میں تھا۔ انہوں نے تنقید میں بھی کوئی خاطر خواہ پہچان نہیں بنائی بلکہ اُن کا تخلیقی سفر جاری تھا۔ جس میں اُن کو کسی قسم کا کوئی غرض نہیں تھا اور نہ ہی شہرت کی لالچ تھی۔ بلکہ ادب کے وسیع مطالعہ سے خاموش وابستگی نظر آتی ہے۔ لیکن اگر ان کے افسانوں کو فکر و فن کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھا جائے تو یہ افسانے اپنے باطن میں گہری معنویت اور گہرے علامتی زاویوں کے ساتھ ساتھ فکری بصیرت کی بھی اعلیٰ معراج پر نظر آتے ہیں۔ انور سدید کے یہ افسانے تکنیکی، ہیئتی اور دیگر زاویوں سے بھی مکمل صورت پیش کرتے ہیں۔ ان کا افسانوی اسلوب تازگی بخشتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ اسلوب انور سدید کا ذاتی اور شخصی پہلو ہے۔ اُن کے افسانوں کا اسلوب انشائی ہے، جو ایک زندہ اسلوب ہے اور افسانوی زندگی کی رعنائی اور جھلک اس میں واضح ہے۔ یہ روشن اسلوب جگنوؤں کی طرح ٹمٹاتا ہوا صبح روشن کی مانند تابناک ہے۔ ان کے افسانوں میں اسلوب کی تازگی، شگفتگی اور دل کشی جواں نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوی اسلوب کی روانی روزِ رواں کی طرح رواں دواں ہے۔ انہوں نے جس حسن کاری سے افسانے تحریر کیے۔ اس حیثیت سے وہ پیش رُو اور ہم عصر افسانہ نگاروں کے ہم پلہ ہیں۔ اُن کے ہاں محبت و رومان کے منفرد رنگ ہیں۔ انسان اور محبت ان کا بنیادی موضوع ہے۔ اُنھوں نے اپنی تمام زندگی محبت کے سمجھنے میں گزاری اور تمام فکر کا محور انسان اور اس کی بیش قیمت محبت ہے۔ جس کے سبب اُن کے ہاں انوکھی اور دل آویز صورتیں اور کیفیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ انور سدید کا شمار اُردو ادب کے اہم افسانہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانوں میں فکر و فن، تکنیک اور زبان و بیان کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ کم افسانے لکھے ہیں لیکن اُنھوں نے معیاری لکھا ہے۔ انھوں نے اُردو افسانوی ادب کو منفرد موضوع، کردار، فن اور تکنیک اور اسلوب بیاں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کے افسانے فنی و فکری عظمتوں کے آئینہ دار ہیں۔ منفرد آرٹ، تکنیک کے استعمال سے انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش ان کے افسانوی ادب پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر انور سدید کے تحریر کردہ افسانوں میں وہ تمام فنی محاسن موجود ہیں جو ہر اچھے افسانے کی پہچان ہوتے ہیں۔ اُن کے افسانے زندگی کی ایسی قاشیں ہیں جو ہمیں مختلف رنگوں اور ذائقوں سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ ان افسانوں میں واقعیت کے پہلو بہ پہلو علامتی زاویہ بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ قارئین ادب کو ڈاکٹر انور سدید کے طویل علمی و ادبی سفر کی ایک خوابیدہ جہت سے دوبارہ آشنا کر دے گا۔"(۲۲)

اُن کے افسانوں میں موضوعات کے متعلق بحث ہو چکی ہے۔ بلاشبہ اُن کے موضوعات وسعت رکھے ہیں لیکن کردار نگاری بھی افسانہ نگاری میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اولین عہد افسانہ نگاری میں پلاٹ مرکزی کردار ادا کرتا لیکن ارتقائے تمدن کے ساتھ ساتھ نئی قدروں نے جنم لیا۔ جن میں کردار نگاری بھی اہمیت کا حامل ہے۔ انور سدید نے اپنے افسانوں میں دلچسپی کا عنصر کرداروں کے ذریعے جگایا ہے۔ موضوعات کی طرح کرداروں میں بھی مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے کردار اعلیٰ و ادنیٰ دونوں طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو منفرد اور مخصوص خصوصیات کے حامل ہیں۔ بعض کرداروں میں اُن کی اپنی شخصیت کی جھلکیاں بھی کہیں نہ کہیں نظر آتی ہیں۔ وہ کردار کی خوبیوں، خامیوں، ذہانت اور سماجی پس منظر سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے کرداروں کی روح میں جھلک کر ان کے نمونے پیش کیے۔ مثلاً "کچی مٹی کا بند" میں رمضان، فلکو اور پلکھوندی کے کرداروں کی ایک مثلث ملتی ہے۔ جو معاشرتی اقدار کے نمونے ہیں۔ مشرقی معاشرے، اقدار، روایات اور سماج کے رویوں کو ظاہر کرتا ہے۔ انہی کرداروں میں خود انور سدید کا اپنا کردار بھی موجود ہے۔ انھوں نے کرداروں کو اس کے جیتے جاگتے معاشرے سے لیا اور انہی کرداروں کے ذریعے تہذیبی عوامل کو اپنے فن کے ذریعے افسانوں میں پیش کیا۔ اُن کے افسانوں میں کردار یا تو معاشرتی اقدار کی علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جو مکمل طور پر سماجی عناصر کے پیکر معلوم ہوتے ہیں۔ جس طرح کچی مٹی کے بند میں پلکھوندی کی طغیانی کو گاؤں کی بربادی کی علامت ہے۔ وہاں رمضان اور فلکو کا گھر سے بھاگ کر شادی کرنا عزت و ناموس کی بربادی کی علامت کے طور پر پیش کیا۔ ان کرداروں کے ذریعے ہی اقدار کی پاسداری اور دفاع کے محاذ کو "کچی مٹی کا بند" کا عنوان دے کر استحکام بخشا ہے۔ انھوں نے افسانے کے موضوع کے ساتھ کردار نگاری کے ربط کو مضبوطی سے پیش کیا ہے۔ انہی کے ایک اور افسانہ "سجدہ سہو" میں تاجی، جیواں اور شیدے کے کرداروں کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا۔ بلکہ کمال ہنرمندی اور فن سے معاشرتی رویوں پر گہرا

طنز کیا جو فکر کو جلا دیتا ہے۔ "سجدہ سہو" کے مرکزی کردار تاجی طوائف کو جس خوبصورتی سے انور سدید نے پیش کیا بلاشبہ وہ منفرد ہے۔ اُنہوں نے تاجی کردار کے ذریعے معاشرتی کرب ناک داستان کو اپنی کہانی میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"کافی دیر تک کمرے میں سناٹا چھایا رہا کہیں سے چاپ تک آواز سنائی نہ دی۔ تاجی کی جھکی جھکی گردن تھکن سے چور ہونے لگتی ہے۔ اس نے گھونگٹ ذرا سا سرکا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو ایسا جیسے اس کمرے کی کچھ چیزیں اس کی دیکھی بھالی تھیں۔ ایرانی قالین، اجلی چاندنی، ریشمیں گاؤ تکیے، نقشیں گلدان، ہارمونیم، تانپورہ اور طبلوں کی جوڑی اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ خواب ہے، یہ خواب ہے، میں سو رہی ہوں۔ نہیں میں جاگ رہی ہوں یہ حقیقت ہے کھلی ہوئی حقیقت، وہ دوڑ کر دروازے کی طرف لپکی۔ باہر سے زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے وحشت میں دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ شور بھرا اور کمرے کے سناٹے میں ڈوب گیا۔ ایک شیشہ تڑکا اور چکنا چور ہو گیا۔ اس کے دل کے میاں مٹھو کا گلا کسی نے پکڑا اور دبوچ دیا۔ پرے کمرے میں کوئی چنگھاڑا، وہ سہم گئی، جیواں کی آواز تھی پھر تیزی سے کوئی کمرے کی طرف لپکا۔ شیدا چرسی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ بھلی لوکے صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ تھوڑی سی غلطی پر سجدہ سہو ادا کر اور شکر کر، مولا تمہیں اپنے گھر صحیح سلامت لے آیا ہے۔ کسی اور کے اڈے پر چڑھ جاتیں تو۔۔۔۔۔ لگے دم مٹے غم تمہاری ہڈیاں بھی بیچ ڈالتا۔۔۔۔۔ تاجی بے ہوش ہو گئی، جیوں نے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ باہر کالی رات نے سارے شہر کو کھا لیا تھا اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی"(۲۳)۔

ان کے ایک اور افسانے "غم محرومی جاوید" میں چچی اور پامسٹ چچا کے کردار منفرد اہمیت کے حامل ہیں۔ پامسٹ چچا مسلسل سوگواری، مایوسی اور موت کی علامت ہے اور جب کہ دوسری طرف چچی جو بیتے خوشگوار لمحات کو نعمت تصور کرتی ہے اور اُمید کو ذریعہ حیات سمجھتی ہے۔ اسی طرح "رباب کے تار" میں رحمان اور رشدی کے کرداروں کو مستحکم رشتوں کی صورت میں عمدہ فن کاری سے پیش کرتے ہیں۔ انور سدید

نے افسانوں کے کردار دیہات کے بھولے بھالے سماج سے لیے ہیں۔ جو غیرت اور حمیت کی پرچار اور وفا کی پیکر نظر آتے ہیں۔ اگر "ڈبڈباتی آنکھیں" کا مطالعہ کیا جائے تو "نازو" کا کردار دیہات کی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ انور سدید دیہات کی زندگی کی ترجمانی تہذیبی اور اخلاقی تناظر میں کرتے ہیں۔ "سینہ چاک" میں جمال اور صابی، "دل ناتواں" میں اشوک اور ارملا، اور "جب پردہ ہٹا" میں خالد کی ماں کے کردار کو الگ رنگ اور مختلف زاویوں سے چلتی پھرتی زندگی کو موضوع بنایا۔ "جب پردہ ہٹا" میں ایک عورت کے گھریلو الجھاؤ کو قلم سے انداز میں پرچار کی کہ آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی ہے۔ اُن کے ہاں نسوانی کردار غیرت کے پیکر اور مجسمے نظر آتے ہیں۔ "جب پردہ ہٹا" میں خالد کی ماں اپنے شوہر کی دورنگی طبیعت کے باوجود اس کے ساتھ اپنی وفا کا دم بھرتی رہتی ہے۔ اس اقتباس سے انور سدید کے کردار نگاری کے فن کو جانا جاسکتا ہے۔

> "مہتابی چہرہ، کھلتا ہوا رنگ، ستاروں جیسی آنکھیں، شفق جیسے گال، شمعی انگلیاں اور ابریشمی ہونٹ۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا۔ اس نے قریب پہنچ کر بکس کھولا۔ اس میں طلائی زیورات تھے، بھائی!" انہیں لے جاؤ " وہ بولی "کسی کے پاس رہن رکھ دو اور ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ خدارا ان کی زندگی بچاؤ"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آواز بھرا گئی۔"(۲۴)

انور سدید کے افسانوی ادب کے موضوعات کی طرح اُن کے کردار بھی تنوع رنگ لیے ہوئے اور ایک کہکشاں کی طرح ہے۔ ہجرت کے پس منظر افسانے "لاوارث" میں بوڑھا، لڑکی اور شوہر تینوں کرداروں کو سماجی رویوں کی عکاسی کرکے پیش کیا۔ یہ تینوں کردار کہانی کے پس منظر سے الگ کرکے دیکھے جائیں تو یہ تینوں کردار استعاراتی یا علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح "ابھی امتحاں اور بھی ہیں" میں ہیرو ناصر کے کردار کو، "نیلی رگیں" ڈاک والا بابو، گوراں اور سٹینلا کے کردار کو جنگی صورت حال کے اثرات کے نتیجہ کے طور پر پیش کیا۔ انور سدید کے افسانوں میں سادہ، غریب، دیہاتی اور عام شہری کے کردار اور اُن کے معاشرتی ماحول کی عکاسی عموماً فنی حوالے سے خاصی مضبوط ہے۔ لیکن امیرانہ گھروں اور محفلوں کا کلچر اور ان گھرانوں کے نوجوانوں کے کردار اتنے بھرپور نہیں ہیں، ان امیر زادوں اور لاڈلے نوجوانوں کی حرکتیں اور شرارتیں بعض اوقات بچگانہ سی معلوم ہوتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مذکورہ ماحول اور کردار اُس وقت تک مصنف کے تجربے کا حصہ نہ بنے ہوں۔ لیکن انور سدید نے اپنی پختہ نثر اور برجستہ مکالموں نے اس

کمی کو بڑے سلیقے سے پورا کیا ہے۔ یہ امر بھی اس چیز کا ثبوت ہے کہ ان کا نثری اسلوب، اُن کے افسانوں ہی میں ارتقاء کے کئی مراحل طے کر چکا تھا۔ انھوں نے ان افسانوں میں محبت انسان دوستی اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ اُن کے ہاں زندگی کے تنوع اور متضاد تجربات، شعور اور وحدت پذیری فنی تجربے کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ نتیجے میں ان افسانوں میں شعریت، ڈرامائیت اور کردار واقعہ کے عمل اور رد عمل کے جو سلسلے تخلیق ہوسکتے ہیں وہ ان کی تخلیقی حیثیت کی دلالت کرتے ہیں اور اُردو ادب میں وہ افسانے یادگار اور قاری کے لیے غور طلب ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے نسوانی کرداروں میں غیرت و حمیت اور اپنی عزت کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونے کی خوبی کا ذکر کیا ہے۔ انور سدید کے مردانہ کردار بھی دیہاتی گھبرو کی روایتی شان کے مظہر ہیں۔ دیہاتی مٹیار سے علی الاعلان محبت کرتے ہیں۔ اور محبت شیمہ بھر کھوٹ نہیں آنے دیتی۔ ان کی محبت شادی پر منتج ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی کے دُکھ سکھ میں میاں بیوی برابر شریک ہوتے ہیں۔ تاہم انور سدید کے نسوانی کردار عموماً وفاداری کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں

انور سدید کا شمار اُردو ادب کے اہم افسانہ نگاروں میں کیا جاسکتا ہے۔ اُن کی مقبولیت کا عنصر اُن کا طرز نگارش ہے۔ اُن کا افسانوی ادب ایک نئی آواز، لطیف اور منفرد چیز ہے۔ اُن کی کامیابی کی بنیاد انسان کی داخلی ضروریات اور فطرت کے خارجی اظہار کی ہم آہنگی پر ہے۔ اس ہم آہنگی کے اسلوب نے اُن کے اسلوب میں جان ڈال دی ہے۔ رومانیت اور انسان دوستی طرز تحریر میں جذباتیت پیدا کرتی ہے جو اُن کے افسانوں میں وحدت تاثر قائم کرتی ہے۔ اور یہ بنیاد اُن کے افسانوں میں مستحکم پلاٹ کی بنیاد بنتے ہے۔ اُنہوں نے افسانوں میں پلاٹ کی ترتیب و پیش کش کو منفرد انداز میں تحریر کیا ہے۔ پلاٹ کی خوبی ہے کہ وہ سادہ ہو اور مختصر ہو اور واقعات جس طرح ترتیب دیے جائیں۔ اُن میں خاص ربط موجود ہو۔ انور سدید کے افسانوں کے پلاٹ میں درج بالا تمام خوبیاں موجود ہیں۔ ان میں پیچیدگی نہیں ہے۔ پلاٹ کے فن کی بلندی اور بطور اہم جزو اور خصوصیات پر وقار عظیم یوں رقم طراز ہے۔

> "افسانہ حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں، اُن کے تاثرات، اُن تاثرات کی بلندی و پستی، اُن کی تبدیلی، حرکت و جمود اور اس طرح کی بہت سی چیزوں کا ایک ادبی و فنی عکس ہے۔ جو واقعہ، تجزیہ خیال یا حسن افسانے کی بنیاد پر بنتا ہے۔ کہانی کی ترتیب میں مناظر، کردار، ان کرداروں کے عمل اور اُن کے

مکالموں سے افسانہ نگار کے نقطۂ نظر سے رنگ بھرا جاتا ہے۔ کہانی یہ ڈھانچا
اُس کا پلاٹ کہلاتا ہے۔"(۲۵)

اُن کی زیادہ تر افسانوں کے پلاٹ کی ابتداء مختصر جملوں یا منظر کشی سے ہوتی ہے۔ کہانی کے آغاز سے اختتام تک تجسس کی فضا برقرار رہتی ہے۔ واقعات کو روزمرہ زندگی کی طرح ایسے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ زندگی کی قربت کی رو سے اُس میں دلچسپی کا عنصر نمایاں ملتا ہے۔ دیہاتی سماج کے رویے، اقدار، روایات اور رسم ورواج پختہ عناصر کے صورت میں ملتے ہے۔ اُن کے بعض افسانوں میں شہری مسائل کو محبت جیسے حسین اور رومانی پیکر میں دلکش طرز نگارش میں پیش کیا ہے۔ جن میں رومانیت اور سماجی حقیقت نگاری دونوں ایک ساتھ محو سفر ہے۔۔ ان کے افسانوں میں فکر و فن، تکنیک اور زبان و بیان کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ کم افسانے لکھے ہیں لیکن اُنھوں نے معیاری لکھا ہے۔ انھوں نے اُردو افسانوی ادب کو منفرد موضوع، کردار، فن اور تکنیک اور اسلوب بیاں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کے افسانے فنی و فکری عظمتوں کے آئینہ دار ہیں۔ منفرد آرٹ، تکنیک کے استعمال سے انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش ان کے افسانوی ادب پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر انور سدید کے تحریر کردہ افسانوں میں وہ تمام فنی محاسن موجود ہیں جو
ہر اچھے افسانے کی پہچان ہوتے ہیں۔ اُن کے افسانے زندگی کی ایسی قاشیں
ہیں جو ہمیں مختلف رنگوں اور ذائقوں سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ ان افسانوں
میں واقعیت کے پہلو بہ پہلو علامتی زاویہ بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھا جاتا
ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ قارئین ادب کو ڈاکٹر انور سدید کے طویل علمی و
ادبی سفر کی ایک خوابیدہ جہت سے دوبارہ آشنا کر دے گا۔"(۲۶)

انور سدید کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے افسانوں کے موضوع گردوپیش کے حالات وواقعات سے لیے ہیں اور خالصتاً ذاتی مشاہدہ سے اخذ ہیں۔ انھوں نے عمومی اور خاص دونوں مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح اُن کی فنی تکنیک بھی مقلد نظر نہیں آتی بلکہ مشاہدہ، عمیق مطالعہ ادب اور فنی آگاہی کے سبب تجربات کی صورت میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اُن کی کہانیوں میں منطقی ربط و تسلسل شامل ہے۔ جس سے اُن کے افسانوں میں وحدت تاثر موجود ہے۔ اُن کے افسانوں میں واقعات کی ترتیب یکساں ریتی ہے۔ افسانوں میں واقعات دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہیں اور واقعات کی مخصوص ترتیب قاری کو لطف پہنچاتی ہے۔ پلاٹ

میں واقعات کی ترتیب کو دیکھا جائے تو افسانہ جہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اسی منظر پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ کہیں کہیں افسانہ نگار نے نہ صرف تجسس اور دلچسپی کے عنصر کے لیے کرداروں کی داخلی کیفیات، جزئیات نگاری سے کام لیا بلکہ ساتھ میں پلاٹ کی مخصوص بنت کا استعمال بھی کیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں پلاٹ کی ترتیب و پیش کش کا منفرد انداز ملتا ہے۔ اکثریت افسانوں میں پلاٹ سادہ اور مختصر ہے۔ جس میں مربوط خیال اور ربط موجود ہے۔ اُن کے افسانوں کے پلاٹ میں پیچیدگی نظر نہیں آتی ہے۔ افسانے کے پلاٹ کو حقیقی بنانے کے لیے وہ مقامی ماحول، تہذیب اور ثقافت کو پیش کرتے ہیں اور اسی کے مطابق ان کی وضع قطع، لباس، بات چیت، صورت و سیرت کو پیش کرتے ہیں۔ جس سے اُن کے افسانوں میں واقعیت کے ساتھ ساتھ تاثر میں بھی اضافہ نظر آتا ہے۔

انور سدید کے افسانے ماحول اور مقامی رنگ کے لحاظ سے بھرپور ہیں۔ خاص طور پر دیہی ماحول اور قدرتی رنگ کے مناظر کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں منظر کشی کمال کی نظر آتی ہے۔ وہ کہانی کو ابتداء کرنے سے پہلے ایسا منظر کھینچتے ہیں کہ قاری خود کو اس ماحول میں دیکھتا ہے، پھر کہانی شروع کرتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں منظر کشی کا بھی فنی حسن دیکھا جاسکتا ہے۔

> "آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ چاند ان بادلوں کی اوٹ میں ہے کہیں کہیں پھٹے پھٹے بادلوں میں اس کی کرنیں چھن رہی ہیں۔ لیکن بادلوں کی کثافت زیادہ ہے، اس لیے کرنوں کی روشنی مدھم ہے۔"(۲۷)

انور سدید کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ اُن کی باریک بینی اور جزئیات نگاری سے مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے خوبصورت آسمان، زمین، صبح، شام، پرندے، شفق، چاندنی، ستارے، پھولوں کی تازگی، دریا، وادی، ویرانی، بھیڑ، دیہات اور شہر غرض زندگی کے ہر قسم کے منظر کی منظر نگاری انھوں نے اپنے افسانوں میں دلکش انداز سے کی ہے۔ جو اُن کے افسانوں کو دلکش بنادیتی ہے۔ جن کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

> "دریائے جہلم کے طاس میں گزشتہ تین روز سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ زمین کے گہرے پاتال میں سوئی ہوئی پلکھو ندی جاگ اُٹھی تھی اور چوٹ لگی ناگن کی طرح شو نکارے مارتی اور عام راستہ بدلتی اس مقام تک آپہنچی تھی۔ "(۲۸)"اُس وقت شام ہونے کو تھی۔ درختوں کے سائے لمبے

ہوتے ہوئے کولتار کی سرمئی سڑک پر لپٹ چکے تھے۔ کارپوریشن کی گاڑی بھی ابھی چھڑکاؤ کر کے گئی تھی اور زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ "(۲۹)" شام بھیگ چکی تھی اس لیے پرندوں کے غول کے غول بسیرا کرنے کے لیے اپنے گھونسلوں کی طرف اُڑے جارہے تھے۔ اُن کے پرندوں کی ہلکی ہلکی پھڑ پھڑاہٹ۔۔۔۔۔ "(۳۰)" سورج کی آخری زرد کرنیں یوکلپٹس کی پھننگوں پر مضمحل انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ جنا کے پودوں کی باڑ سے پرے، مسجد کے مینار بھی زرد نظر آرہے تھے، دور افق کے قریب، شفق پھیلتی جارہی تھی۔ "(۳۱)

انور سدید نے منظر نگاری کے ذریعے کہانی کو طوالت سے بچانے کے لیے بھی منظر کشی کی۔ اُن کے ایک ایک جملے میں ایک ایک فقرے میں ان کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ انھوں نے دلکش بیانیہ اور منظر نگاری سے لطیف احساسات، جذبات کو منفرد اسلوب میں پیش کیا۔

ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں میں موسیقی کے آلات جیسے طبلے، ہارمونیم وغیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس سے افسانہ نگار کی موسیقی کی طرف دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں اگر اسلوب کی بات کی جائے تو ہمیں نئی نئی تشبیہات اور نئی نئی لفظیات ملتی ہیں، وہ موقع کی مناسبت سے لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے مناظر ہوتے ہیں، ویسے ہی الفاظ بھی اسی مناسبت سے رکھتے ہیں اور جب دل کی کیفیت کی بات کرتے ہیں تو استعارے بھی ویسے ہی استعمال کرتے ہیں۔ ذیل میں درج فقرات قارئین کو لفظوں کے تیور، جملہ سازی، رنگ ڈھنگ، آواز اور آہنگ سے اپنے سحر میں مقید کر لیتی ہے۔

"گوراں۔۔۔۔۔ جو اُس کی زندگی کے افق پر شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوئی، چمکی اور پھر فضا کی اتھاہ گہرائیوں میں غائب ہو گئی۔ "(۳۲)" مگر میرے پیروں کا تحرک مجھے اپنے پرانے وطن ہی کی طرف لے جارہا تھا۔ "(۳۳)" ایک دفعہ ایک معطر سایہ میرے قریب سے گزرا تو میں چونکا، میرے دل کے قریب نہاں خانوں میں میں ایک جگنو یکبارگی چمکا، یہ تم تھیں۔ "(۳۴)" لیکن پھر جلد ہی ہم دونوں نے متانت کا دبیز نقاب اپنے چہرے پر ڈال لیا۔ "(۳۵)" آپا کی آنکھوں سے بھی مایوسی اور تحیر کے نقوش

جھلکنے لگے۔ "(۳۶)" مجھے اپنا دل کچھ اُس کی طرف کھنچتا ہوا سا محسوس ہوا اور پھر اسی وارفتگی میں غیر اضطراری طور پر میں نے دروازے کو نیم وا کر دیا۔ "(۳۷)" کوشل سے پہلی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ اس کے باپ رائے بہادر گیتارام کو "سرکار" کی شان دار "خدمات" انجام دینے کے عوض "خطاب" ملا تھا۔ یہ پارٹی اُسی خطاب کی تشہیر کے لیے کی گئی تھی۔ "(۳۸)

انور سدید کے افسانوی ادب میں بھی دیگر اصناف کی طرح منفرد اسلوب ہے۔ ان کے افسانوں میں آواز کی کھنگ اور لہجے کا وہ واعتماد موجود ہے جو اُن کی دیگر نثری اصناف میں اُن کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ ان افسانوں میں موجود کچھ الفاظ، تراکیب اور استعارے ہی نہیں، جملوں کی بناوٹ کے قرینے اور بات چھیڑنے، پھیلانے، سمیٹنے اور کسی حرفِ آخر میں سمونے کے سلیقے اُن کے نثری سفر میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں۔ اُن کے تنقیدی نثر کی چند مثالیں ملاحظہ ہیں۔

"میلارے کی تخلیقات میں حُسن کا سحر زتاثر اجنبیت کے کہرے میں لپٹا ہوا ہے۔ "(۳۹)" ولی تحریک نے مقامی زبان کو وفورِ شکستگی سے بچایا اور اُسے اعتماد اظہار عطا کر دیا۔ "(۴۰)" کرشن چندر کا شمتیں اسلوب اُن کی خوبی بھی ہے اور کمزوری بھی۔ "(۴۱)

انور سدید کے زیادہ تر افسانے طالب علمی کے زمانے کے ہیں۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اُن کے اسلوب میں فقط خارج ہی نہیں، داخل کو بھی پوری طرح یا خاصی حد تک ظاہر کرنے کی قدرت موجود ہے۔ دِل کے نہاں خانوں، اضطراری کیفیتوں، خوش آگیں لمحوں، لوحِ دماغ پر اُترتے چہروں کا کئی بار ذکر آیا ہے۔ گویا نثر میں نفسی کیفیت، شعری حسن کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ فراوانی کے ساتھ تب بھی موجود ہے۔ اُن کے افسانوں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"یہ کوشل تھی جس نے چوری چوری میرے دل کے نہاں خانے میں داخل ہو کر، "میرے ازل اور اَبد کے سلسلوں کا ناتا جوڑ دیا تھا۔ "(۴۲)" میرا تخیل موہوم مسرتوں کے گہواروں میں جھولنے لگا۔ "(۴۳)" ہزاروں، گیت سننے

والوں میں وہ بھی کھڑا تھا، اُس کی آنکھوں میں خوف و تحیر کے نقوش لرزاں
تھے۔"(۴۴)

انور سدید نے اپنے اسلوب کی جہتوں میں وابستگی نبھائی۔ جس اسلوب کا اظہار پہلے پہل انھوں نے اپنے افسانوں میں کیا تھا، بعد ازاں اُن کی نثری اسلوب نے ارتقاء کے متعدد اور تنوع مراحل تیزی سے طے کیے لیکن ابتدائی اسلوب کی خوشبو یا اُس کے خمیر میں موجود عناصر ہمیشہ اُن کی تحریروں میں اپنے آپ کو محسوس کراتے ہیں۔ اُن کی تراکیب، بیانیہ اُن کی تنقیدی تحریروں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

"اُن کے تخیر میں دل کر فتگی اور ان کے استعجاب میں معصومیت ہے ؟
چنانچہ وہ قاری کی روح کو ٹٹولتے ہیں اور دبے پاؤں اُس کے دل کے نہاں
خانوں میں گھس کر اُسے جمال فطرت کی طرف متوجہ ہونے اور اس کے
کیف و کم سے سرشار ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔"(۴۵)

اُن کے افسانوی اسلوب کے اثرات اُن کی تنقیدی نثر میں فقط لفظیات، تشبیہات، جملوں کی بناوٹ اور تنقیدی بات کی تخلیقی انداز میں تشکیل و تکمیل تک محدود نہیں رہے، آگے بڑھ کر یہ ایسے تنقیدی اقتباسات کی تشکیل و تکمیل کا باعث بھی بنے جو اپنی ذات میں ایک افسانے کا ذائقہ لیے ہوئے تھے۔ اُن کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"میرزا ادیب کی داستان نگاری میں صحرا ایک رومانی کردار کی صورت میں
اُبھرا ہے۔ اس کردار میں ہیبت بھی ہے اور عظمت بھی۔ اس کی خاموشی محیر
العقول ہے۔ اور اس کی گویائی تحیر آفریں، اور یہ کردار موت اور زندگی کے
ساتھ مسلسل آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ اور قاری پر نہ صرف رُعب جلال قائم
کرتا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات اُسے خوف زدہ بھی کر دیتا ہے۔"(۴۶)

اُن کے اسلوب میں اختصار، داستان گوئی کی کمال مہارت نظر آتی ہے۔ جو اُن کی تنقیدی بات کو افسانوی انداز میں موڑ کاٹتی ہے اور ایک تجسس کو جگا دیتی ہے۔ یہ سب کچھ فطری انداز میں وقوع پذیر ہوتا ہے اور مصنف کو نہ تو کوئی اہتمام کرنا پڑتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے موضوع سے تجاوز یا مضمون کی متانیت سے دستبردار ہو پاتا ہے۔ سو نہ تو اس کا تنقیدی بیان ضعف کا شکار ہوتا ہے اور نہ ہی اُس کے لہجے کا اعتماد اور دلائل کا سلسلہ کمزور پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقیدی نثر میں اُن کا اسلوب نگارش افسانوی نثر کے ارتقاء کا سلسلہ ہے۔ زبان و

بیان کے معاملے میں اُردو ادب کو انور سدید جیسے ادیب پر فخر کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی زبان شستہ، آئینے کی طرح روشن، دلکش اور مؤثر ہے۔ اُن کی تحریروں میں بے ساختگی اور شاعرانہ لطافت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ تشبیہ، استعارے کے ذریعے افسانوں کے اسلوب میں سحر کارانہ تاثر ملتا ہے۔ جو کہ پاکیزہ اور لطیف ہے۔ اُن کی شجر کارانہ جدت منفرد اور بے مثال ہے۔ ان کی منفرد طرز نگارش نے کہانی کو دلکش اور جاذب نظر بنایا۔ سجاد نقوی اس امر میں بیان کرتے ہیں کہ:

> "اُن کے افسانے میں مضمون نگاری کا سا انداز کہیں کہیں ہے۔ یہ عام طور پر پیرائیہ بیان، افسانہ نگاری کے تقاضے پورے کر رہا ہے۔ انور سدید کی افسانوی نثر پر فارسی لفظیات اور پنجاب کے اُردو شعر و ادب کا اثر زیادہ اور دہلی لکھنؤ کے محاوروں، کہاوتوں اور لہجوں کا اثر کم ہے۔ لفظی تراکیت یا مرکبات کچھ زیادہ نظر آتے ہیں۔ مگر نہ تو فقط آرائشی ہیں اور نہ ہی شعوری کاوش کا نتیجہ ہے۔ اُن کے اسلوب میں ایک لطیف احساسِ موسیقیت موجود ہے اور جملوں کی روانی میں جہاں کہیں لے کے ٹوٹنے کا خدشہ ہوتا ہے، وہاں خوبصورت تراکیب اور مرکبات طبلے کی تھاپ بن کر اُسے ٹوٹنے سے بچا لیتے ہیں۔"(۴۷)

اُن کی ان تراکیب اور مرکبات سے موسیقیت کا سلسلہ آغاز اُن کے افسانوی نثر سے شروع جو ارتقائی مراحل طے کر کے اُن کی دیگر اصناف میں بھی نظر آتا ہے۔ اُن کا اسلوب بیان وضاحت، صراحت، اختصار متانت، منطقی اور سائنسی انداز رکھتا ہے۔ اُن کا پیرائیہ بیان میں وہ رس موجود ہے جو اُن کو منفرد تخلیقی درجہ تفویض کرتا ہے۔ اُن کے یہ افسانے ابتدائی تخلیقی کاوش کا درجہ نہیں رکھتے بلکہ یہ صاحب اسلوب نثر نگار کے تمام امکانات اور صاحب فکر نقاد کے تصور اسلوب کے تمام عناصر کا ایک دستاویزی ثبوت ہیں۔ منور ہاشمی اس ضمن میں بیان کرتے ہیں کہ:

> "انور سدید کے نزدیک اسلوب، فقط کسی خیال و احساس بھی ہو اور قوت گویائی بھی! وہ لفظوں کے استعمال ہی کو نہیں، اُن کے وجود کو بھی تخلیقی امکانات کا حامل سمجھتے تھے۔ ان کے نثری اسلوب ہی کی نہیں تصور اسلوب کی اولین نمود بھی اُن کے خوابیدہ افسانوں میں ہوئی، بعد ازاں اُن کا تصور

اسلوب اُن کی تنقیدی تحریروں میں مرحلہ وار ترتیب و تدوین کے عمل سے
گزر کر، ایک واضح اور منطقی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔"(۴۸)

اُن کے اسلوب میں زبان و بیان محض تجربہ نہیں بلکہ وہ اس فن سے اپنے موضوع کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ اُن کی کہانیوں کے موضوعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ وہ زندگی کے ایک خاص رنگ کو دیکھتے اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایسا اسلوب اختیار کیا جو ان کے مافی الضمیر اور زاویہ نگاہ کے مطابق قاری تک پہنچا سکے۔ اس لیے وہ ایک شاعر، داستان گو اور نغمہ خواں کی طرح بات کو دہراتے ہوئے منظر نگاری کی مدد سے زندگی کی معنویت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ یہی انفرادیت اُن کو صنف افسانہ میں الگ شناخت کی صورت میں نمایاں کرتی ہے۔ اُن کے اسلوب میں تضاد کی صورت نہیں ملتی ہے بلکہ وہ اسلوب سے اپنے مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آتے ہے۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے جملے مخصوص خوبی کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہے۔ جو کہ کسی قسم کے عیب سے مکمل پاک صاف نظر آتے ہیں۔ یہی تکرار ان کے فن کی تشکیل میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں، تکرار لفظی، علامت خذف، علامت خط کا استعمال ان کے ہاں اس طرح صورت ملتی ہے:

"میں چاند کی رُت میں سوار ہو کر۔۔۔۔ چاندنی کا دودھیا لباس پہنے۔۔۔۔۔
یہ تم تھیں ۔۔۔۔۔ خجستہ۔۔۔۔ میری سوگوار جندڑی کی روح ۔۔۔ میری
زندگی۔۔۔ تمہارے باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ ۔۔۔۔۔ ایسی مسکراہٹ
تھی(۴۹) وہ رات ہم سب پر بھاری تھی۔(۵۰) دارالامان میں پناہ لیے اسے
چوتھا دن تھا(۵۱) وہ دسمبر کی ایک بے حد سرد شام " (۵۲)

انور سدید کے افسانوں کی دوسری بڑی پہچان اُن کی علامتیں ہیں۔ دیگر افسانہ نگاروں کے مقابلے اُن کی علامتیں آسان اور قابل تفہیم ہے البتہ علامتوں پر وہ زیادہ انحصار نہیں کرتے ہیں۔ اُن کا علامتی نظام ہم عصروں سے قطعی مختلف ہے۔ انہوں نے ایسی علامتوں کا سہارا نہیں لیا جس سے قاری کے لیے ابہام پیدا ہو یا وہ کسی اُلجھن کا شکار ہو۔ علاوہ ازیں وہ علامتی پیرائے اور اظہار پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے افسانے کی پوری فضا علامت کی شکل کی اختیار کرتی ہے۔ اسی لیے ان کے الفاظ کے ساتھ جملوں کی ساخت بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ چند اقتباس ملاحظہ کریں:

"سائیفن کا بند ٹوٹ گیا تھا اور پلکھوندی کا پانی تیزی سے گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔"(۵۳) بھلی لوکے صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ تھوڑی سی غلطی پر سجدہ سہو ادا کر اور شکر کر، مولا تمہیں اپنے صحیح سلامت لے آیا ہے۔ کسی اور کے اڈے پر چڑھ جاتیں تو ۔۔۔ لگے دم مٹے غم تمہاری ہڈیاں بھی بیچ ڈالتا۔ تاجی بے ہوش ہو گئی، جیواں نے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ باہر کالی رات نے سارے شہر کو کھالیا تھا اور تاریکی بڑھتی جارہی تھی۔"(۵۴) "رشدی ہم تم ایک رباب کے دو تار ہیں"(۵۵) "فضا خاموش اور اس خاموشی میں صابی کا گیت شراب سی گھول رہا تھا۔ اس کی آواز میں ستاروں کا تبسم اور آبشاروں کا ترنم اور مسکراتے ہوئے غنچوں کی رعنائی تھی اور لوگ اس تبسم ترنم اور رعنائی میں یوں بکھرے کھوئے جارہے تھے۔ کہ وقت کا تحرک ہی سب کو بھول گیا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی گہرے طنز سے دور بھاگتے ہوئے محبوب سے کہہ رہا ہو۔"(۵۶)

بالا تمام مباحث سے ثابت ہوتا ہے کہ انور سدید کی افسانہ نگاری اردو ادب میں نمایاں جہت ہے۔ اُن کے افسانوں میں اپنے عہد کے ہر طرح رجحانات کے اثرات کہیں نہ کہیں ضرور ملتے ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آغاز سے لکھنا شروع کیا اور نویں دہائی تک لکھتے رہے۔ اُنہوں نے طویل عرصہ لکھنے کے باوجود فنی پختگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اُن کے ہاں سستی جذباتیت، نعرہ بازیاور تقلید کے آثار نہیں ملتے یہی چیز اُن کی شخصیت اور افسانہ نگاری کے تمام فن کے سدا بہار ہونے کی دلیل ہے۔

کوئی بھی انسان اپنی ذات میں مکمل نہیں ہوتا۔ اس کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے ارد گرد کے ماحول اور لوگوں سے مدد لینا پڑتی ہے۔ چنانچہ روزمرہ زندگی کے چھوٹی بڑے واقعات اور عہد سے لاپرواہ۔ بیگانہ یا الگ رہ کر زندگی بسر کرنا مشکل امر ہے۔ ہر شخص اپنے عہد کو اپنے طور پر دیکھتا، سمجھتا اور پرکھتا ہے۔ اور اس کے اثرات قبول کرتا ہے اور وہ تمام رویے جو انہوں نے ماحول میں دیکھے ہوں اور مشاہدہ کیا ہو۔ یہی واقعات ذات کے اندر سرایت کر جاتے ہیں۔ فن کار کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ معاشرے میں کئی گناہ زیادہ حساس، معاملہ

فہم، سوچ بچار اور اثرات قبول کر کے رد عمل ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ماحول سے عام آدمی کی نسبت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

انور سدید ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے اور اُن کا پہلا افسانہ "مجبوری" ۱۹۴۲ء میں ہفت روزہ میں شائع ہوا۔ لیکن جو افسانہ اُن کی شہرت کا سبب بنا وپ مایوس انکھیں تھا۔ یہ افسانہ ۱۹۴۶ میں ماہنامہ "مشہور" دہلی میں شائع ہوا۔ اس وقت صادق الخیری نے اس افسانے کو معیاری اور بہتریں قرار دیا تھا۔ جو متعدد رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اُنہوں نے اس عہد وار واقعات کا بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر قبول کیا۔ انہوں نے جب افسانہ نگاری کی ابتداء کی اس وقت بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیاں ہندوستان کے سیاسی و سماجی اور معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی کے حوالے سے اہم ہیں۔ اس عرصے میں ہندوستان کے منظرنامے پر مختلف تحریکوں کے ثرات دکھائی دیتے ہیں۔ جو براہ راست تخلیق سے پہلے اثرانداز ہو رہے تھے۔ اور کچھ جوانی میں یہ سب حالات اور واقعات مل کر پس منظر بنا دیتے ہیں۔ کہ جس سے متاثر ہو کر انور سدید نے لکھنا شروع کیا۔ اس سیاسی و سماجی اور معاشرتی تبدیلی کے حوالے سے اہم ہیں۔ اس عرصے میں ہندوستان کے منظرنامے پر مختلف تحریکوں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ جو براہ راست تخلیق سے پہلے اثرانداز ہو رہے تھے اور کچھ ان کی اوئل عمری اور کچھ جوانی میں یہ سب حالات اور واقعات مل کر ایک پس منظر بنا دیتے ہیں کہ جس سے متاثر ہو کر انور سدید نے لکھنا شروع کیا۔ اس سیاسی و سماجی پس منظر کی جڑیں ہندوستان کی سیاسی زندگی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں ۱۹۱۴ء میں جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر نے احتجاجی جلسوں پر بغیر وارننگ کے گولی چلا کر ۳۷۹ لوگوں کو ہلاک کیا اور ۱۲۰۰ لوگوں کو زخمی کر کے ظلم و بربریت کی مثال قائم کی۔ اس کے فورا بعد تحریک خلافت کا مسئلہ شروع ہوا جو دنیا بھر کے مسلمانوں کے اتحاد کا نشان سمجھی جاتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) میں جرمنی کی حمایت کرنے پر ترکی سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں برصغیر پاک و ہند میں ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں مجلس خلافت قائم کر کے ایک باقاعدہ تحریک خلافت شروع کر دی گئی۔ ۱۹۱۹ء کو خلافت ڈے منایا گیا پھر تحریک موالات شروع کی گئی۔ جس کے تحت خطابات اور تمغے اور برطانیہ کی حکومت کو واپس کر دیئے گئے۔ عدالتوں، انتخابات، سرکاری تقریبات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۲۶ء کے اہم سیاسی و سماجی حالات و واقعات میں تجاویز دہلی (۱۹۲۷ء) نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء) قائداعظم کے چودہ نکات (۱۹۲۹ء)، سائمن کمیشن (۱۹۲۹ء)، آل پارٹیز کانفرنس (۱۹۲۹ء بمبئی)، گول میز کانفرنس (۱۹۳۰ء)، ۱۹۳۵ء کا قانون حکومت ہند، انتخابات ۱۹۳۷ء ۱۹۳۹ء میں ہٹلر شکست خوردہ جرمن قوم سے تباہی

اور پرانی عفریت بن کر اُٹھا۔ اُس نے جرنیلوں کی تنظیم کی بناء پر جرمنی کے وسائل کو وسعت دی اور برطانیہ ،امریکہ اور فرانس، جنگ عظیم اول فاتح، متحیر اور مصیبت زدہ تھے۔ ہٹلر نے آسٹریا سے الحاق کروایا تو جنگ کا خطرہ بڑھ گیا اور جنگ ہوئی بھی لیکن ایسی کہ دنیا پر تباہی اور ہولناکی کے دہانے کھول گئی۔ لاتعداد بے گناہ افراد مارے گئے۔ بے شمار سرمایہ ضائع ہوا اور دنیا میں پس ماندگی اور غربت نے ڈیرے ڈال لیے۔ اسی دوران تحریک پاکستان نقطہء عروج کی طرف بڑھتی ہے۔ اور آخر ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء میں الگ مملکت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ یہ وہ سیاسی پس منظر ہے۔ جس میں انور سدید کی تخلیقی زندگی کا آغاز ہوا۔ اُن کو جنگ عظیم دوم کے دوران نہ صرف برما بلکہ دیگر اہم محاذوں پر رہنے کا موقع ملا۔ اُنہوں نے جنگ عظیم دوم کے اہم لیکن ہولناک تجربے کی شدت کو بہت قریب سے محسوس کیا اور اس حوالے سے اُن کے دو افسانے "نیلی رگیں" اور "لاوارث" اُن کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس جنگ نے خصوصا برصغیر کے حالات نے عموما ایسے حالات پیدا کر دیے تھے۔ ایسے حالات میں جب ایک طرف سیاسی و سماجی کشمکش عروج پر تھی۔ زندگی میں بہت بڑی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ لوگ آزادی کی جدوجہد میں مبتلا تھے اور دوسری جانب تخلیق ہونے والا ادب اس تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے تھا۔ بیک وقت اصلاح پسندی، رومانیت اور حقیقت نگاری ادب کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ ایسے میں انور سدید اس صورتحال کو اندر جذب کرتے ہوئے افسانہ نگاری شروع کی۔ دوسری طرف ان حالات سے بد دل ہونے کی بجائے لوگوں کو اس صورتحال سے سمجھوتہ کرنا اور ہلکے پھلکے اور رومانیت کی غلاف میں تکلیف دہ صورتحال کو دلکش طرز نگارش سے برداشت کرنا بھی سکھایا۔

اُردو افسانہ کی روایت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملنے والی افسانوی روایت کی تاریخ کے بہت سے نام ایسے ہیں۔ جنہوں نے تقسیم ملک سے بہت پہلے لکھنا شروع دیا تھا۔ اور تقسیم ملک کے بعد بھی لکھتے رہے۔ ان میں سعادت حسن منٹو ،ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، عصمت چغتائی، قراۃالعین حیدر ، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، میرزا ادیب اور شوکت صدیقی قابل ذکر ہیں۔ اُنہی لوگوں میں انور سدید ایسے افسانہ نگار جنہوں نے تقسیم ملک سے پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب رومانوی نقطہء نظر رکھنے والے بھی اور ترقی پسند بھی جبکہ اُردو افسانہ مختلف تجربات سے گزر رہا تھا۔ اس میں موضوعات کے تجربے ہو رہے تھے۔ اور بعد میں تکنیک کے لحاظ سے اس نے بہت سے روپ دھارے انور سدید نے زیادہ اثرات رومانوی روایت سے قبول کیئے مگر اس میں بھی اُنہوں نے اپنے لیے علاحدہ راستہ بنایا۔ اُنہوں نے رومانوی افسانہ نگاروں کی بہترین خصوصیات کو

اپنے افسانوں میں جذب کیا۔ اُن کی فکر کا بنیادی ماخذ ماورائی ہے اور نہ اُن کا تخیل سماوی ہے۔ اُن کے افسانوں میں ہیجان اور اضطراب نہیں ہے۔ اُن کے کرداروں میں محبت کا عنصر موجود ہے جو ناکام بھی ہوتے ہیں۔ اُن میں پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں روحانی یاسیت پائی جاتی ہے۔ مگر وہ ایڑیاں رگڑتے، خون اُگلتے نظر نہیں آتے ہوتے۔ اُن کے افسانوں میں تقریبا تمام رومانی افسانہ نگاروں کی مختلف خصوصیات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ رُومانی فظرت عموماموجود زندگی سے ناآسودگی کا اظہار کرتی ہے۔ اس لیے وہ اس سے فرار چاہتی ہے۔ اس کا حال پر اعتقاد نہیں۔ اس لیے وہ ماضی میں پناہ لیتی ہے۔ رومانی انسان زندگی کی موجودہ روش سے مطمئن نہیں ہوتا جو کچھ موجود نہیں ہے۔ اسی کی آرزو کرتا ہے اور جب آرزو پوری نہیں ہوتی تو وہ زندگی کے بارے مین منفی رویہ اختیار کر کے قنوطی بن جاتا ہے۔ زندگی پر سے اُس کا اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ اگرچہ انور سدید کے افسانے رومانی ضرور ہیں مگر اُن میں انداز تحریر اس قسم کا نہیں ہے۔ وہ حال پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی کو جبر نہیں سمجھتے جس کا نتیجہ ہی ہے کہ اُن کے پیش نظر زندگی کا مثبت پہلو رہتا ہے۔ وہ نہایت شگفتہ انداز میں زندگی کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ اُن کے افسانے مختصر ہیں۔ اُن کی خوبی ہے کہ وہ ہر بات چھوٹے کینوس میں کرتے ہے۔ اُن کے ہاں بیانیہ کہانی، علامت نگاری اور رمز و ایماء کے اثرات نمایاں ہے۔ بیانیہ انداز میں سادگی کے ساتھ کہانی بیان کرتے ہے۔ وہ پریم چند، منٹو، کرشن، بیدی جیسے افسانہ نگار وں میں نہیں آتے جو ہمارے ہاں صف اول کے افسانہ نگار جو کہانی بنانے میں ماہر تھے۔ لیکن رومنٹک افسانہ نگاروں میں ان کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ رومانوی طرز کی افسانہ نگاری میں وہ منفرد حیثیت رکھتے ہے۔ چھوٹے کینوس میں بڑی بات کا اظہار ان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ اُن کے افسانوں کو دیکھیں تو قراۃ العین حیدر، کرشن چندر اور مرزا ادیب جیسے افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے معاصر ادب کے رجحانات سے اثرات قبول کر کے الگ رنگ میں پیش کیا اور افسانوں میں انداز تحریر کو منفرد طور متعارف کیا۔

الغرض اُن کے ان افسانوں کا فنی اور فکری رویوں پر تحقیق کرتے ہوئے اور ان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انور سدید بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ فن افسانہ نویس میں انھوں نے ہیئت اور تکنیک کا موزوں استعمال کیا۔ افسانے موضوع، کردار، پلاٹ، منظر نگاری اور اسلوب نگارش میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں بطور انسان کردار پیش کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں عورت اور مرد میں کوئی امتیاز نظر نہیں آتا کیوں کہ وہ انسانیت کی بات کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں

نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تو افسانہ نگاری سے کیا اور کم و بیش تیس سال تک افسانہ نگاری کی اور اپنے افسانوں میں ہر موضوع پر لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے کردار اپنے سماجی اور معاشرتی نظریے سے تشکیل دیے۔ اُن کو انسان کی معصومیت، انسانی رشتوں کے تقدس، دوستی، خلوص، محبت اور ایثار و قربانی کی زنجیروں سے باندھ دیا اور اس میں جمالیاتی عناصر کو شامل کیا۔ اُن کے شدید احساس نے اُن کے اسلوب کو دلکش بنادیا ہے۔ اپنے خاص سیاسی نظریہ رکھنے کے باوجود اُن کی تحریر کی دلکشی فکر سے زیادہ احساس کو انگیز کرتی ہے۔ اُن کی افسانہ نگاری معاشرتی تنوع اور زندگی کی بو قلمونیوں کو بھی پیش کرتی ہے۔ دیہاتی زندگی کی عکاسی اور دیہات کی خالصیت کے ساتھ ساتھ مشرقی عورت کے تصور کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ انور سدید کے افسانوں میں زندگی چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔ اور اِن افسانوں کے کردار مثبت سوچ کے حامل ہیں۔ یہ افسانے انور سدید کی تخلیقی کاوش کا ایک روشن نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید افسانوں میں اسلوبیاتی تنوع اور فکری ہمہ گیری کی بدولت اردو افسانہ نگاری میں ایک معتبر مقام رکھتے ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن، ڈاکٹر، اُردو ادب میں رومانوی تحریک، مکتبہ کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹ تا ۲۰

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، کتابی دنیا، کاک آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۵۳۶

۳۔ ایضاً، ص ۵۵۳

۴۔ ایضاً، ص ۵۵۴

۵۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو افسانہ روایت و مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۸۵

۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اُردو ادب، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۶۸

۷۔ ذیشان علی میراں، انور سدید کے خوابیدہ افسانے: ایک مطالعہ، (مضمون)، سہ ماہی اسالیب، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۲۳، ص ۵۲

۸۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، (افسانوی مجموعہ)، نقش گر، سرگودھا، ۱۴ اگست ۲۰۱۵ء، ص ۱۰

۹۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، کچی مٹی کا بند، ص ۱۵

۱۰۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، غم محرومی جاوید، ص ۳۰

۱۱۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، ستاروں کے شکار میں، ص ۹۱

۱۲۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، لاوارث، ص ۴۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۲

۱۴۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، سینہ چاک، ص ۵۶

۱۵۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، ابھی امتحان اور بھی ہیں، ص ۱۰۳

۱۶۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، وکٹوریہ کراس، ص ۱۴۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۱۸۔ وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، چمن بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۹

۲۰۔ ممتاز منگلوری، طیف نثر، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۶

۲۱۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، (افسانوی مجموعہ) نقش گر، راولپنڈی / سرگودھا، ۱۴ اگست ۲۰۱۵ء، ص ۱۳

۲۲۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، سجدہ سہو، ص ۲۹

۲۳۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، جب پردہ ہٹا، ص ۹۷

۲۴۔ وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، چمن بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۵۸

۲۵۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، (افسانوی مجموعہ) نقش گر، راولپنڈی / سرگودھا، ۱۴ اگست ۲۰۱۵ء، ص ۱۳

۲۶۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، خودکشی سے پہلے، ص ۸۷

۲۷۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، کچی مٹی کا بند، ص ۱۵

۲۸۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، سجدہ سہو، ص ۲۲

۲۹۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، رباب کے تار، ص ۳۷

۳۰۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، باسی پھول، ص ۷۲

۳۱۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، نیلی رگیں، ص ۱۱۲

۳۲۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، نیلی رگیں، ص ۱۱۲

۳۳۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، غم محرومی جاوید، ص ۳۱

۳۴۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، نیل کنٹھ، ص ۱۲۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۳۶۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، ستاروں کے موتی، ص ۱۱۴

۳۷۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، ستاروں کے شکار میں، ص ۸۵

۳۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، کراچی، بارِ دوم، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳۲

۳۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، کراچی، بارِ دوم، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۷

۴۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، بار دہم، ۲۰۱۳ء، ص ۴۷۵

۴۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ستاروں کے شکار میں، عزیز بک ڈپو، لاہور، بار دہم، ۲۰۱۳ء، ص ۸۷

۴۲۔ ایضاً، ص ۸۷

۴۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، وکٹوریہ کراس، عزیز بک ڈپو، لاہور، بار دہم، ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۶

۴۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوب، مضمون، مشمولہ: اوراق، لاہور، سالنامہ، جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۰

۴۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، کراچی، بار دوم، ۱۹۹۱ء، ص ۴۵۸ تا ۴۵۹

۴۶۔ سجاد نقوی، گرم دم جستجو، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۹۰ء، ۱۵۳

۴۷۔ سجاد نقوی، گرم دم جستجو، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۵

۴۸۔ منور عثمانی، مطالعہ اسلوب کے کے تقاضے، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۱۵

۴۹۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، (افسانوی مجموعہ)، نقش گر، راولپنڈی / سرگودھا، ۱۴ اگست ۲۰۱۵ء، ص ۳۱

۵۰۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، کچی مٹی کا بند، ص ۱۵

۵۱۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، سجدہ سہو، ص ۲۲

۵۲۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، رباب کے تار، ص ۳۷

۵۳۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، کچی مٹی کا بند، ص ۲۱

۵۴۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، سجدہ سہو، ص ۶۱

۵۵۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، رباب کے تار، ص ۴۵

۵۶۔ ذوالفقار احسن، انور سدید کے خوابیدہ افسانے، سینہ چاک، ص ۵۶

باب: سوم

ڈاکٹر انور سدید کی غیر افسانوی نثر کا تجزیاتی واسلوبیاتی مطالعہ

(الف) ڈاکٹر انور سدید کی سفر نامہ نگاری کا تجزیاتی واسلوبیاتی مطالعہ :

اُردو نثر میں سفر نامہ کی روایت زیادہ پرانی ہے۔ سفر انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنے قرب وجوار کے حالات جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ جب ایک سیاح اپنے جغرافیائی اور معاشرتی ماحول سے نکل کر کسی اور جگہ پہنچ جاتا ہے تو اُس کے راستے میں آنے والی تمام چیزیں، تمام مقامات ،طرز زندگی اور ماحول اُس کی بصارت سے اُس کی بصیرت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اُسے سپرد قلم کرنے کا نام "سفر نامہ" کہلاتا ہے۔ انسانی جبلت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ نت نئے تجربات حاصل کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اچھا سفر نامہ وہی کہلاتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہو اور دوسروں کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کرے۔ اگر ہم انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں حضرت آدمؑ سے حضرت محمد ﷺ تک انبیاء کرام کے حالات پڑھیں تو اُن کی زندگی میں بھی سفر نامہ ، کامیاب زندگی کے لیے ضروری نظر آتا ہے۔ سفر نامہ دراصل انسانی زندگی کا جزولاینفک ہے۔ جغرافیائی اور تاریخی واقعات دوسروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ گویا ہر انسان سفر کرتا ہے اور گردوپیش کے حالات وواقعات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اُن احوال کو سینہ بہ سینہ منتقل بھی کرتا ہے۔ لیکن تخلیق کار اس سفر کو لفظوں کا جامہ پہنا کر زندہ وجاوید کر دیتا ہے۔ اُردو زبان و ادب کے ارتقاء میں سفر ناموں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ قدیم سفر ناموں میں اس دور کی قیمتی یادگاریں ہیں جب ذرائع آمدورفت کی کمی کے باعث دور نزدیک کے مصدقہ معلومات کی رسائی کا ذریعہ ہے۔ کوئی شخص پڑوس کے دیہات سے بھی ہو کر آتا تو لوگ اس کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے اور اگر کوئی شخص کسی بیرونی ملک کا سر کر آتا تو اس سے سفر نامہ لکھنے کا تقاضا بڑی شدت سے کیا جاتا۔ اُردو کے بیشتر سفر نامے اس تقاضے کے تحت ہی لکھے گئے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ مسافر نے اس سفر کے دوران جو مشاہدات جمع کئے اور جو مشاہدات جمع کیے ہے اور تجربات سمیٹے ہیں۔ ان میں دوسروں لوگوں کی راہنمائی ہو سکے۔

انہوں نے ہر صنف ادب کو تنقیدی بصیرت سے پرکھا اور پرکھنے کے بعد تخلیقی صلاحیت کو آزمایا۔ انہوں نے سفر نامہ نگاری سے پہلے ان سب سفر ناموں کا مطالعہ کیا اور اپنے مطالعے کو وسعت دی اور حاصل مطالعہ اپنی تحقیقی کاوش "اُردو ادب میں سفر نامہ" کی صورت میں پیش کیا۔ انہوں نے غیر معمولی ذہانت،

یادداشت اور تنقیدی صلاحیتوں سے ہر صنف ادب سے رسمی رشتہ استوار نہیں کیا بلکہ خلوص محبت اور محنت شاقہ کے ساتھ اس سے وابستہ رہے۔ اُن کی ہر تخلیق غیر روائتی تاثر لیے ہوتی ہے۔ انور سدید نے "ہنوز دلی دوراست " کے برعکس سفر نامہ " دلی دور نہیں " قابل مطالعہ ہے۔ اس سفر میں انور سدید نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے قاری کے لیے وہ ادبی سرمایہ فراہم کیا جو مطالعہ کے وقت قاری کو ہم سفر بنا دیتا ہے۔ انور سدید کا یہ سفر نامہ لاہور سے "اسلام آباد" اور پھر "لاہور، غالب سیمینار" کی تیاری کے مراحل بڑی خوب صورتی سے پیش کیے ہیں۔ "دلی دور نہیں" یہ سفر نامہ ۲۰ فروری ۱۹۹۲ء کو خورشید مقبول پریس، لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس کا اہتمام ملک مقبول احمد نے کیا اور ناشر مقبول اکیڈمی، لاہور ہے۔ کل ۳۰۴ صفحات پر مبنی اس سفر نامہ کا سرورق انیس یعقوب نے لکھا ہے۔ سفر نامے کا انتساب "اُردو سفر نامہ نگاری کے محب اظہر جاوید کے نام" ہے۔ اس سفر نامہ میں دلی کے قیام کے دوران ادبی سرگرمیاں شامل ہیں۔ یہ سفر نامہ ادبی جریدہ "تخلیق" میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ ڈاکٹر انور سدید نے عرض سدید میں سفر نامے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "دسمبر ۱۹۸۸ء میں مرزا غالب نے یاد کیا تو میں نے فیصلہ کرنے اور حاضری دینے میں تاخیر نہ کی۔ یہ سفر اس آرزو کی تکمیل تھی، جو میرے دل میں گزشتہ ۶۶ برس سے پروان چڑھ رہی تھی، لیکن جس کی تکمیل کے آثار معدوم تھے۔ ہر چند اس وقت دلی کا روپ بدل چکا تھا لیکن میرے لیے اب بھی اس کے اوراق مصور تھے۔ اس کے گلی کوچوں میں عہد رفتہ کی تاریخ اور عہد حاضر کے میرے بہت سے بہترین دوست موجود تھے۔ میں نے اس سفر کے ایک ایک لمحے کو دل میں اتارنے کے لیے چشم و گوش کو کھلا رکھا، چناں چہ لاہور واپس آیا تو پورا دلی میرے دل میں آباد تھا اور یہ احساس بھی تھا کہ یہ شہر جہاں دل کے قریب تھا۔ تو یہ آنکھوں سے بھی دور نہیں تھا۔ اظہر جاوید نے مشورہ دیا کہ اس دلی کو دل سے بازیافت کر کے "تخلیق" کے صفحات پر آباد کر دو۔ میں نے تعمیل ارشاد کی اور لمحہ لمحہ جوڑ کر یہ "دبستان ادب" آباد کیا جسے آپ میرا سفر نامہ شمار کر سکتے ہیں۔ میں نے اس سفر نامے کو نظر نامہ بنانے کے لیے دلی کو واقعات، شخصیات اور مظاہر و مناظر کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اس عمل میں جب سفر نامہ رپورتاژ کی حدود میں داخل ہو گیا تو میں نے اس کے لیے "سفر تاژ" کا عنوان تجویز کیا لیکن یہ نیا

تجربہ نہیں، اس سے قبل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایک خوب صورت سفر تاثر"
سفر آشنا" کے نام سے پیش کر چکے ہیں۔"(۱)

فروری ۱۹۸۸ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے ولادت غالب کے موقع پر ایک بین الاقوامی غالب مجلس مذاکرہ منعقد کیا۔ اس بین الاقوامی مجلس مذاکرہ میں سرگودھا سے پاکستان کی نمائندگی کرنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید شامل تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کا دلی کی طرف پہلا ادبی سفر تھا۔ یہ سفر اُن کی زندگی کا بہترین تجربہ اور فکری مشاہدہ بن گیا۔ دسمبر ۱۹۸۷ء سے فروری ۱۹۸۸ء تک تین ماہ تک کا انور سدید کا سفر ان کے جسمانی، روحانی اور ادبی سفر کی داستان ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جسمانی سفر (سفر نامہ) کی ذیل میں آتا ہے اور ادبی سفر "رپور تاژ" کے زمرے میں آتا ہے۔ انور سدید نے اس سفر نامہ کا عنوان "سفر تاژ" تجویز کیا ہے۔ انور سدید کا یہ سفر غالب سے قلبی محبت کا اظہار بھی ہے۔ کیوں کہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں عین روانگی کے قریب اُن کے پوتے کی وفات ہو گئی، لیکن انور سدید نے گھائل مجبوری کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا کے ہم راہ دہلی روانہ ہوئے جو کہ غالب سے قلبی عقیدت مندی ظاہر کرتی ہے۔ میرزا غالب کے اسی تعلق خاطر ہی سے ڈاکٹر انور سدید نے اس سفر تاژ میں بڑا شگفتہ اسلوب بیاں اختیار کیا ہے۔ "دلی دور نہیں " میں رپور تاژ کی ہیئت میں غالب سیمینار میں شریک ادبا اور مقالہ نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں جوگندر پال، ہرچرن، رام لعل، شاہد ماہلی، قراۃ العین حیدر، جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اُردو ادب کی وہ شخصیات شامل ہیں۔ جنھوں نے بھارت میں اُردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

انور سدید نے غالب سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات پر گہری تنقیدی نگاہ ڈالی اور غالب کے ناقدین کے بارے میں کئی نئی معلومات کا اضافہ کیا۔ اس بین الاقوامی کانفرنس میں ڈاکٹر وزیر آغا اور خود انور سدید نے بھی مقالات پڑھے جن کو خاصی پذیرائی ملی، سفر نامے میں انور سدید نے اُن کا ذکر بڑی عاجزی سے کیا۔ ادیبوں کی نجی محفلوں میں ہر صنف اُردو ادب پر فکر انگیز گفتگو کا تذکرہ بھی ہے بالخصوص اُردو افسانہ اور جدید تنقید پر مبنی مباحث کے متعلق وافر معلومات سفر نامہ میں بیان کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے ان معلومات کو بڑی خوبی سے بیان کیا۔

سفر نامہ میں تحریف نگاری کی بدولت شگفتگی کا عنصر نمایاں ہے۔ جو نہ صرف قاری کو تحریر میں مگن رکھتا ہے بلکہ مزاج سے معلومات تک بہم رسائی بھی دیتا ہے۔ "دلی دور نہیں" میں ضرورت کی مرمر کاری کے ذیلی عنوان کے تحت انور سدید نے مرزا غالب کے مزار کو ہرچرن چاولہ کی زبانی بیان کیا ہے۔ ہرچرن چاولہ

انور سدید کی گفتگو "سنا ہے کہ عرصے تک یہ قبر کچی تھی لیکن اب سنگ مرمر کی بنوادی گئی ہے" کو سفر نامے میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "انور سدید ! غالب کی قبر کو عقیدتاً پختہ نہیں کرایا گیا۔ اس پر ضرورتاً مرمر کاری کی گئی ہے۔ سہراب مودی نے فلم "غالب" بنائی تو اُس میں غالب کی قبر کا ایک منظر دکھانا بھی مقصود تھا۔ اس ضرورت کے لیے اس نے قبر کو تلاش کروایا اور اس پر سنگ مرمر کی استر کاری کرادی۔ سہراب مودی نہ غالب کا عقیدت مند تھا، نہ اُسے غالب شناسی کا دعویٰ تھا۔ لیکن اس کی قسمت میں یہ اعزاز لکھا تھا کہ مستقبل کے غالب شناس اس کے اس اچھے اقدام کی تحسین کریں۔"(۲)

انور سدید نے "دلی دور نہیں" میں اپنے سفر اور غالب سیمینار کے سلسلے میں برپا ہونے والی محافل کے چھوٹے سے چھوٹے واقعات اور لمحے کو اپنے حافظے کی مدد سے ایک خوبصورت "سفر تاثر" کی صورت میں پیش کیا۔ قیام دلی کے دوران تمام حالات و واقعات اور لمحات کو اس سفر نامہ میں قید کیا۔ پاکستانی وفد کی ہندوستانی احباب کے ساتھ ملاقاتوں اور بحث و مباحثہ کے احوال اور ہندوستان میں وزیر آغا شناسی اور دیگر مفید تر معلومات کے حوالے سے "دلی دور نہیں" سفر نامہ اہمیت کا حامل اور قابل مطالعہ تصنیف ہے۔ رحمٰن مذنب انور سدید کے مذاقِ ادب اور سفر نامہ نگاری کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ:

> "حرکت جو سفر کی خالق ہے۔ انور سدید کی تحریر میں بھی پائی جاتی ہے۔ ایک ندی سی بہتی چلی جاتی ہے۔ زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ شب و روز کے تحیر خیز رخ، آدمی کے ادلتے بدلتے پینترے اور اس کے خط و خال چشم تصور میں متحرک دکھائی دیتے ہیں۔"(۳)

"دلی دور نہیں" انور سدید کے اس سفر نامہ میں تخلیقی بیانیہ اسلوب، انکسار، درویشی، طالب علمی اور عقیدت مندی کا سچا جذبہ موجود ہے۔ انہوں نے بیانیہ تکنیک کے ذریعے دوران سفر اپنی یاداشتوں کو محفوظ کیا۔ جس میں سچائی کا عنصر زیادہ اور تخیلی آمیزش بھرپور نظر آتی ہے۔ جس سے حسن اور گہرائی کے امکانات واضح دکھائی دیتے ہے۔ سفر نامہ نگاری میں عموماً لفظوں کے حوالے سے باطن میں پوشیدہ حقیقتوں کو منکشف کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور داخل میں موجود تجربات کو الفاظ کے وسیلے سے پرکھا جاتا ہے۔ ان تجربات سے

احساس ذات کی کیفیت ایک نئی کشفی حالت کا سامنا کرتی ہے۔ یوں داخل سے خارج کا سفر جاری رہتا ہے۔ انور سدید کی سفر نامہ نگاری میں یہ روش مستحکم ملتی ہے۔ جس سے اُن کی سفر نامہ نگاری میں ادبی حسن اور ادبیت شان نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اگر سفر نامہ کی روایت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے مشہور دیبوں نے کمال مہارت سے سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کو ادب بنایا ہے۔ اور ہر ایک کی پہچان الگ الگ ہے۔ جس طرح سر سید احمد خان کی پہچان وضاحتی انداز بیان، شبلی نعمانی کا خطابیہ انداز اور محمد حسین آزاد کے ہاں جمال آفرینی اسلوب کی انفرادیت اور حسن کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ اور عام قاری کی حسرت رہی ان کے سفر نامے پڑھنے کو ملے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سفر نامہ لکھنے کے لیے ادیب یا سفر نگار ہونا ضروری ہے؟ اس سلسلے میں معلوم ہوتا ہے کہ روایت میں بہت سے سفر نامہ ایسے ہیں جنہوں نے دیگر کسی صنف میں کچھ نہیں لکھا۔ لیکن جب سفر کیا تو سفر نامہ تحریر کیا کو کہ شہرت کا ذریعہ بنا۔ مستقر حسین تارڑ اس نوع کی مثال ہے۔ انور سدید نے چونکہ دیگر اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ تنقید، تخلیق اور تحقیق میں الگ پہچان رکھنے والی شخصیت ہے۔ لیکن دہلی کے سفر کے احوال اور غالب کانفرنس کو ایک دلچسپ سفر کی روداد میں اس طرح پیش کیا ہے کہ سفر نامہ نگاری کے جہت میں بھی خود منفرد طور پر متعارف کرایا۔ انہوں نے اپنے تجربات، مشاہدات کو معروضی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جذبات اور تاثرات ایک الگ رنگ میں ڈھل کر ایک خاص قسم کا منفرد سٹائل پیدا کر دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں لفظوں کی شعبدہ بازی کا تاثر نہیں ملتا بلکہ اپنے باطن کی حقیقت کو لفظوں کی مدد سے پرکھتے ہے۔ ان تجربات کو محسوس سطح پر لا کر لفظ کے لسانیاتی پیکر کو ایک نئی حالت میں ڈھالتے ہیں۔ جو ایک افسانوی رنگ کو جنم دیتا ہے۔ یہ افسانوی رنگ حقیقت پر غالب نہیں آتا بلکہ آنکھوں دیکھے مشاہدے کو رواں اسلوب میں تواتر سے سیر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ انہوں نے زمان و مکان کے واقعات سے ہٹ کر کیفیات سفر کو قلم بند کیا ہے یہی خوبی اُن کے سفر نامے کو معلومات کے گنجینہ سے بچاتی ہے اور ادب سے اس کا رشتہ اُستوار کرتی ہے۔ وہ تکنیک کے موزوں استعمال سے ماحول کے مشاہدے کو تحریر میں لاتے ہے۔ انہوں نے واقعات کو بیانیہ انداز اور مناظر سے مرتب کیا ہے۔ جو کہ سفر نامے میں دلچسپی اور اس کے فنی حسن میں اضافہ کرتے ہے۔ انہوں نے اپنی قوت باصرہ سے خوب کام لیا اور واقعات کے اخذ و اکتساب کے لیے اپنی ذہنی بصیرت کو احسن طور پر استعمال کیا ہے۔ انہوں نے سفر کا مواد اس انداز میں پیش کیا کہ قاری سفر نامہ میں محو ہو جاتا ہے۔ مواد کی یہ خوبی اُن کی سفر ناموں کی دخلی خوبیوں میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ سفر نامے میں سیاح اور ادیب دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ سیاح اپنے تیز باصرہ

سے ماحول کی جزئیات کو سمیٹتا ہے اور ادیب ان جزئیات کو خوبصورت، دلکش اور جاذب توجہ اسلوب میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اسلوب کو مرصع نہیں بنایا بلکہ ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ جو داخلی طور پر توانا اور خارج کی صداقت پر غالب ہو کر سچائی کا مظہر بن جاتا ہے۔ "دہلی دور نہیں" کی ادبی حیثیت جدید سفر ناموں میں کیا جا سکتا ہے نہ صرف یہ ایک غیر روایتی سفر نامہ ہے۔ بلکہ علمی پس منظر کی بازیافت میں پوری معاونت فراہم کرتا ہے۔ یہ سفر تاثر محض معلوماتی نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے بھی ایک شاہکار ہے اور دور جدید کے سفر ناموں میں اپنی منفرد اہمیت رکھتا ہے

(ب) ڈاکٹر انور سدید کی انشائیہ نگاری کا فنی و فکری مطالعہ:

لفظ انشائیہ انشاء کا مادہ نشاء (نشء) سے مشتق ہے۔ جس کے لغوی مطلب تخلیق کرنا، پیدا کرنے کے ہیں۔ انگریزی Light Essay کے لیے اُردو میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ انشائیہ اُردو ادب میں ایک مستحکم ادبی صنف کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکا ہے۔ انشائیہ صنف کے وجود میں آنے سے قبل انشاء اور انشاء پردازی کے الفاظ اُردو میں مروج رہے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں اس کے یہ معنی بیان کیے گئے ہیں۔

"۱۔ کچھ بات دِل سے پیدا کرنا

۲۔ عبارت تحریر

۳۔ علم معانی و بیان، صنائع و بدائع، خوبی، عبارت، طرز تحریر

۴۔ وہ کتاب جس میں خط و کتابت سکھانے کے واسطے ہر قسم کے خطوط جمع ہوں۔

۵۔ لیٹر بکس چٹھیوں کی کتاب۔"(۴)

انشائیہ بطور ادبی صنف کی حیثیت سے ماقبل یہ لفظ روزمرہ زندگی کی تحریروں یا کسی عبارت کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی رقم طراز ہیں۔

"انشاء کا لفظ ابتداء میں ایک دفتری اصطلاح تھا۔ اس کا اخلاق سرکاری فرامین اور مکتوبات کے رف ڈرافٹ پر ہوتا تھا اور صاف شدہ مسودہ کو تحریر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جس محکمہ کے سپرد مسودہ تیار کرنے کا کام ہوتا تھا اس نے دیوان الانشاء کا نام پایا۔ رفتہ رفتہ فرامین اور مکتوبات کی تحریر و ترتیب کے لیے انشاء کا لفظ مستعمل ہو گیا۔ دربار داری کے زیر اثر فارسی نثر میں نثر سادہ

کے پہلو بہ پہلو مصنوع (نثر رنگین) سامانی دور ہی سے رائج ہو چکی تھی۔ یہی نثر احکام و فرامین اور مکتوبات کی زبان قرار پائی۔ اس نثر میں خطابت کا عنصر کا جزوِ اعظم تھا۔ اس سے انشاء پردازی کی وہ نہج وجود میں آگئی جس کو ہم انشائیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"(۵)

فارسی زبان و ادب سے سفر طے کرتا ہوا، عربی لفظ انشاء روزمرہ کی تحریروں میں مستعمل ہوا، اس لفظ کو عبارت آرائی کا جو مفہوم ملا وہ بھی فارسی ادب ہی کا مرہون منت ہے۔ لفظ انشاء کے استعمال پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے، انداز تحریر کا محدود اور تکنیکی مفہوم فارسی میں موجود تخلیقی ادب کے زیر اثر ابتداء سے وسعت آشنا ہو کر عبارت آرائی اور حسن معنوں میں استعمال ہوا ہو گا۔ غرض اُردو میں ایک ادبی صنف کے لیے مخصوص اصطلاح تک پہنچنے میں لفظ 'انشاء' نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔

انشائیہ بھی دیگر اصناف نثر کی طرح انگریزی ادب سے اُردو میں وارد ہوا ہے۔ انشائیہ کی اصطلاح کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ ان کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں اور اس کے مفہوم کے علاوہ اس کی شناخت مقرر کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کو ایک مخصوص صنف قرار دیا اور اس کی صنفی خصوصیات بھی متعین کی، انہوں نے انشائیہ کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ:

"انشائیہ اس مضمون کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء اور مظاہرے کی مخفی مفہوم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔" (۶)

ڈاکٹر انور سدید نے سائرہ بتول کو انٹرویو دیتے ہوئے انشائیہ کی تعریف کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے کہ:

"انشائیہ زندگی کے موجود مظاہر، اشیاء، تجربات اور معمولات کو آزادہ روی، خوش خیالی اور زندہ دلی سے دیکھنے اور اس کے انوکھے گوشوں کو نثر کے تخلیقی اسلوب، کفایت لفظی، غیر رسمی انداز اور دوستانہ ماحول میں پیش کرنے سے عبارت ہے۔"(۷)

ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقات کی کئی جہتیں ہیں۔ بطور انشائیہ نگار اُردو ادب میں معتبر مقام رکھتے ہیں۔ انشائیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے، جس نے حال ہی میں مقبولیت کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہ صنف انور سدید کی مرغوب اور پسندیدہ صنف ہے۔ اُردو انشائیہ کے تعارف، شناخت اور فروغ کی خاطر انور سدید نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اُردو انشائیہ نگاری کی تحریک میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انور سدید کی بنیادی حیثیت نقاد کی ہے۔ ان کی تخلیقی تحریروں کی بہ نسبت، تنقیدی مضامین اور اُردو ادب کی بعض اصناف پر مکمل کتابیں ان کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی صلاحیتوں کی دلیل ہیں۔ ان تحقیقی کارناموں میں سفر نامہ، انشائیہ وغیرہ اصناف پر تصانیف ان کی وسعت مطالعے، ژرف نگاہی، گہرائی و گیرائی ادب کے مختلف اصناف پر عبور اور مہارت کی مظہر ہیں۔ ان کے انشائیوں کے مجموعے "ذکر اس پری وش کا" اور "آسمان میں پتنگیں" شائع کر کے اپنی ذات میں مخفی تخلیقی فنکار کو نمودار کیا۔ انہوں نے نہ صرف عمدہ انشائیے تخلیق کیے ہیں بلکہ وہ انشائیے کے مزاج شناس بھی ہیں اور اس کی پوری تاریخ پر ماہرانہ دسترس بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کے ذریعے نوخیز صنف کا مکمل جائزہ لیا۔ انہوں نے گزشتہ چند سالوں میں انشائیہ کے بارے میں نہ صرف جو اختلاف رائے معرض اظہار میں آیا اس پر مدلل بحث کی اور متعدد مضامین لکھ کر صنف انشائیہ کے تعارف، تجزیہ اور تنقید کا فریضہ سر انجام دیا بلکہ متعدد خوبصورت انشائیے ممکنہ طور پر بطور نمونہ تحریر کیے۔

"ذکر اس پری وش کا" ۱۹۸۲ء کو منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب مکتبہ جدید پریس، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ۱۰ انشائیے موجود ہیں جس کے عنوانات۔ اونگھنا، دسمبر، مچھر کی مدافعت میں، فٹ نوٹ، غلطی کرنا، تاروں بھری رات، جھوٹ سچ، مونچھیں، ہزاروں خواہشیں ایسی اور ذکر اس پری وش کا ان انشائیوں میں پیروڈی (تحریف)، رعایت لفظی، شگفتہ بیانی، بے تکلفی، بزلہ سنجی عام ملتی ہے۔ پروفیسر جمیل آذر کتاب کے پیش لفظ "انور سدید کے انشائیے" میں لکھتے ہیں کہ:

> "انور سدید کے انشائیے شاعرانہ حسن بیان اور اظہار فن کا نیا زاویہ ہیں۔ دلکش اسلوب، خوب صورت تشبیہات اور خیال انگیز استعارات سے انہوں نے شگفتگی اور دلکشی پیدا کی ہے۔ اور یہ ان کی شگفتہ بیانی ہی کا کرشمہ ہے کہ دقیق سے دقیق خیال کو بھی انہوں نے لطیف اور سبک صورت دے دی۔ اسلوب کی تازگی ان کے انشائیوں کا طرہ امتیاز ہے۔ ان کے انشائیے نہ صرف ذہنی تہذیب کرتے ہیں بل کہ ہمارے شاہوار فکر کو مہمیز لگا کر ہمیں

ارضی پستیوں سے بلند اور ارفع بھی کرتے ہیں۔ یہ مختصر مضمون انور سدید
کے انشائیوں کا مکمل احاطہ نہیں کرتا۔ ان کا ہر انشائیہ مفصل مطالعے اور
گہرے تجزیے کا متقاضی ہے۔" (۸)

انور سدید اپنے انشائیوں میں ہمارے شعور میں اشیاء کی حقائق کی تصویر کشی کرتے ہوئے تاریخی، تہذیبی عوامل کا تجزیہ پیش کرتے ہیں، پس منظر سے موضوع کا انتخاب کرکے غور و فکر کی نئی راہیں پیدا کرتے ہیں۔ انور سدید کے انشائیوں دسمبر، مچھر کی مدافعت میں، مونچھیں، غلطی کرنا، تاروں بھری رات اور ذکر اس پری وش کا، کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انشائیوں کے موضوعات تاریخی اور تہذیبی پس منظر رکھتے ہیں اور سماجی زندگی کی تصویریں دکھا کر فنکارانہ انداز میں نئے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ انشائیہ دسمبر میں اس انداز فکر کی مثال یوں ملتی ہے۔

"دسمبر آتا ہے تو کسی مہمان کی طرح کال بیل کو دبا کر اپنی آمد کا اعلان نہیں
کرتا بلکہ ایک شریر بچے کی طرح پائین باغ کی دیواریں پھاند کر پہلے گھر کے
صحن میں آتا ہے پھر برآمدے میں پلاسٹک سے بنی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھ جاتا
ہے۔ میری بیوی اس کے مخصوص قدموں کی چاپ پہچانتی ہے۔ وہ جلدی
سے آتش دان میں آگ جلا کر کرسیوں کو اس کے گرد نصف دائرے میں
ڈال دیتی ہے ۔۔۔۔۔ ہم سب افراد خانہ جو گزشتہ گرمیوں میں جزاً جزاً
اکائیوں میں بٹ گئے تھے۔ اب ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔
جیسے کٹی ہوئی پھانکیں دوبارہ تربوز میں سما گئی ہوں۔" (۹)

انور سدید کی ذات میں وسیع اور گہرے مطالعہ کی ایک توانا روایت موجود ہے۔ جسے ان کا بے پناہ حافظہ مزید تقویب بخشتا ہے۔ تاثرات، خواہشات، روزمرہ واقعات، معمولات زندگی اور فلسفیانہ خیالات کو انتہائی سہل انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کا انداز بیان دلچسپ اور انوکھا ہونے کے ساتھ ساتھ چشم کشا بھی ہے۔ اونگھنا انشائیے کے اس اقتباس سے ان کے انشائی اسلوب کے اجزائے ترکیبی کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

"میرے ایک دوست الف جیم جو ایک زمانے میں حرکت میں برکت کے
زبردست حامی تھے اور سارا دن اپنی دکان کے تھڑے پر بیٹھے دہی کا بلونا
ہلاتے رہتے کہ یہ حرکت میں برکت کا نشان ہے، پچھلے کئی سالوں سے اس

بے وقعت مقولے سے تائب ہو کر اونگھتے کے صحت مند عمل میں مبتلا ہو گئے ہیں، ان کا ایقان ہے کہ جب تک زمین کا گز بنے رہے کامیابی ان کے قریب نہیں پھٹکی لیکن جوں ہی انہوں نے اونگھنا شروع کیا ان کا کامرانی کا تصور ہی یکسر بدل گیا۔"(۱۰)

ادب میں پورے انسان کی بازیافت اسی صورت ہی ممکن ہے۔ جب ظاہر کا انسان اور باطن کا انسان ایک خاص تخلیقی لمحے میں یک جا ہو کر "جزو سے کل" میں ڈھل جائے۔ انور سدید کے انشائیے اسی تخلیقی لمحے کی پیداوار ہیں۔ سجاد نقوی انور سدید کے انشائی اسلوب کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"انور سدید اپنے انشائی اسلوب میں "تصرف" سے بھی مزاح اور شگفتگی کی کیفیت پیدا کرتے ہیں مثلاً تیرے اقتباس کے یہ دو جملے "سامنے سے ہٹ جاؤ اور دھوپ چھوڑ دو، ہم اس وقت اونگھ رہے ہیں" اور "اے غافلو! اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ کپڑے اتار کر اونگھنے میں مفاد عامہ کے کتنے راز پوشیدہ ہیں" دیو جانس کلبی اور ارشمیدس کے الفاظ بدلنے سے جملے کیسے شگفتہ ہو گئے ہیں۔ بسا اوقات ڈاکٹر انور سدید الفاظ بھی نہیں بدلتے، مگر الفاظ کی یوں قلب ماہیت کر دیتے ہیں کہ ہر من،میس کی طرح معنی کی ایک نئی تخلیقی سطح اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً پہلے اقتباس میں اس مصرعے سے، جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی، انور سدید نے جھوٹ کی بے بسی اور مظلوموں کو کچھ ایسی دردمندی سے پیش کیا ہے کہ جھوٹ سے سچ مچ پیار کرنے کو جی چاہتا ہے ۔اسے ہم بدلتے موسم کی لطافت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔"(۱۱)

اُن کے انشائیوں میں جہاں تازہ و شگفتہ موضوعات کی نمود نظر آتی ہے وہاں وہ اپنی فردمندی سے اُن کی تراش خراش اور تکنیکی اعتبار سے نوک پلک درست کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ جس کے سبب سے اُن کے انشائیوں میں فنی وحدت اور اکائی معرض وجود میں آتی ہے۔ جو معیاری اور اعلیٰ ادب کی پہچان اور شناخت ہوتی ہے۔ ان کے انشائیے "مچھر کی مدافعت میں" مچھر اور انسان کو تہذیبی پس منظر میں رکھ کر زندگی کے نئے گوشے بے نقاب کیے گئے ہیں۔ یہ انشائیہ نہ صرف طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہے بلکہ سوچ کے انوکھے پن کو تحریف نگاری کے ذریعے خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔

"مچھر کے پاس طبل و علم ہے نہ ملک و مال، پھر بھی ایک زمانے نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہے اور وہ اپنی جانِ ناتواں کی حفاظت کے لیے ان سب سے نبرد آزما ہے۔ مچھر کتنا عظیم ہے خدایا۔ مچھر طائر لاہوتی کی طرح اونچی پرواز تو نہیں کرتا کہ اس سے مچھر کی انسان دوستی پر حرف آتا ہے۔ وہ زمین کے باسیوں سے اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے اور پہاڑوں پر نشیمن بنانے کے لیے چنداں تردد نہیں کرتا۔ وہ طبع امیرانہ اور مزاج فقیرانہ رکھتا ہے۔ دوسروں کے آشکار کو حرص و آز کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، جھپٹنا، پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا اس کے لیے خون گرم کرنے کا بہانہ نہیں بلکہ رزقِ حیات حاصل کرنے کا وسیلہ ہے اور اس کے لیے تنگ و تازہِ جاودانہ کرتا ہے، چنانچہ ہمیشہ مچھر تازہ خون تلاش کرتا ہے، اس نے وہ رزق کبھی حاصل نہیں کیا جس سے اس کی چھوٹی سی پرواز میں کوتاہی ہو۔"(۱۲)

انور سدید نے اظہار کے مختلف ذرائع کو عمدگی کے ساتھ اپنایا جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں شاعرانہ احساس غزل کی طرح تغزل، افسانوی اور ڈرامائی انداز نمایاں طور پر واضح ہے۔ اُن کی خوبی ہے کہ اُنہوں نے ہمیشہ ہر موضوع کو نئے اور انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ "تاروں بھری رات" انشائیے میں اپنے اظہار ذات سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں۔

"مجھے یقین ہے کہ زندگی کی بے پناہ مصروفیات نے آپ کو تاروں بھری رات کو دیکھنے اور اس کی مدھم سحر انگیز روشنی کا لطف اُٹھانے کی اجازت کبھی نہیں دی ہوگی اور اگر میں یہ کہوں کہ آپ زندگی کے ایک حیرت انگیز تجربے سے تاحال محروم ہیں تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔ ایک عرصے تک میں بھی ان غفلت شعار لوگوں کے ہجوم میں شامل رہا ہوں جو لون تیل کے گھریلو اور سیاست و معاشرت کے قومی مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں اور جنہیں اس بات کا احساس تک نہیں کہ صبح ہوئی ہے تو نوزائیدہ سورج سنہری کرنوں کی بارش کس طرح کرتا ہے۔ نسیم بہار جرس غنچہ کی صدا پر لپکتی ہے، تو کسی فرحت مرانگیز کیفیت بیدار کر دیتی ہے۔ شنگرفی شفق پھوٹتی ہے تو کرنیں کس طرح آنکھ مچولی کھیلتی ہیں اور کائنات میں رنگوں کی پھوار سی کیسے بکھر جاتی

ہے۔ دن بھر کے تھکے ماندے پرندے اپنے گھونسلوں کو لوٹے ہیں تو کون سا
نغمہ الاپتے ہیں۔ اُفق کی طرف لپکتے ہوئے اندھیرے سے رات کا پہلا تارہ
کب نمودار ہوتا ہے اور پھر کس طرح ہزاروں، لاکھوں، ستاروں کو ساتھ
لے کر سورج کی آمریت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیتا ہے۔"(۱۳)

بالا تمام اقتباسات کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اُن کا انشائی اسلوب بے تکلف اور شگفتگی کا تاثر لیے ہوئے ہے۔ ان کے انشائیوں کی پہچان میں غیر سنجیدگی کا عنصر نمایاں ہے۔ انہوں نے بعض مقامات پر طنز کے ذریعے مزاح کی کیفیت کو جنم دیا ہے لیکن انور سدید نے زیادہ تر مزاح سے اپنے اسلوب کو شگفتگی سے متصف کیا ہے، مگر جہاں کہیں لاشعوری طور پر اس میں طنز در آئی ہے، وہاں طنز کی دھار کو کند کرنے کے لیے انہوں نے ' تحریف ' سے کام لیا ہے۔ "ذکر اس پری وش کا" انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے ۱۰ انشائیے منفرد اور بے مثال ہیں۔ جب کہ "آسمان میں پتنگیں" انور سدید کے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ "ذکر اس پری وش کا" کی اشاعت ۱۹۸۲ء میں ہوئی اور دس سال بعد زیر نظر انشائیوں کا مجموعہ ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں "ذکر اس پری وش کا" کے ۹ انشائیے شامل ہیں۔ "آسمان میں پتنگیں" ۱۹۹۲ء کو مقبول اکیڈمی، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں آسمان میں پتنگیں، کرکٹ، چھینک، منشور، برگد کا درخت، رشتہ دار، مُسکرانا، قومی مشغلہ، دسمبر، اونگھنا، مچھر کی مدافعت میں، فٹ پاتھ، غلطی کرنا، تاروں بھری رات، جھوٹ سچ، مونچھیں ہزاروں خواہشیں اور ذکر اس پری وش کا انشائیوں کے علاوہ وزیر آغا، ممتاز مفتی، جوگندر پال، ڈاکٹر بشیر سیفی اور انور سدید کے مضامین بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا انور سدید کی انشائیہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے مضمون تجزیہ و تنقید میں اس طرح رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"انور سدید کے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ انور سدید نے تنقید کی رزم گاہ
میں تو ہما بھارت کے مرکزی کردار کا رول ادا کیا ہے اور کشتوں کے پشتے
لگا دیئے ہیں لیکن انشائیہ کی بزم میں اس نے بیک وقت ایک پُرخلوص دوست
، دردمند پڑوسی، نرم دِل شاعر اور جذب کے عالم میں آئے ہوئے صوفی کا
کردار ادا کیا۔ دیوتا جینس (JANUS) کی طرح انور سدید کے ہاں بھی دو
شخص شاید ہمیشہ سے مقیم ہیں۔ ایک وہ پر جلال شخص جو زندگی کا ناہمواریوں

اور سلوٹوں کی بنظر احتساب دیکھتا ہے۔ دوسرا جو بڑی سے بڑی ناہمواری کو
بھی پرکاہ سے زیادہ نہیں سمجھتا بل کہ ناہمواری میں مغمر ہموار سطح کو اُبھارنے
میں سدا کوشاں رہتا ہے۔ یہ اس کا جمالی روپ ہے۔ تنقید کے میدان میں
اس کی نظر احتساب نے خوب جوہر دکھائے ہیں۔"(۱۴)

انور سدید کے انشائیے چھینک میں معاشرتی ناہمواریوں اور خرابیوں پر گہرا طنز کیا۔ سماجی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور اپنے کشف ذات سے دوسروں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے قدامت پسندی، غفلت اور غیر ذمہ دار رویوں کو اس طرح اجاگر کیا۔ جس سے انسانی شعور کو قدامت سے جدیدیت کا راستہ دکھایا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"جب کوئی فرد چھینکتا ہے تو اس کا جذباتی تشنج" دور ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی
قوم چھینکتی ہے تو پورا معاشرہ آسودگی کا سانس لیتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ فرد کی
چھینک تو اضطرار کے کسی لمحہ غنیمت میں خود بخود وارد ہو جاتی ہے لیکن قوم
کے داخل سے چھینک بیدار کرنے کے لیے اسے خود احتسابی کے عمل سے
گزرنا پڑتا ہے اور خود احتسابی کا جرات آمیز عمل مشرقی اقوام نے تاحال
اختیار نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ عرصے سے خواب خرگوش میں مدہوش
ہیں اور چھینکنے کے بجائے خراٹے مار رہی ہے۔"(۱۵)

انور سدید نے اظہار کے مختلف ذرائع کو نہایت سلیقے سے اختیار کیا ہے۔ پتنگ بازی کا ذکر کرتے ہوئے انور سدید نے فلسفیانہ انداز کو نہایت سہل طریقہ سے تحریر کیا اور پتنگ بازی کے سبب اموات اور المیے کو ایک شگفتہ طنز کے بیانیے میں اس طرح بیان کی ہے کہ تلخ حقیقت غیر محسوس انداز میں منکشف ہوتی ہے:

"پتنگ بازی انسان کی طبعی عمر کو کئی گنا زیادہ کر دیتی ہے۔ میں نے آج تک
کسی پتنگ باز کو بیماری سے مغلوب ہو کر یا بستر علالت پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر
مرتے نہیں دیکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر پتنگ باز پتنگ کو ڈھیل دیتے
دیتے یا ڈور کو بے حسابا کھینچتے کھینچتے اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ چھت کی آخری
منڈیر کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور بے خطر گلی میں کود جاتے ہیں۔ اس قسم
کی خوب صورت موت کو لوگ شہادت کا درجہ دیتے ہیں، سو اگر آپ بھی
شہادت کا درجہ پانے کے آرزو مند ہیں تو آج ہی ڈور کا ایک موٹا سا گولہ

خرید یئے ، ایک خوب صورت سی پیلی پتنگ حاصل کیجئے اور اپنے مکان کی
سب سے اُونچی ممٹی پر چڑھ جایئے ۔ پتنگیں آسمانوں پر اور شہادت زمین پر
آپ کا انتظار کر رہی ہے ۔"(۱۶)

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پتنگ کو فرد اور قوم کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ اور سماج کے اہم اصولوں کو اس موضوع کے حوالے سے نئی روشنی میں پیش کیا ہے ۔ اسی طرح وہ دیگر انشائیوں میں مختلف موضوعات کو منفرد تاثرات کے ساتھ خوبصورت اسلوب اور لطیف احساسات کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کی انشائیہ نگاری پر جوگندر پال تبصرہ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

"میں نے انور سدید کے انشائیوں کی کتاب پڑھ لی ہے ۔ میں نے یہ دروازہ
انور سدید کی رفاقت میں ہی بتائے ہیں اور بڑی سبک روشنیوں سے گزرنے
کے احساس سے معمور ہوں ۔ بعض بہایت باریک باتیں وہ ہنستے کھیلتے کیئے
جاتے ہیں اور ان کی اس ذہنی رو کے پر پیچ راستوں میں اُن کا قاری بھی
سیٹیاں بجاتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے۔ ہاتھ خوب پکانہ ہو تو
انشایئے کی کج کلاہی میں وہ زاویے ظہور میں نہیں آتے جن سے اُن کی بانکپن
عبارت ہے۔"(۱۷)

زندگی کے موجود مظاہر ، اشیاء، تجربات اور معمولات میں کبھی دور خود ادیب میں نظر آتے ہے اور کبھی ادیب اس میں دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے دور کو اپنی ذات اور ادبی خدمات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اُن کا شمار اس زمرے میں کیا جاسکتا ہے۔ جو اپنے ماضی اور خود اپنے دور سے منسلک کر کے ایک طویل عرصہ تکوابستہ ہو کر اقدار کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس اظہار کے لیے انہوں نے انشائیہ کو منتخب کیا۔ کیونکہ ملک کے سیاسی اور معاشرتی جزباتی طور پر مشتعل اور سماجی طور پر بیدار حالات کے تقاضے انھیں انشائیہ کی صنف طرف مائل کرتی رہی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دور کے تمام انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کو براہ راست اور مؤثر انداز میں انھوں نے پیش کیا ہے اور معاشرے کے اجتماعی احساس کو پوری جزئیات کے ساتھ سمجھنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ واقعات سے اور کردار کے ذریعہ انہوں نے زندہ دلی پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ ان کے انشائیے میں فنی رکھ رکھاؤ، مطالعہ کی وسعت اور زندگی کی ٹھوس ناہمواریوں کو ہمدردانہ نقطہء

نظر سے دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔اس اعتبار سے اُن کا انشائیہ "کرکٹ" اہمیت کا حامل ہے۔ انیسویں صدی کے وسط سے اختتام تک ہندوستانی معاشرے کے انتشار کے باہمی عمل اور رد عمل نے معاشرے میں سیاسی، مذہبی اور تہذیبی سطحوں پر بعض چیزوں کے ردو قبول کا ایک مخصوص رویہ پیدا کر دیا تھا۔ اور یہ رویہ ترکیبی سے زیادہ تحلیلی نقطہء نظر کا طالب تھا۔ انور سدید نے اس تمام تاریخی پس منظر کو کرکٹ کی نگاہ سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ کرکٹ میں چونکہ پوری قوم مبتلائے شوق ہو جاتی ہے اس لیے مجھے کرکٹ بجائے کھیل کے ایک بھرا پُرا میلہ نظر آتا ہے۔اُن کا یہ انشائیہ نو آبادیاتی جبر اور معاشرتی استحصال کے خلاف احتجاج کا نتیجہ تھا۔

مجموعی طور پر اُن کے انشائیوں کے موضوعات عموماً سماج کے رویے، بگڑے افعال اور عام فطرت پر منحصر ہے، انشائیہ جو کہ موضوع کا پابند نہیں ہوتا اور وسیع کینوس رکھتا ہے، انور سدید نے اظہار بیان میں اس صنف ادب سے انصاف کیا۔ تحریف نگاری، طنز و مزاح انشائیہ کی تکنیکی شناخت بھی ہے۔ انور سدید نے اس سے خوب کام لیا اور اصلاحی تاثر قائم رکھنے کی سعی کی ہے۔ غیر محسوس اور غیر رسمی انداز میں معاشرتی ناہمواریوں کو اجاگر کیا اور اس کے اصلاح کی سعی کی۔ "ذکر اس پری وش کا" کی طرح "آسمان میں پتنگیں" بھی اُن کی انشائی اسلوب کی منفرد تصانیف ہیں۔ جس میں مواد اور اسلوب دونوں باہم گتھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں خیال کی گہرائی اور آزادہ روی کی لطیف کاٹ بھی ہے۔ ان کے انشائیے میں ظرافت کا بنیادی عنصر طنز ہے لیکن طنز میں بھی دوستانہ ماحول پیش نظر رہتا ہے اور طنز کی اس ذیلی رو کے ساتھ ان کے اسلوب کا حسن، قول محال اور حسن تضاد کے بے ساختہ اور بر محل استعمال سے عبارت ہے وہ قاری کو متبسم کرنے کے ساتھ ساتھ ہر جملے پر سوچنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ طنز، تبسم اور گہری سوچ کی مثال "مچھر کی مدافعت" انشائیہ ہے۔اُن کے ہاں زبان کی سلاست اور، بیان کی وضاحت اور خیال کے حسن کے توسط سے امکانات کی بنیاد مستحکم ملتی ہے۔ فن کا راز الفاظ کے بر محل استعمال میں پوشیدہ ہے اور نظر بے باک ہے۔ جب کہ موضوعات میں تنوع ہے اور تازگی کا احساس شدت سے موجود ہے۔ دراصل انہوں نے معاشرتی اندرونی اور بیرونی عوامل کو جو طبعی اور نفسیاتی اور ذہنی اعتبار سے بے حد پیچیدہ پایا ہے۔ اس لیے وہ ان واقعات اور مسائل کی ان پیچیدگیوں میں مزہ لیتے ہے۔ لیکن زندگی کے موجودہ طور طریق کو وہ سمجھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کے انشائیے نفسیاتی تسکین دیتے ہیں۔ فرد کے احساسات اور خیالات کے موازنہ میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ اور تصورات، نظریات اور معتقدات کو معقولیت بخشتے ہیں۔ وہ نہ صرف سب چیزوں کی جانب ہماری توجہ مبزول

کراتے ہیں، بلکہ اس بات پر بھی آمادہ کرتے ہیں کہ باتوں کو ہم فراموش کر چکے ہیں۔ ان کو دوبارہ تازہ کیا جائے اور ایسی اشیاء جن سے ہم واقف ہیں اور جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ انھیں روشنی میں لایا جائے۔

(پ) ڈاکٹر انور سدید کی تحریف نگاری کا تجزیاتی و اسلوبیاتی مطالعہ:

انور سدید کی تحریف نگاری کے جائزے سے قبل تحریف یا پیروڈی کے مزاج بارے بعض نظریات اور بحث کا ذکر ضروری ہے۔ تحریف نگاری یا پیروڈی ادب کی معروف اصطلاح ہے۔ مغرب سے یہ اصطلاح اُردو میں وارد آئی ہے۔ تحریف نگاری کا تعلق مزاح سے ہے اور اس کے دائرہ کار میں نثر اور نظم دونوں آجاتے ہیں۔ ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز میں پیروڈی (تحریف نگاری) کے متعلق درج ہے۔

> "An imitation of specific work of literature (Prose or Verses) or style devised so as to ridicule its characteristic feature, exaggeration, or the application of a serious tone to an absurd subject are typical method."(۱۸)

اُردو میں یہ اصطلاح مغرب سے وارد ہوئی، انگریزی کی اس تعریف سے واضح ہے کہ تحریف نگاری کا مقصد کسی فن پارے یا فن کار کی تضحیک ہے۔ اُردو کے ناقدین بھی اس سے متفق ہیں اور اُردو میں بھی پیروڈی (تحریف نگاری) کے شعریات کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا تحریف نگاری کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> "پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی لفظی نقالی کا نام ہے۔ جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ تحریف کا بنیادی اور امتیازی عنصر "نقل" ہے۔ لیکن نقل بذات خود کو مضحک پہلو پیدا نہیں۔ مثلاً فیشن، ایک خاص انداز سے یا انداز نظر کی نقل ہی تو ہے لیکن یہ سارا عمل سنجیدگی سے مملو ہے۔ اور ہنسی کو تحریک نہیں دیتا۔ اسی طرح بچے غیر ارادی طور پر اپنے بڑوں کے اعمال کی نقل کرتے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کرتے ہیں اور دراصل یہ نقل فطرت کا وہ طریق کار ہے جو تجربے کے عمل کو قطع کر کے تہذیبی ارتقاء کی دوڑ میں انسان کو سرگرم عمل کرتا ہے اور اسے جلد

از جلد گزرے ہوئے تہذیبی مراحل سے آشنا کرتا ہے لیکن جب یہی نقل اس مقصد کے ساتھ عالم وجود میں آئے کہ اصل کی تضحیک سے سامان انبساط بہم پہنچاسکے تو تحریف یا پیروڈی کے صف شمار ہوتی ہے ۔ چنانچہ تحریف کا امتیازی وصف یہ ہے کہ تحریف اعمال، اشیاء، یا تخلیقات کی "عظمت " کو زندگی کے غیر اہم مظاہر سے مربوط کرکے "عظمت " کے سحر کا پردہ چاک کرتی اور ناظر کو کھل کھلا کر ہنسنے پر آمادہ کرتی ہے۔"(۱۹)

ظفر صدیقی تحریف نگاری کا تحریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"پیروڈی وہ صنف ظرافت ہے ۔ جس میں کسی کے طرز نگارش کی تقلید کی جائے تو پیروڈی نہیں کہلائے گی اور پیروڈی تب کہلائے گی جب خیالات اور سٹائل میں مزاح کا عنصر موجود ہو۔" (۲۰)

فرہنگ آصفیہ میں تحریف نگاری کے اصطلاح کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"ایک حرف کی جگہ دوسرے حرف کو رکھنا۔ یا کسی چیز یا کسی بات کو اس کی حالت اور وضع سے بدل دینا۔ کسی بات کو اس کے موضوع کے خلاف کہنا ۔ کسی بات کو اس کے موضوع کے خلاف بیان کرنا۔" (۲۱)

بس بیاں بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی فن پارے میں دوسرا شخص کوئی ردوبدل کردے، اپنی مرضی کا لفظ اس طرح استعمال کرے کہ جملہ یا شعر پھر بھی بامعنی رہے تو یہ عمل تحریف کرنا کہلائے گا۔ جب مزاح میں تحریف کی اصطلاح استعمال کی جائے گی تو اس سے ہنسی کا مطالبہ بھی کیا جائے گا۔ تحریف کے لیے ضروری ہے کہ جس شعر یا فن پارے میں تحریف کی جائے وہ بہت مقبول ہو یا سامع یا قاری مشہور فن پارے سے پہلے سے واقف ہو یا تحریر میں اس سے واقفیت کروائے ۔ اس طرح قاری یا سامع نہ صرف تحریف سے لطف لیتا ہے بلکہ دونوں فن پاروں کے مفاہم کے موازنے سے بھی حظ اُٹھاتا ہے۔

طنز و مزاح میں تحریف نگاری مشکل فن ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ شاعری میں لفظی تحریف نگاری سے طنز و مزاح کی کیفیت پیدا کرنا نسبتاً آسان کام ہیں۔ مگر نثر میں یہ کارنامہ سرانجام دینا آسان نہیں ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اشعار میں تحریف مرحومین، سید محمد جعفری، محمود سرحدی، سید ضمیر جعفری، نذیر شیخ اور قتیل شفائی کے بعد بھی اشعار میں لفظی تحریف سے طنز و مزاح پیدا کرنے کی روایت عام ہے ۔ مگر نثر میں

مرحومین پطرس بخاری، شفیق الرحمن، شوکت تھانوی، ابن انشاء، راجہ مہدی علی خان، آنجہانی کنہیالال کپور اور فکر تونسوی کے بعد قابل ذکر تحریف نگاری کا نام نہیں ملتا۔ انور سدید نے ان اکابرین طنز و مزاح سے اپنے لیے نسبتاً مشکل راستہ منتخب کیا کہ غالب کے اسلوب میں اپنے عہد کی ادبی زندگی کی ایک طرف، سیاسی و معاشرتی زندگی کی دوسری ظرف کی پیروڈی اس طرح کی کہ غالب سمیت مذکورہ تحریف نگار اگر زندہ ہوتے تو انور سدید کے اس تحریف نگاری کو نہایت داد دیتے۔ انور سدید کی تصنیف "غالب کے نئے خطوط" تحریف نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ تحریف نگاری کی روایت میں خوبصورت اضافہ ہے۔ کتاب کا تفصیلی جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

"غالب کے نئے خطوط" ڈاکٹر انور سدید کے ان پندرہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ تصنیف مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا سے ۱۹۸۲ء کو شائع ہوئی۔ "غالب کے نئے خطوط" انور سدید کے ان پندرہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے غالب کے اسلوب اور غالب کی طرف سے اظہر جاوید، مدیر "تخلیق" کو لکھے قارئین میں مقبولیت بھی ملی۔ ۱۹۷۵ء میں انور سدید نے غالب کی طرف سے پہلا خط علی مقصود حمیدی کے خط کے جواب میں جو کہ غالب کے اسلوب نگارش میں "تخلیق" میں چھپا تھا۔ اسے مدیر تخلیق نے ہو بہو رسالہ میں چھاپ دیا۔ یہ خط قارئین ادب "تخلیق" کے صفحات میں ہو بہو غالب کے اپنے مخصوص انداز بیاں میں نظر آیا تو اُن کی دلچسپی بڑھی اور مزید خطوط لکھنے کی فرمائشیں کی جانے لگیں۔ تب سے خطوط کا یہ سلسلہ شروع ہوا اور ۱۹۸۲ء کو آخری خط لکھا۔ انور سدید نے خطوط کی پیروڈی سے جو طنز و مزاح کی کیفیت تحریف نگاری میں اُن کا اسلوب منفرد حیثیت کر گیا۔ یہاں تک کہ مشفق خواجہ اُن کے اس اسلوب گمان کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "انور سدید نے اظہار و مطالب کے لیے غالب کے خطوط کا پیرائیہ اختیار کیا ہے۔ غالب کے انداز کو اختیار کرنے میں وہ اس حد تک کامیاب ہوئے ہیں کہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں" ماہرین غالبیات "ان خطوط کو اصلی سمجھ کر غالب پر مزید تحقیق کا آغاز کر دیں۔"(۲۲)

ڈاکٹر انور سدید کی یہ خوبی تھی کہ انہوں نے غالب کے سینکڑوں کی تعداد میں موجود خطوط کو اپنے حافظے میں اس طرح محفوظ رکھا کہ ان کا تخاطب، آداب و اختتام تک کے الفاظ اور انداز کو جہاں اُن کی ضرورت پڑتی تھی انہیں استعمال کر لیا کرتے تھے۔ کتاب کے دیباچے "رُوبرو" میں اس کو توجیح اس طرح پیش کرتے ہیں کہ:

"زیر نظر کتاب میں جس صنفِ ادب کو آزمانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ بلاشبہ پیروڈی ہے اور اس کا ماڈل غالب کے لازوال خطوط ہیں۔ میں نے اس پیروڈی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے غالب سے ہی استفادہ کیا ہے، اور خطوط غالب سے ایسے بے شمار ٹکڑے اقتباس کیے ہیں جنہیں موجودہ زمانے کے ادبی مسائل اور شخصیات پر آسانی سے منطبق کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان خطوط کا بیشتر حصہ غالب سے مستفاد ہے۔ میں نے ضرورتِ تازہ کے تحت صرف ان کی ترتیب یا مقام ظہور بدلنے کی جسارت کی ہے۔"(۲۳)

"غالب کے نئے خطوط" کے معرض وجود میں آنے اور انور سدید کے اضطراری رد عمل کی صورت علی حمید مقصود حمیدی کا خط جو تخلیق میں اگر شائع نہ ہوتا تو شاید ہم تحریف نگاری کے اس بہترین نمونہ تحریر سے محروم رہتے۔ انور سدید اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"بعض کتابیں ایک مخصوص منصوبہ بندی کے تحت لکھی جاتی ہیں۔ اور مقصود خلقِ خدا کی بھلائی ہوتا ہے۔ اس قسم کی کتابیں فراز خیال سے خود نہیں اُترتیں بلکہ انہیں قوت دماغ کے بل بوتے پر اُتارا جاتا ہے۔۔۔۔ اس کے برعکس کتابوں کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں بقول مرزا غالب "مضامین غیب سے آتے ہیں اور مریر خامہ نوائے سروش بن جاتا ہے"۔ زیر نظر کتاب غالب کی تعریف پر پوری نہیں اترتی، تاہم اسے اول الذکر قسم کی کتابوں میں شامل کرنا مناسب نہیں، وجہ یہ کہ اس کتاب کی تالیف میں کسی منصوبہ بندی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور اس کی ترتیب میں خلق خدا کی فلاح و بہبود کا کوئی زاویہ نہیں۔ یہ کتاب ایک لالہ خورد کی طرح پیدا ہوئی۔ بعض دوستوں نے اس سلسلے کو پسند کیا اور پھر ایک ہی شاخ پر متعدد نئے پھول اُگتے چلے گئے۔"(۲۴)

اُن کی اس تصنیف کی خوبی ہے کہ تین دہائیوں کے گزرنے کے بعد بھی قابل مطالعہ ہے، ایک طرف انہوں نے غالب کے عہد کی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی زندگی کو اپنے خطوط کے ذریعے ایک تاریخی ماخذ کا درجہ دیا جب کہ دوسری طرف انہوں نے گزرے سالوں کی برصغیر کی مجموعی صورت حال اور پاکستان کی صحافتی اور ادبی زندگی کی خصوصیات محبتوں اور نفرتوں کی تاریخ مرتب کی ہے۔ خطوط نگاری میں غالب قدرت

زبان کی وجہ سے بے نظیر حیثیت رکھتے ہیں، زبان کی لطافتوں سے جتنی شناسائی غالب کی تھی۔ اُن کے عہد اور مابعد کوئی بھی غالب سا انداز خطوط نگاری کسی کا مقدر نہ بنی؛ بہت سے قلم کاروں نے جزوی یا کلی طور غالب کے خطوط کی تقلید اور پیروڈی کی کوششیں کیں مگر غالب جیسا اندازِ بیاں کسی کے مقدر میں نہیں رہا۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا اور اسے یک طرفہ سرگرمی بننے نہیں دیا، وہ تنہا رہے اور خطوں کے جواب دیتے ہوئے وہ گویا مکتوب الہیاں سے باہم دلچسپی کے موضوعات پر تبادلہ خیالات کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ غدر کے زمانے میں دہلی کی تباہی کے بعد دوست احباب خاص طور پر ان کے عزیز، شاگرد دہلی سے ہجرت کر گئے، اس وقت جب کسی دوست، عزیز کا خط انہیں موصول ہو تو وہ نہال ہو جاتے اور لطف لے لے کر جواب لکھنا شروع کر دیتے ہیں، اُردو فارسی شاعری کے بعد یہ خط ادب میں ان کی مستقل شناخت قرار پائے، ان کے خطوں میں عصری حیثیت، ذاتی احوال و مسائل سے لے کر فرنگیوں کی آمد کے بعد دلی اور اہل دلی کا پورا منظر ان خطوں کی اہمیت کو روشناس کراتا ہے۔ دہلی کی سیاسی تاریخ اور سماجی تصویر کی نمائندگی کا ذریعہ ان خطوط کو تصور کیا جاتا ہے، ان خطوں کی منفرد پہچان ان کا دلکش اسلوب ہے اور ہر فکر و نظر اسی اسلوب کے اسیر ہیں۔ ان خطوں کی پیروی اور پیروڈی کا محرک اول مکتوب نگاری کا اسلوب ہی ہے۔ اس ذیل میں بیسیوں کاوشیں کی گئیں، تاہم ڈاکٹر انور سدید کی کاوش قابل صد استحسان ہے۔ انور سدید نے خطوط غالب کو ایک نئے نرالے انداز میں اس طرح پیش کیا، کہ یہ مجموعی ادبی حلقوں میں ایک منفرد پہچان بن گیا۔ ان خطوں میں خطوط غالب کی کارفرمائی اپنی جگہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں جس عمدہ طریقے سے سمیٹا گیا وہ بہت اہم پہلو ہے۔ نقش فریادی کے زیر عنوان دیباچہ اظہر جاوید اس تصنیف پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

> "اُنہوں نے غالب کے اسلوب کو نبھانے اور اپنا رنگ جمانے کی خوبصورت کوشش کی ہے، اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے ہیں، بہت سے لوگوں کی نکتہ چینی کرنے اور مین میخ نکالنے کے باوجود "تخلیق" کے پڑھنے والوں نے اسے بہت پسند کیا اور انور سدید کے انداز تحریر کو سراہا۔ اگر کبھی کوئی خط چھپنے سے رہ گیا تو دسیوں سوال ہوئے، بیسیوں لوگوں نے استفسار کیا یوں انور سدید کے قلم کو توانائی ملی اور ہمارا یہ احساس راسخ ہو کر ادب کو ادب جان کر پڑھنے والے بے شمار قارئین ابھی موجود ہیں، جو نہ کسی گروپ سے وابستہ ہیں نہ کسی تعصب کی عینک لگائے ہوئے ہیں۔"(۲۵)

انور سدید نے پہلے غالب اور طرز غالب کو سمجھا پھر قلم اُٹھایا، انور سدید نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اسلوب غالب کے دائرے سے باہر نہ نکلا جائے، از آغاز تا انجام غالب کی تقلید کی۔ غالب کی طرز تخاطب، رسم و روایت اور بے تکلفی جو غالب کے خطوط کی شناخت تھی بعینہ اسی طرح اپنایا۔ انہوں نے غالب سے مغلوب ہو کر اس کی تقلید نہیں کی بلکہ غالب کو سمجھا اور اس کے بعد طبع آزمائی کی جس کا احساس انہیں خود بھی تھا۔ کتاب کے پیش لفظ میں انور سدید خود لکھتے ہیں کہ:

> "میں نے اس محشر خیال اور مجموعہ اضداد شخصیت کے پیشتر نقوش کو اس کتاب میں قائم رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ چنانچہ "غالب کے نئے خطوط" میں اگرچہ واقعات زمانہ کا تناظر تبدیل ہو گیا ہے لیکن ان میں آپ کو وہ غالب یقیناً زندہ نظر آئے گا، جس نے اپنی انا کو تحفظ دیا، دوستوں کی دلداری کی، غم مرگ، غم رزق، غم عزت اور غم فراق کو برداشت کیا، زندگی کی مشکلات کے آگے سینہ سپر رہا، اس کی آنکھوں میں نامساعد حالات کے باوجود شرارت کی چمک آویزاں ہے اور وہ مسکراہٹوں کی تقسیم بے دریغ کر رہا ہے۔"(۲۶)

انور سدید اپنے خطوط کے ابتدائیہ میں تخاطب کا انداز یوں ہے، یعنی برخوردار، جان من، کاشانہ دل کے ماہ دوہفتہ، صاحب، مہاراج، قراۃ العین میرزا اظہر جاوید سلمہ اللہ تعالیٰ، جانا، عالی شانا، میاں وغیرہ، دو خطوط اُن کے تخاطب کے بغیر ہے، اختتامیہ کلمات ملاحظہ فرمائیں۔ اسد اللہ خان غالب، نجات کا طالب غالب، عافیت کا طالب غالب، سگ دربار علی، غالب خستہ جاں ناتواں، اپنی مرگ کا طالب، مرگ ناگاہ کا طالب غالب۔ ان خطوں کی ایک اور خاصیت جن کا طنز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ خطوں کے آخر میں درج تواریخ ہے جو کہ بعض مقامات پر ہجری میں ہے اور بعض بعض جگہوں پر ہندی اور ہجری دونوں میں درج ہیں۔ خطوط غالب کی ایک خوبی مکالمہ نویسی تھی۔ انور سدید نے بھی اپنے خطوط میں یہ حربہ بہ خوبی آزمایا ہے:

> "اے جناب اظہر جاوید صاحب!""السلامُ علیکم" "کہو صاحب، آج اجازت ہے عذرا اصغر کی خدمت میں خط لکھنے کی؟"" حضور! میں عذرا اصغر کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ غالب علی شاہ مبتلائے بخار ہے، نظام ہضم میں اختلال کا شکار ہے۔ میں ہر ملاقات میں آپ کی طرف سے دُعا عرض

کر دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں""نہیں میرزا اظہر جاوید، ان کے خط کو آئے ہوئے بہت دِن ہوئے، وہ خفا ہوں گی، جواب لکھنا ضرور ہے""حضرت! وہ آپ کا نیاز مند ہے، آپ سے کیوں خفا ہو گی بھلا""بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے مجھ لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟""اے لو، حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے!"(۲۷)

خطوط کے مطالعہ سے یہ امر ثابت ہے کہ انور سدید نے طرز غالب کو بخوبی کامیابی سے نبھایا، مکالمہ نویسی ہو، طرز تخاطب ہو یا اسلوب غالب، ان خطوط کے پیروڈی تحری کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وزیر آغا اس کے بارے میں رقم طراز ہے کہ:

"کچھ فرصت ملی تو سوچا کہ آپ کا بھیجا ہوا، غالب کے نئے خطوط کا مسودہ ذرا الٹ پلٹ کر دیکھوں، بس اتنا یاد ہے کہ میں نے غالب کے پہلے خط کا پہلا ورق پڑھنے کی کوشش کی تھی، اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص میرے شانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مجھے محویت کے عالم سے نکال رہا ہے، جھنجھوڑنے والے نے بتایا کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اور وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے مجھے کتاب کے سحر سے باہر نکالنے میں مصروف ہے۔ بہر حال اس وقت تک میں پوری کتاب پڑھ چکا تھا۔"(۲۸)

انور سدید کے خطوط میں اس وقت کے ادبی حالات، واقعات اور تجزیہ بھی ملتا ہے، غالب کے نئے خطوط کو مرتب کرتے وقت وہ کوٹ اَدو میں اپنی پیشہ وارانہ خدمات سر انجام دے رہے تھے، اس وقت کے ادبی معرکے، لغزش، کشمکش سے بخوبی آگاہ رہتے تھے۔ ان خطوط میں بھی اس دور کے معرکی حالات کی چھب نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی اور ان سے وابستگان کسی طرح ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ تلخ جملوں کا استعمال بھی ملتا ہے، ان خطوط میں یہ ادبی معرکے تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ وزیر آغا گروپ کے اہلکار انور سدید تھے جب کہ دوسری طرف ڈاکٹر سلیم اختر، طاہر تونسوی اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ غالب کے نئے خطوط ان واقعات اور معرکوں کے پیچ و خم سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ خطوط غالب کی پیروی یا پیروڈی کا مقصد دلائل سے اختلاف رائے کا اظہار کرنا تھا جس میں انور سدید کافی حد تک کامیاب رہے۔ جب کہ دوسری طرف سے جو ردعمل آیا وہ وقت کے تاریخی صفحوں میں مزین ہے۔ لیکن

اس کشمکش آراء میں غالب کے نئے خطوط پیروڈی اور طنز و مزاح کا مستقبل باب بن گئی۔ انور سدید کے پر زور دلائل اس کتاب کے لفظ لفظ سے جھلکتے ہیں۔ انہیں بات سے بات نکالنے کا ہنر اور چومکھی لڑنا خوب آتا تھا۔ نثری نظم کے چلن کے مطابق ایک اقتباس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"اب سنا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں سب متروکات سخن شامل نصاب کی گئی ہیں اور نظم و نثر کے ادغام سے ایک اور صنف "نثری نظم" پیدا کی گئی ہے۔ مجھے بتاؤ یہ کیا شے ہے؟ یعنی شاعری ہے یا غیر شاعری؟ نثر ہے یا غیر نثر؟ میں نے میر مہدی مجروح، مصطفیٰ خاں شیفتہ اور خواجہ حالی سے دریافت کیا۔ کسی نے اس تیسری جنس کا پتہ نہیں دیا۔ اب تم سے بلا تکلف دریافت کرتا ہوں کہ نظم اور نثر دونوں صیغے تانیث کے ہیں۔ ان کا ارتقاء فطری کیوں کر ہو اور اختلاط باہمی و ہم جنس سے نیا وجود کیسے پیدا ہوا؟۔۔۔ اور کیا اپنے رسالے میں تم بھی یہ جنس چھاپتے ہو؟ سنا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی نے اپنے رسالوں میں اس خلاف فطرت صنف کے خلاف آواز اُٹھائی ہے اور تم دونوں کے ہم نوا ہو! بہت اچھا کام کرتے ہو۔ اصناف نظم و نثر مثل ملک قوم کے ہیں۔ ان کو منتشر کروگے تو سمجھو ملک اور قوم کا انتشار سامنے آرہا ہے۔"(۲۹)

مدیر "تخلیق" عذرا اصغر کی شخصیت و فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"اے لو عذرا اصغر زیر لب مسکرا رہی ہے گویا تمہارے ارشاد پر مہر تصدیق لگا رہی ہے۔ میاں سنو! میں نے ایک تصویر عذرا اصغر کی اپنے دل میں بنا رکھی ہے۔ اس کا عکس ہو بہو سامنے دیکھا۔ واللہ سر مو فرق نہیں قد رنگ، شکل شمائل مین بعینہ قراۃ العین طاہرہ، عمر کا فرق اور کچھ کچھ متفاوت، خلیق شفیق، کریم حلیم، بعینہ، تانیٹ، شعر مہم، داستان شناس، قیاس ہے کہ سینکڑوں شعر اصغر مہدی کے اور غالب کے اور میرزا اظہر جاوید کے زبانی یاد ہوں گے۔ نثر لکھتی ہے اور خوب لکھتی ہے۔ جلالائے عصمت چغتائی کی طرز مستعمل دیرینہ شگفتہ جبیں ایسی کہ اس عفیفہ کا تصور کرنے سے غم کوسوں دور بھاگ جائیں۔"(۳۰)

نور سدید کے انشائیوں میں تحریف نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ لیکن "غالب کے نئے خطوط" میں اس کے عناصر زیادہ اور نمایاں ہے۔ انہوں نے ان خطوط میں مرزا غالب کی پیروی کا حق پورا ادا کیا۔ اکثر مقامات پر اُن کے خطوط کو پڑھتے ہوئے گماں ہوتا ہے کہ شاید مرزا غالب اُسی کاٹ، طنز اور شگفتہ پیرائے میں مخاطب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب کی نثر بالخصوص خطوط کے اسلوب کی ہر ایک معاصر اور بعد میں آنے والے ادیب نے کوشش کی تھی لیکن اس قدر کامیابی نہیں ملی کہ الگ سے اُن کی پہچان بنے۔ انور سدید نے اس گروہ میں شامل ہونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے نہ صرف غالب کے اسلوب کی پیروڈی کی بلکہ موضوعات کو بھی اپنایا اور اس کاوش میں کامیاب رہے۔ انہوں نے اس تقلید میں محض روایتی انداز میں اختیار نہیں کیا بلکہ انہوں نے غالب سے واقفیت کے لیے وسعت مطالعہ اور مشاہدہ سے کام لیتے ہوئے اُسے سمجھا اور اُس کے بعد غالب کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے فہم و ادراک اور جانکاری کے بعد اس انداز میں پیروڈی کی کہ اُن کے خطوط تحریف نگاری میں ایک عمدہ اضافہ اور نمونہ کی صورت میں ادب کا خزینہ بن گئے۔ جس کی نظر سے بھی یہ خطوط گزرے ہر کسی نے اقرار کیا کہ انور سدید نے رنگ غالب کو اپنانے کی جو کامیاب کوشش کی وہ اس میں کامیاب ٹھرے لہجے اور آہنگ کے ساتھ انصاف کرنے میں کامران رہے جس کا تاثر ہمیں غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اگرچہ اُن کا انداز کلی طور پر اپنانا مشکل امر ہے لیکن تقلید میں انور سدید نے کمال مہارت سے کام لیا ہے۔ مختلف ناقدین نے اس کا جائزہ باریک بینی سے لیا ہے اور وہ تسلیم کرتے ہے کہ اُن کے تمام خطوط میں رنگ غالب بہت ہی نمایاں واضح انداز میں جھلکتا ہے۔ جس سے انور سدید خود واف ہے کہ وہ ایک بہت ہی عظیم شخصیت جو ہر دورے شاعر اور ادیب کے لیے مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہے جو قافلہ سخن کا سالار عظیم ہے۔ انور سدید کی اس تصنیف کو اکابرین ادب نے بہت پسند کیا اور پذیرائی ملی ہے۔ اُن کی یہ تصنیف ادبی طنز و مزاح کا بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے ان خطوں میں اُن کے تخلیقی جوہر متاثر کن ہے۔ سب سے زیادہ ایک پہلو جو کہ اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب میں ہم عصر ادب کے بعض پہلوؤں کو بہت خوشگوار انداز میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ادب کی ہر صنف میں طنز و مزاح کے عناصر ضرور ملتے ہیں۔ غالب کے مکتوبات میں ہمیں طنز و مزاح کی فراوانی ملتی ہیں۔ مرزا غالب کے مکتوبات کی پیروی کرتے ہوئے انور سدید نے بھی غالب کے نئے خطوط میں مزاح کو دلکش انداز میں پیش کیا اور اس کے ذریعے شگفتگی پیدا کی ہے۔ غالب کے نئے خطوط کی پیروڈی میں انور سدید کسی کی پیروی نہیں کرتے بلکہ اس روایت کے خود موجد ہیں۔ اُنہوں نے غیر مانوس الفاظ و تراکیب کو تھوڑے بہت تصرف کے ساتھ ایک نئی روش میں

لائے اور اصل کی جذباتیت کا تجزیہ پیش کرتی ہے۔ اُن کی یہ تحریف غالب کی خطوط کی پیروڈی ہے۔ جو کہ اردو ادب میں اہمیت کی حامل ہیں۔ جس کا اسلوب زبان زد خاص و عام ہے۔ انور سدید نے اُن کے خطوط کے مقابلے میں "غالب کے نئے خطوط" کے عنوان سے اضافہ کیا۔ اس تحریف میں اُن کا مقصد سنجیدہ ہے اور غالب کے اسلوب سے وابستگی اور قدر و قیمت میں صدی بعد بھی اُن کے خطوط کے اسلوب کی اہمیت واضح کیا۔ اُن کی یہ پیروڈی خطوط اپنی رواں دواں کیفیت ڈرامائی انداز اور اظہار بیان کے سادگی کے باعث اس درجے مقبول ہوئے کہ ادب کی صنف "تحریف نگاری" میں ایک خوبصورت اضافہ کیا ہے۔ الغرض دیگر اصناف کی طرح تحریف نگاری کے فن میں بھی انور سدید نے اس تصنیف میں یکتائی کا مظاہرہ کیا ہے۔

(ت) ڈاکٹر انور سدید کی خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کا فنی و فکری جائزہ:

ڈاکٹر انور سدید نے خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری میں روایت کی پاسداری کی ہے۔ انہوں نے خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری میں ادبی روایت کو مستحکم انداز میں فروغ دیا۔ ادب میں اصنافِ شعر ہوں یا اصنافِ نثر ہر عہد سابقہ عہد کی اسی انحراف اور بغاوت سے ادب میں اپنی پہچان اور شناخت قائم کرتا ہے۔ ان میں چند ایک روایتی خاکہ کی تکنیک اور اسلوب کے کامیاب نمونے ہیں۔ مگر زیادہ تر روایت سے ہٹ کر ایسے شخصیت نامے بن گئے ہیں۔ جن میں بعض میں شخصی اوصاف اور بعض میں فنی اور بیشتر میں شخصی اور فنی اوصاف کی آمیزش نے روایتی خاکہ کے برعکس ایک نئی صنفِ نثر کو جنم دیا۔ غلام الثقلین نقوی نے اُن کی شخصیت نگاری کو "رابطہ" کی اصطلاح تفویض کی اور خاکہ کی روایت سے انحراف کر کے "رابطہ" کے تحت ادباء کی شخصیت کو خوبصورت مضامین میں پیش کیا۔ زیر نظر مقالہ میں اُن کے خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کے محترم چہرے، قلم کے لوگ، ادیبان رفتہ، نقوش رفتگاں، زندہ لوگ، تجھے ہم ولی سمجھتے، یاد نامہ (وزیر آغا)، مولانا صلاح الدین احمد، فن اور شخصیت، بانو قدسیہ، فن اور شخصیت، اُردو ادب کے خوابیدہ ستارے اور سعید صورتیں مجموعوں کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

ڈاکٹر انور سدید کے خاکوں اور شخصیت ناموں کا "محترم چہرے" کے عنوان سے کتاب نفیس اکیڈمی، اُردو بازار، کراچی سے شائع ہوئی۔ "محترم چہرے" میں اُردو ادب کی سولہ نامور شخصیات کے شخصیت نامے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے بھرپور زندگی گزاری، خط و کتابت اور کتابوں پر تبصرے کے علاوہ شخصیت نگاری میں بھی کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ اُن کی کتاب "محترم چہرے" میں ایسی عظیم شخصیات ہیں جو کہ انور سدید کے حلقہ

احباب میں سے تھے۔ اس مجموعہ میں ہمارے عہد کی اُن منتخب شخصیتوں کے بارے میں معلومات اور فن کا ذکر ہے جن کا ادبی حلقوں میں احترام کیا جاتا ہے۔ جن کے ادب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ انور سدید صاحب نے ان ادیبوں کی شخصیات کو موضوع بنایا ہے لیکن اس طرح کہ اُن کے ادبی کارناموں کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں شخصیات کے خدوخال ہی نظر نہیں آتے بلکہ اُن کی ذہنی اور تخلیقی سرگرمیوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے معاصرین کی نثری اصناف تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ شاعری میں بھی اُن کی دسترس کمال کی تھی۔ وہ ایک خاص کیفیت، کثرت اور تواتر سے لکھتے ہیں۔ اس صورت میں ڈاکٹر انور سدید سے کسی خاص صنفِ ادب کے سارے فنی آداب اور تقاضوں کو برتنے یا ملحوظ رکھنے کی توقع کرنا یا اُمید رکھنا، بعید از انصاف ہے۔ اُن کی تصنیف "محترم چہرے" میں شخصیت نگار کے خدوخال، اُن کے عصب اور عطاء، ان کے تعرض اور تعشیق، اُن کے تعلق اور تعصب، سب ہی کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ خاکہ نگاری میں اُن کی ڈرامائی تکنیکی اسلوب قاری کو ممدوح کی شخصیت پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ انور سدید نے امتیاز علی تاج، احسان دانش، صلاح الدین احمد، طاہر فاروقی، ممتاز حسین، حفیظ جالندھری، مجید احمد، واہ رے شیخ نذیر، ابن انشاء، آغا محمد باقر، جعفر طاہر، عزیز احمد، محمد احسن فاروقی، سید صفدر حسین، ممتاز شیریں اور محمد حسین شوق کے شخصیت ناموں میں انور سدید نے خاکہ نگاری کو نئے رنگ و روپ سے متصف کیا۔ "محترم چہرے" کی اشاعت کے بعد ۱۹۹۹ء میں "قلم کے لوگ" شائع ہوئی۔ اس تصنیف میں اپنے عہد کے پندرہ نامور قلم کاروں کے خاکوں کو شخصیت کے سلسلے میں پیش کیا۔ اس تصنیف میں انہوں نے قلم کاروں کی فنی زندگی اور شخصی زندگی کو موضع بحث بنایا ہے۔ "قلم کے لوگ" میں خاکہ نگاری کی سب سے ضروری شرط اختصار کو ڈاکٹر انور سدید نے ان شخصیت ناموں میں مد نظر رکھا، اور اس کے ساتھ قلم کار کے فن کے ذکر کو اس حد تک رکھا کہ قلم کار کی شخصیت کو سہارا تو ملے لیکن اُن کی شخصی زندگی پر اثر انداز نہ ہو جائے۔ اس تصنیف میں خاکہ نگاری کی تکنیک، اسلوب اور اختصار کا پہلو مستحکم نظر آتا ہے۔ "قلم کے لوگ" میں واقعات اور حالات میں حسن اور دلچسپی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کتاب میں کے شخصیت نامے۔، ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر سہیل بخاری، سلمان بٹ، انور گوئندی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، غلام الثقلین نقوی، ابو الفضل صدیقی، فکر تونسوی، خواجہ احمد عباس، کنہیا لال کپور، خلیل الرحمن اعظمی، محمد طفیل، آنس معین، غلام جیلانی اصغر اور میرزا ادیب کے خاکے اور شخصیت نامے شامل ہیں۔ قلم کے لوگ کا پہلا خاکہ ڈاکٹر سید عبد اللہ کا ہے، اس خاکہ میں وہ اپنی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ

میں ایف۔ اے کا امتحان دے رہا تھا۔ لاہور کے بڑے کالجوں کے پرنسپلوں میں سے کوئی شخص پرائیویٹ طلباء کے ناموں پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ مجھ سے کسی نے کہا کہ لالہ گھمبیر دیال پرنسپل سناتن دھرم کالج سے ملو۔ میں جب وہاں پہنچا تو مجھے اپنی باری پر جب بلایا گیا تو کرسی پر سے ایک شخص اُٹھا دو دفعہ دست بستہ نمستے کہا، فارم لیا اور دستخط کر دیئے اور کہا کہ:

"کاکا جی! جب بھی کوئی کام ہو بے تکلف آجایا کرو۔ پھر بڑے انکسار سے دوبارہ نمستے کہا اور رخصت کیا۔۔۔ میں جو پندرہ روز سے بڑے بڑے پرنسپلوں کے دھکے کھاتا رہا تھا حیرت زدہ ہوا اور سوچنے لگا "شائستگی ہو تو منصب اور انکسار کا اجتماع ممکن ہے"۔ (۳۱)

ڈاکٹر سہیل بخاری کے متعلق اقتباس میں دلچسپ انداز میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہم لوگ کار میں گجرات سے سرگودھا کی طرف آرہے تھے اور سیاست کی کسی تازہ کروٹ پر بحث کرتے ہوئے اس قدر غضبناک ہو گئے تھے کہ ہماری زبانوں میں مکنت اور آنکھوں سے وحشت برسنے لگی تھی اور قریب تھا کہ ہم ایک دوسرے کی خوبصورت ٹائیوں پر جھپٹ پڑیں کہ ہم میں سے ایک صاحب نے چیخ کر ڈرائیور سے کہا کہ وہ کار روک لے۔ پھر جب کار رُک گئی تو وہ انتہائی سراسیمگی کی حالت میں دروازہ کھول کر باہر کی طرف لپکے اور سڑک پار کر گئے۔ ان کے چہرے کے کساؤ اور ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ قریب ترین جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو جائیں گے۔ ناصاحب! وہ تو سیدھے کھیت کی پنڈھ پر پہنچے جہاں دو دیہاتی ایک غلیظ سا حقہ لیے بیٹھے تھے اور پھر ان دیہاتیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر وہیں پتلون ٹائی سمیت فرشِ خاک پر بیٹھ گئے اور حقے کے لذیذ کش لے کر دُز دیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگے۔ یکایک مجھے یوں لگا میرا اُن سے کبھی تنازعہ ہوا ہی نہیں تھا ۔۔۔۔ چنانچہ ڈاکٹر سہیل بخاری واپس آئے تو حقہ نوشی کے اس عملی مظاہرے نے وزیر آغا کی ساری قوتِ مدافعت سلب کر لی تھی۔" (۳۲)

انور سدید کی اس تصنیف میں ڈاکٹر انور سدید نے سب شخصیت نامے خاکہ نگاری کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہیں اور ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی اُپج کے آئینہ دار ہیں۔ "ادیباں رفتہ" بھی ڈاکٹر انور سدید کی اُن

پسندیدہ شخصیات کے بارے میں ہے جو اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں۔ ادیبانِ رفتہ میں شامل کچھ شخصیات اُن کی کئی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ "سعید صورتیں"، "محترم چہرے"، "رندہ لوگ"، "نقوش رفتگاں" میں کئی شخصیات کے مضامین ان کتب میں مشترک ہیں۔ ادبیان رفتہ میں شامل شخصیت ناموں کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں۔

> "ادیبان رفتہ" میرے قلمی خاکوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل "محترم چہرے" اور "قلم کے لوگ" کے عنوانات سے چند اہل قلم سے میری ذاتی اور مطالعاتی ملاقاتوں کا احوال شائع ہوا تو اربابِ ادب نے اس کی پذیرائی کشادہ نظری سے کی لیکن اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اپنے "ادبی ایجنڈے" میں خاکہ نگاری کو شامل کرنے کے باوجود میں اس کی طرف وری توجہ مبذول نہیں کر سکا تاہم جب کوئی ادیب اس جہان فانی سے اچانک رخصت ہو جاتا ہے تو میں شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ ادب کے افق سے جو ستارہ ٹوٹ کر عدم کی وسعتوں میں کھو گیا ہے، اس کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی، بلاشبہ زندگی کا ارتقاء جاری ہے اور نئی نسل سے متعدد نئے ستارے طلوع ہوئے ہیں اور رونقِ کہکشاں بھی قائم ہے۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک ٹوٹے ہوئے تابناک ستارے کا خلا کبھی پورا نہیں ہوا۔ میرے یہ آنسو رسائل میں بکھرے پڑے تھے۔ میں آغا امیر حسین صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے جلیل القدر رسالہ "سپوٹنک" میں ان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔"(۳۳)

"ادیبان رفتہ" کے مطالعے سے منفرد واقعات اور انکشافات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انداز تحریر اس قدر دلکش کہ شخصیت سے ملنے اور ملاقات کرنے کا گمان ہوتا ہے۔ ان میں موجود ۲۵ مضامین پر انہوں نے نہ صرف ادبی شخصیات کے ادبی خدمات اور فکر و فن پر بات کی بلکہ نجی زندگی کے دلچسپ واقعات کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح کے غلام الثقلین نقوی کے فارسی استاد ڈاکٹر جمشید علی راٹھور کی زندگی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب ڈاکٹر جمشید علی راٹھور مرے کالج سیالکوٹ تدریس کے فرائض سر انجام دینے کے لیے گھر سے پیدل آیا کرتے تو جیب میں چاول کے دانے بھر کر لاتے تھے اور اگر راستے میں جہاں کہیں بھی انہیں

چیونٹیوں کے بل نظر آتے تو اُن پر مٹھی مٹھی چاول بکھیرتے جاتے تھے۔ انہوں نے ان مضامین میں بعض شخصیات کے اخلاقی پہلوؤں کو بھی واضح کیا۔ ایک اور رفیق کار قیوم اعتصامی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اُنہوں نے بہت سی بلیوں کو پال رکھا تھا اور اُن کی خوراک کا بیڑا بھی خود اُٹھا رکھا تھا۔ جب اُن کی وفات ہوئی تو میں نے اُن بلیوں کو فرطِ نم سے کر لاتے دیکھا۔ انور سدید نے اس تصنیف میں شامل خاکے اور شخصیت ناموں میں منفرد اسلوب اپنایا۔ زندگی کے واقعات سے نئے نئے انکشافات بیان کیے۔ "ادیبان رفتہ" کی شخصیت قابل مطالعہ ہے۔ یہ اُن انسانی اخلاقی قدروں کے محافظوں کے خاکے ہیں جو اس دنیا سے اب رحلت فرما گئے ہیں۔ "نقوش رفتگاں" کو بھی کلاسیک، لاہور، مطبع سپوٹنک پرنٹرز، لاہور نے جون ۲۰۱۰ء کو شائع ہوا۔ بلاشبہ انور سدید شخصیت نگاری میں کمال فن رکھتے ہیں۔ اُن سے جس کی بھی ملاقات ہوئی وہ گویا اُن کی تحریر میں قید ہو گیا، اس کتاب میں اپنے دوست اور احباب کے ساتھ ساتھ وزیر آغا سے وابستہ احباب کو بھی خصوصی طور پر اپنی تحریروں کا مرکز بنایا۔ "نقوش رفتگاں"، آسی ضیائی رام پوری، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، پریشان خٹک، جعفر بلوچ، خاطر غزنوی، خواجہ افتخار، خلیل الرحمان داؤدی، خیال امروہوی، رالف رسل، رحمن مذنب، سعادت حسن منٹو، سعید ملک، سہیل احمد خان، شان الحق حقی، شبنم روحانی، شفیق الرحمان، صابر کلوروی، طالب ہاشمی، عابد علی عابد، عبد اللہ خان نصر (علیگ)، عبد السلام نیازی، غلام الثقلین نقوی، غلام جیلانی اصغر، فخر الدین بلے، فیض احمد فیض، قتیل شفائی، قیصر بارہوی، کیفی جامپوری، منیر نیازی، سید معین الرحمان، مقبول عامر، میرزا ادیب اور وحید عشرت جیسے ادبی شخصیات کے شخصیت نامے شامل ہیں۔ انہوں نے ان شخصیت ناموں میں ۳۶ اپنے دوست احباب اور وزیر آغا کے رفیق کاروں کی علمی و ادبی خدمات کو احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔ انور سدید ان شخصیت ناموں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "میں نے "نقوش رفتگاں" میں ادب کی ان شخصیات کو یاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو اُفق ادب سے اچانک رخصت ہو گئیں۔ یہ ادب کے وہ ستارے ہیں جو زندگی میں عقل و دانش کی روشنی پھیلاتے رہے اور دنیا سے اُٹھ گئے تو ان کا غبارِ نور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم ان سے روشنی بے نوا حاصل کر رہے ہیں۔ آنے والی نسلیں بھی ان سے استفادہ کرتی رہیں گی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو نشست کسی ادیب نے عقبیٰ کو روانہ ہو کر خالی کی ہے اس پر بعد میں ہمیں ان کے پائے کا ادیب بیٹھا ہوا نظر نہیں آتا بل کہ حقیقت شاید یہ بھی

ہے کہ ان کے معیار اور درجے کا ادیب پیدا ہی نہیں ہوا۔۔۔۔۔ اپنے مشاہیر کو بھلا دینے والی قومیں دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتیں اور اس میں کیا شک ہے کہ ہم بھی ترقی معکوس کے دور سے گزر رہے ہیں اور یہ ان مشاہیر کو فراموش کرنے کا ہی نتیجہ ہے۔ جن کے کارناموں کو ہم نے نشان راہ نہیں بنایا۔"(۳۴)

"زندہ لوگ" مقبول اکیڈمی، لاہور سے ۲۰۰۸ء کو شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے عہد کے نامور شخصیات جو کہ زندہ تھے اور علم و ادب کے چراغ کو روشن کیے ہوئے تھے۔ اُن کے شخصیت نامے لکھے۔ اس کتاب میں کچھ شخصیات ایسی بھی ہیں جو رحلت فرما گئے تھے لیکن انور سدید نے اُن کی ادبی خدمات اور کارناموں کی بدولت زندوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے انور سدید کے انسان شناسی کا پہلو کمال فن کی صورت میں ملتا ہے۔ کتاب میں۔، آغا اشرف، آغا بابر، آفتاب احمد (ڈاکٹر)، آفتاب نقوی (ڈاکٹر)، آنس معین، اخگر سرحدی، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری اکبر آبادی، اقبال عظیم، برکت علی (چوہدری)، جیلانی بی۔ اے، حامد علی خان (مولانا)، حسن اختر ملک (ڈاکٹر)، حمید نسیم، خورشید گیلانی (صاحبزادہ)، دلیپ سنگھ، رحمان مذنب، ریاض احمد، ساغر جعفری، سراج منیر، سعادت حسن منٹو، سلمان بٹ، سید انور، سیدہ حنا، شان الحق حقی، شمیم احمد، صفیہ آغا، ظفر پیالی، ظہیر الدین، علی سردار جعفری، شریف کنجاہی، صلاح الدین ندیم، عبد الوحید (خواجہ)، غلام جیلانی اصغر، غلام حسین ذوالفقار، غلام رسول (ازہر)، غلام علی چوہدری (ڈاکٹر)، فدائے اَدب تونسوی، فروغ احمد (پروفیسر)، فہیم اعظمی (ڈاکٹر)، قراۃ العین حیدر، محمد حنیف رامے، محمد سعید دہلوی (مرزا)، مقبول عامر، مولوی صاحب، میرزا ادیب، نظیر صدیقی، نعیم صدیقی، وارث سرہندی اور یزدانی جالندھری کے شخصیت نامے شامل ہیں۔ انور سدید نے ان شخصیت کے ادبی کارناموں کا مطالعہ گہرائی سے کیا اور ادب میں اُن کے مقام اور مرتبہ کو نمایاں کیا ہے۔ اس کتاب میں موجود ہر شخصیت میں معتبر ہے اور ان شخصیات کے مطالعے سے اپنی راہوں کا تعین بھی کر سکتا ہے۔ "تجھے ہم ولی سمجھتے" رحمان مذنب ٹرسٹ نقوش پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر انور سدید نے رحمان مذنب کی شخصیت اور فن کو "تجھے ہم ولی سمجھتے" کے عنوان سے کتابی صورت میں پیش کیا۔ مفتی عزیز الرحمٰن المعروف رحمٰن مذنب نے ادب کے مختلف اصناف افسانہ، تنقید، ڈرامہ، ناول اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ادب میں منفرد حیثیت کی حامل شخصیت اور حقیقی دانش ور تھے۔ اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کا زمانہ ایک زمانہ معترف ہے۔

انور سدید نے اُن کی شخصی عظمت کے اعتراف میں یہ کتاب تصنیف کی۔ احباب کی طرف سے خطوط کو بھی اس تصنیف میں شامل کیا گیا ہے۔ جن احباب کے خطوط کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اُن میں حامد علی خان ،نور الحسن ہاشمی، حکیم یوسف حسن، عبد الرحیم شبلی، شاہد احمد دہولی، سید عابد علی عابد، غلام رسول ازھر، سید عبد اللہ، ڈاکٹر وزیر آغا، ممتاز مفتی، مرزا ادیب، مجیب الرحمن شامی، سید قاسم محمود، افضل پرویز اور ستار طاہر شامل ہیں۔ انہوں نے ادب کے مختلف گوشوں میں بڑے انہماک کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل اہل علم و دانش اور محققین کے مضامین سے اُن کی ادبی خدمات اور شخصیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انور سدید کی اس تصنیف میں اُن کی حقیقی اور افسانوی زندگی کو ایک آئینے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ شخصیت نویسی کے باب میں یہ کتاب ایک بہترین اضافہ اور اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے وزیر آغا کی تخلیقات پر متعدد مضامین تحریر کیے ہیں۔ شام کا سورج، وزیر آغا ایک مطالعہ ، وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام ، مکالمات جیسی شاہکار تخلیقات بھی تصنیف کی ہیں ۔ یادنامہ ۔۔۔۔ وزیر آغا، ڈاکٹر وزیر کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں معاون کتاب ہے۔ اس کتاب کو جمہوری پبلیکشنز، لاہور نے ۲۰۱۵ء میں لاہور شائع کی ہے۔ یادنامہ میں وہ مضامین شامل ہیں جو انور سدید نے اُن کی وفات کے بعد مختلف اوقات میں شائع کیے۔ ڈاکٹر انور سدید کی کثیر الجہت شخصیت اُردو ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ بالخصوص شخصیت نگاری میں اُن کی خدمات منفرد ہیں ۔ وزیر آغا کی شخصیت پر اُن کا کام ایک ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تصنیف میں درج مضامین میں وزیر آغا سے دلی وابستگی اور جذباتی کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف وزیر آغا کی ادبی زندگی کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔ بلکہ انور سدید کی وزیر آغا شناسی کا ادراک بھی بخوبی نظر آتا ہے۔

"مولانا صلاح الدین احمد شخصیت اور فن " یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۱ء کو مولانا صلاح الدین احمد " شخصیت اور فن " انجمن ترقی اُردو، کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ دوسرا ایڈیشن " پاکستانی ادب کے معمار " مولانا صلاح الدین احمد: فن اور شخصیت اکادمی ادبیات، اسلام آباد سے ۲۰۰۸ء سے شائع ہوئی۔ مولانا صلاح الدین احمد انور سدید کے پسندیدہ شخصیت تھے۔ انور سدید نے اُن کے فن سے اُن کی شخصیت کو پرکھا۔ اس کتاب میں مولانا صلاح الدین احمد فن اور شخصیت پر غیر مطبوعہ پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ سے بھی استفادہ کیا۔ یہ کتاب انور سدید کی انتھک محنت اور مشقت کی مثال ہے۔ انہوں نے مولانا صلاح الدین احمد کے حالات زندگی، واقعات اور مختلف رسائل و جرائد میں اہل علم و دانش اور محققین کے تنقیدی مضامین کو مرتب کر کے اُن کی

علمی و ادبی خدمات اور شخصیت کا مقام و مرتبہ کا تعین کیا۔ اُن کی تحریر سے یہ بات واضح طور پر نمایاں ہوتی ہے کہ مولانا صلاح الدین اُن کی پسندیدہ شخصیت تھے۔ اُن کے اسلوب سے حد درجہ عقیدت مندی، محبت اور شگفتگی کا پہلو نمایاں ہے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے متعدد تصنیف میں مولانا صاحب کا تذکرہ ملتا ہے اور انہیں محسن اُردو اور پاکستانی ادب کا معمار بھی قرار دیا ہے۔ اس کتاب کے پیش نامہ میں چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان افتخار عارف کتاب کی اہمیت اور مؤلف کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "ڈاکٹر انور سدید اُردو کے بہت نمایاں اور ممتاز تنقید نگار ہیں۔ انہوں نے اکادمی ادبیات کی درخواست پر "پاکستانی ادب کے معمار" کے سلسلے کی کتاب " مولانا صلاح الدین احمد: شخصیت اور فن " لکھ کر بہت بڑی خدمت سر انجام دی ہے۔ یہ کتاب مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت اور فن کو متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے، سمجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوں گی۔"(۳۵)

ڈاکٹر انور سدید نے "مولانا صلاح الدین احمد: شخصیت اور فن " مولانا کی شخصیت کے نمایاں پہلو اجاگر کرنے کے بعد "مولانا کی ادبی زندگی اور خدمات " کے عنوان کے تحت مولانا کی شاعری، ماہنامہ، "ادبی دنیا" ادبی اداریہ نگاری، تبصرہ نگاری، تراجم، قومی زبان اُردو، ترقی پسند تحریک اور اکادمی پنجاب کے ذیلی عنوانات کے تحت مولانا کی ادبی زندگی اور خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

" بانو قدسیہ: شخصیت اور فن "کتابی سلسلے پاکستانی ادب کے معمار جو کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین افتخار عارف نے شروع کیا تھا۔ یہ اُن کی اس سلسلے کی ایک اہم کاوش تھی۔ یہ تصنیف ۲۰۰۸ء اکادمی ادبیات پاکستان سے شائع ہوئی۔ بانو قدسیہ اُردو کی ایک عہد ساز افسانہ نگار، رجحان ساز ناول نگار، ممتاز ڈرامہ نگار اور دانش ور تھیں۔ انہوں نے "راجہ گدھ "جیسا بڑا ناول لکھ کر اُردو ادب کو بے حد ثروت مند بنایا۔ اُن کی تخلیقات نے معاشرے پر مثبت اقدار کے حوالے سے غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے۔ انور سدید اُردو ادب کے بہت نمایاں اور ممتاز تنقید نگار ہیں۔ انہوں نے اکادمی ادبیات کی درخواست پر پاکستان ادب کے معمار کے سلسلے میں کتاب " بانو قدسیہ: شخصیت اور فن " لکھ کر اُن کی شخصیت اور فن کو متعارف کرانے اور اُن کے کام کو سمجھنے سمجھانے میں معاون کا کردار ادا کرنے کی اہمیت رکھتی ہے۔ اس تصنیف میں بانو قدسیہ کی شخصی پہلوؤں کے ذریعے ان کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بانو قدسیہ کی فن اور فکر کو سمجھنے کے حوالے سے یہ کتاب

سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید پیش لفظ میں بانو قدسیہ کی شخصیت اور فن پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"محترمہ بانو قدسیہ اُردو افسانے، ناول اور ڈرامے کی ایک معتبر تخلیق کار ہی نہیں، وہ فکری اور تہذیبی زاویوں سے ایک منفرد دانشور بھی ہیں۔ وہ معاشرتی مسائل پر فرد مندانہ انداز میں افسانے لکھتی ہیں اور اپنی مثبت نظریاتی جہت سے اُردو ادب کے قارئین کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کے افسانے گنجینہ حیات کا طلسم کھولتے ہیں، ان کے ناول انسانی زندگی کے باطن میں اتر کر حقیقت کے پوشیدہ روپ کو منظر پر اُبھارتے ہیں اور اُن کے ڈرامے معاشرے میں پرورش پانے والی مختلف اقسام کی آویزشوں کو تحرک و تاثر سے ہمارے سامنے جلوہ آرا کر دیتے ہیں۔ انہوں نے "داستان سرائے" کی تنہائی میں بیٹھ کر بظاہر ایک داستان گو کا فریضہ ادا کیا، لیکن در حقیقت انہوں نے ایک ماہر نباض کی طرح معاشرے کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھنے کی کاوش کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے فن کی جہت مثبت ہے اور وہ ایک ایسی مصلح بھی ہیں جو اپنے نظریات کسی پر مسلط نہیں کرتیں، لیکن قاری کی سوچ کو آزاد فضا میں پرواز کی دعوت ضرور دیتی ہیں۔ بلاشبہ انہیں ایک مفکر کہانی نگار کا درجہ حاصل ہے۔ آزادی کے بعد پاکستان سے رونما ہونے والے افسانہ نگاروں میں اُن کا درجہ بہت بلند ہے اور انہوں نے کہانی کے فن کو اس طرح رفعت آشنا کیا کہ اب انہیں پاکستانی ادب کا ایک دقیع، باعظمت اور باوقار معمار تسلیم کیا جاچکا ہے، اور ان کا احترام تمام ادبی حلقوں میں کیا جاتا ہے۔ چناں چہ اب وہ اُردو ادب کی بانو قدسیہ سے سب کی بانو آپا بن گئی ہیں۔"(۳۶)

بانو قدسیہ کی تخلیقات کی فکر و فن کے سمجھنے میں یہ کتاب معاونت کرتی ہے۔ انور سدید نے بانو قدسیہ کے فکر و فن کا جائزہ لے کر اُن کے فن و فکر کے مطالیب، مفاہیم اور معنویت کو ایک منفرد انداز میں واضح کیا ہے جو کہ اُن کی قابل قدر کاوش ہے۔

"اُردو ادب کے خوابیدہ ستارے" اپریل ۲۰۱۶ء کو نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ فنی تدوین خورشید ربانی نے اور نگرانی پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے کی تھی۔ "اُردو ادب کے خوابیدہ

ستارے" میں ۲۵ نامور ادیبوں کے بارے میں ایک معلوماتی دستاویز ہے۔ انہوں نے ،ڈاکٹر احمد عقیل روبی ،افتخار اجمل شاہین ،انجم رومانی ،ڈاکٹر انعام الحق کوثر ،اے حمید ،ڈاکٹر داؤد رہبر ،حفیظ تائب ،خالد احمد ،رشید حسن خان ،ڈاکٹر سہیل احمد خان ،ڈاکٹر شفیع عقیل، شبنم شکیل ،پروفیسر صابر لودھی ،ڈاکٹر صدیق جاوید ،ظفر قریشی ،عبد العزیز خالد ،ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ،ڈاکٹر فہیم اعظمی ،فیض احمد فیض ،گفتار خیالی ،محمد عالم مختیار حق ،مظفر وارثی ،ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اورڈاکٹر عبد المغنی کی ادبی خدمات پر تخلیقی مضامین شامل ہیں۔اس کتاب میں اُن تمام مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ جو مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے تھے۔ یہ کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن کے اس سلسلے کی کڑی ہے جو نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف علم و دانش اور اس سے وابستہ اہم شخصیات سے متعلق کتب کی اشاعت کے لیے تحقیقی کاوش تھی۔ انور سدید نے ۲۵ خوابیدہ ادیبوں کی وفات پر جو مضامین لکھے اُن کو کتابی صورت میں تشکیل دے دیا تھا۔ اُن کے مضامین کی خوبی ہے کہ انہوں نے ہر شخصیت کی زندگی کے احوال و واقعات اور ادبی خدمات منفرد انداز تحریر میں اس طرح پیش کیا کہ اُن کے تمام تر پہلوؤں کا مکمل جائزہ ملتا ہے۔ اُن کے فکر و فن اور ادبی سرمایے پر اُن کا تجزیہ اظہار رائے مستحکم دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"سعید صورتیں" تصنیف ۲۰۰۹ء کو دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ "سعید صورتیں" ۱۹ اہلِ علم و دانش کے بارے میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ "سعید صورتیں" خاکوں یا شخصی مضامین کی حامل کتاب ہے۔ "سعید صورتیں" میں ان شخصیات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ جن سے قریبی تعلقات نہیں تھے لیکن اُن کی شخصیت اور خدمات کا دل میں بے پناہ احترام موجود تھا۔ لہٰذا مصنف نے ملاقاتوں کی کمی کو مضمون یا خاکہ لکھنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں سمجھا بل کہ اُن کی شخصیت، خاندان اور ادبی ماحول کے اکثر زاویے اور ادبی کاموں کے چنیدہ تذکرے نہایت شخصی انداز اور دوستانہ تپاک سے پیش کر دیئے ہیں۔ شان الحق حقی کے احوال و آثار کے مفصل تذکرے اور جائزے کے بعد انور سدید نے اس بات کا اعتراف کیا کہ:

> "میری محرومی ہے کہ مجھے شان الحق حقی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے زیادہ مواقع نہیں ملے۔ دسمبر ۱۹۸۸ء میں سرکاری ریٹائرمنٹ سے قبل میں نے تمام وقت ادب کے مراکز سے دور گمنام بستیوں میں گزارا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور میں مستقل قیام کی صورت پیدا ہوئی اور کراچی جانے کے امکانات پیدا ہوئے تو حقی صاحب سے ملاقات کا شرف بھی

حاصل ہوا۔ ایک طویل ملاقات مشفق خواجہ صاحب کے کتب خانے میں
ہوئی جس میں متعدد ادیب موجود تھے۔ اس لحاظ سے میں ان کا شناسا ضرور
تھا۔ لیکن قریب کا ملاقاتی نہیں تھا، میں نے اُن کے فن اور شخصیت کا مطالعہ
"اُردو نامہ" کے علاوہ اُن کی کتابوں سے کیا اور میرے لیے یہی حوالے کے
ماخذات ہیں۔ میرے دل میں اُن کی نیاز مندی کا گوشہ موجود ہے۔"(۳۷)

"سعید صورتیں" ادیبوں اور کتابوں کے ایسے تعارف و تذکرے پر مبنی کتاب ہے کہ جس میں ماضی قریب کا سارا ادبی ماحول میسر ہے۔

خاکہ نگاری اُردو کی معروف صنف ادب ہے۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی اور اس کی پرورش بیسویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ خاکہ نگاری دیگر اصناف کے مقابلے میں ایک نئی صنف ادب ہے۔ خاکہ نگاری میں موضوع کی تخصیص نہیں ہے۔ ادب میں زیادہ تر ایسی شخصیتوں کے خاکے لکھے گئے ہیں جو فنون لطیفہ، بالخصوص ادب، شاعری یا کسی بھی شعبہ حیات میں نمایاں مقام رکھتے ہوں۔ اُردو ادب میں اس صنف ادب کے کوئی اصول و ضوابط متعین نہیں تھے۔ ہر ادیب نے اسے اپنے پیش روؤں کے تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے فن کی صورت گری کی ہے۔ انور سدید نے بھی خاکہ نگاری کی روایت کی پاسداری کی ہے۔ اُن کے خاکوں کے چار مجموعے ہیں۔ محترم چہرے، قلم کے لوگ، ادیبان رفتہ، زندہ لوگ۔ ان مجموعوں میں کل ۶۲ ادیبوں کے خاکے اور شخصیت نامے تحریر کیے۔ انور سدید نے اس صنف میں بھی اپنے قلم اور تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ انور سدید نے ان خاکوں میں شخصیت کے ظاہری پہلوؤں اور کرداری نقشہ کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ دیگر اصناف کی طرح خاکہ نگاری میں بھی اُن کے ہاں فنی خوبیاں نمایاں ہیں۔ اُن کے خاکوں میں ایک روایتی خاکہ کی تکنیک اور اسلوب کے کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ مگر زیادہ تر خاکے روایت سے انحراف کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن میں بعض شخصی اوصاف کے حامل اور اکثر فنی و شخصی اوصاف کی آمیزش نظر آتے ہیں۔ سوائے چند ایک خاکوں کے دیگر شخصیت نامے نظر آتے ہیں۔

انور سدید نے کل تقریباً ۲۰۰ سے زائد ادیبوں کے شخصیت نامے تحریر کیے۔ انور سدید کا طریقہ کار تھا کہ جب بھی وہ کسی ادیب کی کوئی کتاب پڑھتے تو اس کے فکر و فن سے اس کی شخصیت کا مطالعہ کرتے۔ اُن کا مشاہدہ انتہائی وسعت کا حامل تھا۔ شخصیت نگاری پر بے پناہ کام اُن کی انتھک محنت اور وسیع مطالعہ کا ایک واضح ثبوت تھا۔ کچھ شخصیات جو اُن کے حلقہ احباب میں تھے اُن کی تمام تحریروں کا نہ صرف مطالعہ کرتے بلکہ

حافظے میں محفوظ کر لیتے تھے۔ خطوط کے ذریعے باہمی رابطے اور ملاقاتوں کے احوال بھی اُن کو یاد رہتے اُن کا حافظہ بلا کا تھا۔ ادب کے ہر ایونٹ کو دماغ میں ریکارڈ کر لیتے تھے۔ اُن کی شخصیت ناموں کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انور سدید زبان و ادب کے تمام گوشوں سے دلچسپی اور بے لوث ادبی معاصرین کے لیے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اُن کی شخصیت تنقیدی نظریات کے حوالے سے متنازع رہی ہے۔ اکثر ادیب اُن پر وزیر آغا کے تنقیدی نظریات کی پرچار اور حد درجہ عقیدت مندی اور جانبداری کا الزام لگاتے ہیں۔ لیکن اُن کی اُردو ادب میں شخصیت نگاری سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ نظریاتی کشمکش کے شکار ضرور تھے لیکن دوسروں کی ادبی خدمات اور نظریات کا احترام اور اعتراف کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ اُن کے ہاں تعصب کا پہلو کہیں نظر نہیں آتا۔ اُن کی شخصیت نگاری سے دو اہم پہلو واضح طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

۱۔ انہوں نے کسی ادیب، شاعر سے عدم شناسائی یا ملاقات کا نہ ہونا کبھی جواز نہ بنایا۔

۲۔ اپنے کسی معاصر ادیب کے لیے دل میں موجود اچھے تاثرات کے واضح اور مفصل اعتراف، بناوٹ اور مبالغہ آرائی سے پاک اظہار میں کبھی بخل اور مصلحت سے کام نہیں لیا۔

اُن کی تمام تر شخصیت نگاری کی تصانیف اور مضامین میں یہ خصوصیات فراوانی سے ملتی ہیں۔

انور سدید کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، علمی و ادبی سفر میں اُن کا بہت سی شخصیات سے واسطہ پڑا انہوں نے مشاہدے اور مطالعے کو اپنی آپ بیتی یا اسی نوعیت کی کسی اپنی تحریر میں مقید نہیں کیا بلکہ معاصر ادیبوں کے احوال، خدوخال، فکر و فن کے باریک باریک عناصر کو اپنی ملاقاتوں اور مطالعوں کی بنیاد پر نمایاں کیا اور معاصر ادب کے لیے کسی قسم کی رنگ آمیزی کے بغیر سہولت کے لیے رکھ دیا ہے۔ انہوں نے ادیبوں، شاعروں اور اہل علم و دانش کے، اپنے مطالعے سے اور مطالعات کو، ملاقاتوں سے اثبات، توسیع اور عمیق فراہم کی۔ شخصیت اور علم و فن کی آمیزش سے حفظ مراتب کر کے پورے احساس و لحاظ کے ساتھ نہایت شائستہ و شگفتہ اسلوب میں پیش کیا۔ جس سے اُن کی شخصیت نگاری کے اسلوب میں کہانی کا لطف، دلچسپی کا عنصر اور انشائیے کی لطافت محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر اچھی بات رویے اور عمل کو فروغ اور استحکام دیا اور کسی قسم کی ناہموار بیانیہ، تضحیک یا مضحک واقعات کا سہارا نہیں لیا بلکہ یادداشت، مطالعاتی وسعت اور رواں دواں بیانیہ اسلوب اختیار کیا۔ اُن کی شخصیت نگاری کا مطالعہ کرنے سے یہ اُن کی شخصیت بھی منکشف ہوتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے عموماً اُن شخصیات کو موضوع بنایا۔ جن سے خیر، علم، فن اور عرفان کی کوئی کرن ان کے بطن تک بھی پہنچی ہے۔ اُن کی تصانیف میں علم و فن کے استعارے کا اعتراف اور اظہار احسان مندی کے اظہار کی

متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ عام طور پر جب کسی شخصیت پر لکھا جاتا ہے یا جس سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ شخصیت نگار یا سیرت نگار عموماً اپنے محس و حربی سے تعلق کے اظہار میں مداح نگاری اور بے جا عقیدت مندی سے کام لیتا ہے۔ لیکن انور سدید کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے شخصیت نگاری میں صاف شفاف اسلوب پیش نظر رکھا۔ انور سدید اپنے ممدوح کو روشنی کے دائرے میں لانے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔ اس حوالے سے "سعید صورتیں" میں نظیر حسین زیدی پر لکھے مضمون میں موجود ہیں۔ قارئین ذیل میں ان نکات سے طریقہ کار اور مراحل سے آگاہ ہو سکتے ہیں جن سے انور سدید شخصیت نگاری پر مضامین لکھتے ہوئے گزرتے تھے۔

۱۔ انور سدید اپنے شخصی مضامین میں ادیبوں اور شاعروں کو ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ اُن کی کتابوں سے بھی دریافت کرتے ہیں۔

۲۔ مصنفین پر اظہار خیال تب کرتے ہیں جب ان کی تصنیف یا تصانیف ان سے باہم کلام ہوتی ہیں۔

۳۔ کچھ شخصیات پر صرف ایک مضمون یا مقالہ لکھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی تو اس پر لکھنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

۴۔ آسمان ادب سے ٹوٹے ہوئے "ستاروں کی دریافت نو" کو اپنا ادبی فریضہ سمجھتے ہیں اور اِس فریضے کو ادا کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتے۔

اُن کے شخصیت نامے معلوماتی فراوانی سے لبریز ہے۔ لیکن اُن کے انداز بیان نے معلومات کی فراوانی کی وجہ سے اسلوب کو بوجھل اور خشک ہونے نہ دیا بلکہ دلچسپی کے پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر خوش کن تاثر دیتے ہیں اور قاری کو مطالعہ کے لیے راغب کرتے ہیں۔ اُن کے شخصیت ناموں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شخصیات کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ معاصر ادبی صورتحال بھی آشکار ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں شخصیات کے سب پرتوں اور شخصیت و فن کے بدلتے منظروں کو سلیقے اور ہنر مندی سے پیش کیا۔ الغرض انور سدید اپنے طرز، طور اور اسلوبیاتی تکنیک اور طریقہ کار کی بدولت منفرد شخصیت نگار ہیں۔ انہوں نے جاندار اسلوب سے اُردو ادب میں شخصیت نگاری کو مزید مستحکم کیا ہے۔

(ٹ) ڈاکٹر انور سدید کی جائزہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ:

جائزہ کے لغوی معنی جانچ، حاضری، گنتی اور شمار کے ہیں۔ جائزہ لینا کا مطلب، معنی جانچنا، پڑتال کرنا یا حاضری لینا کے ہیں۔ اُردو ادب میں جائزہ نگاری کا اصطلاحی مفہوم ہے کہ کسی زبان کے ادیبوں کی سال بھر کی تحریروں کو شمار کرنا اور اُن پر بقدر ضرورت رائے دینا "ادبی جائزہ" کہلاتا ہے اور اس قسم کے ادبی کام کو "جائزہ نگاری" سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ سلیم آغا قزلباش جائزہ نگاری کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "سالانہ ادبی جائزہ نگاری دریا کو کوزے میں بند کرنے کا عمل ہے۔ لیکن میرے خیال میں ادب کا سالانہ جائزہ ادیبوں کا پورے ایک سال پر پھیلا ہوا "عمل نامہ" ہے۔ جس سے اُن کی تخلیقی اور ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ بھی ہے۔ جس میں اہل قلم اپنی نگارشات کا چہرہ دیکھ کر آئندہ کے لیے اپنا تخلیقی لائحہ عمل مرتب کر سکتے ہیں اور اسے اپنی سالانہ رپورٹ بھی قرار دے سکتے ہیں۔"(۳۸)

اُردو ادب میں جائزہ نگاری کی روایت اُردو ادب کی کہانی کلاسیکی دور سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک کے تذکروں میں ملتی ہے۔ ان تذکروں کا سلسلہ میر تقی میر سے شروع کر محمد حسین آزاد تک پہنچتا ہے۔ ان تمام تذکروں میں ادب اور ادیب کو موضوع بحث بنایا گیا اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اُردو ادب کی پہلی مکمل کتاب "ہسٹری آف اُردو لٹریچر" رام بابو سکسینہ نے لکھی جس کا اُردو میں ترجمہ مرزا محمد عسکری نے ۱۹۲۹ء میں کیا تھا۔ معاصر ادب میں اُردو ادب کے سالانہ جائزوں میں دو نام بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر انور سدید اور دوسرے ڈاکٹر سلیم اختر ہیں۔ اُردو ادب کے سالانہ ادبی جائزوں کی اشاعت میں ان رسائل میں سہہ ماہی رسالہ "اُردو ادب"، روزنامہ "امروز"، سہہ ماہی "ادب لطیف"، ماہنامہ "اوراق"، ماہنامہ "صریر" کا کردار انتہائی اہم رہا ہے۔ رسائل کے علاوہ، روزنامہ "جنگ اور روزنامہ "خبریں" میں اُن کے جائزے قسط وار شائع ہوتے رہے ہیں۔ انور سدید نے سالانہ ادبی جائزے کے سلسلے کا آغاز ۱۹۷۸ء میں کیا۔ مرحوم حسن رضوی نے ۱۹۷۸ء میں پہلی مرتبہ انور سدید کے سالانہ جائزے کو شائع کیا۔ روزنامہ جنگ میں اشاعت کا یہ سلسلہ گیارہ سال تک جاری رہا۔ روزنامہ جنگ کے بعد ڈاکٹر انور سدید اسے ماہنامہ "صریر" کے صفحات پر لے گئے۔ انور سدید کے سالانہ ادبی جائزے نئے جائزے ۱۹۸۹ء، ادب کہانی ۱۹۹۶ء، مزید ادبی جائزے ۲۰۰۳ء اور جائزہ اُردو ادب ۲۰۰۷ء کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔" نئے جائزے "اُردو ادب ۱۹۷۸ء سے

۱۹۸۸ء تک کے جائزے جو جنگ اخبار میں شائع ہوئے تھے، انور سدید نے کتابی صورت میں قومی پریس، لاہور سے نومبر ۱۹۸۹ء کو شائع کی۔ اس کتاب میں ہر سال کا جائزہ اصناف وار ترتیب سے ملتا ہے۔ انہوں نے ہم عصر ادب کا مطالعہ بڑی محنت سے اور مشقت سے کیا اور اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اُن کی ادبی جائزوں میں اس کا احاطہ اس طرح کیا کہ عہد میں ادب کے رجحانات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اُردو ادب ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، غزل ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، نظم ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، افسانہ ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، ناول ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، ڈرامہ ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، انشائیہ ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء ، طنز و مزاح ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، سفر نامہ ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، خاکہ نگاری ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، تنقید ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، تحقیق ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، یاد نگاری ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، ملاقات نگاری ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، سوانح عمری اور خود نوشت ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، متفرقات ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، مذاکرے ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، رسائل و جرائد ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء، کالم نگاری ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء اور رفتگان ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۷۸ء شخصیت نامے سمیت کل گیارہ ادبی جائزے ملتے ہیں۔ جو کہ اُن کے پہلے معیاری جائزہ "پاکستان میں اُردو افسانے کے بیس سال" فروری ۱۹۶۸ء میں اوراق میں شائع ہوئے۔ ادبی حلقوں میں اُن کی خوب پذیرائی ہوئی۔ یہ اس تحریکی سلسلے کی کڑی ہے۔ جب ان جائزوں سے قبل ۱۹۷۱ء کے افسانوں اور شاعری کا سالانہ جائزہ "اوراق" میں ۱۹۷۲ء کو شائع ہو چکا تھا۔ "نئے ادبی جائزے" میں پاکستان اور بھارت میں لکھے جانے والے ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اُن کے جائزوں میں معاصر ادب اور ادیبوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اُن کے جائزوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے نئے لکھنے والوں کی ادبی تخلیقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نئے ادیبوں کی تخلیقات کے تذکرے نے ادب کے فروغ میں حوصلہ افزائی کے تاثر کو پروان چڑھایا اور اعتماد تخلیق عطا کرنا مقصود نظر آتا ہے۔ نئے لکھنے والوں کے فن کے اس اعتراف نے انہیں مزید لکھنے اور ارتقاء کا اگلا قدم اُٹھانے کا حوصلہ دیا اور اُردو ادب کو متعدد نئے ادبا میسر آگئے ہیں۔ سلیم آغا قزلباش انور سدید کے جائزہ نگاری کے فن پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "ڈاکٹر انور سدید ایک انجینئر بھی ہیں اور انجینئرنگ کا ایک اصول یہ ہے کہ کسی چیز کو تعمیر کرنے سے پہلے اس کی لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کا مکمل نقشہ کاغذ پر منتقل کر دیا جائے اور پھر اسی نقشے کی پیروی کی جائے۔ انور سدید نے انجینئرنگ کے اس اصول کو ادب اور تنقید میں کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ وہ کسی موضوع پر قلم اُٹھانے سے پہلے اس کا نقشہ تیار کر لیتے ہیں، جائزہ

نگاری میں بھی وہ اس قسم کا خاکہ پہلے بناتے اور اس خاکے میں اصناف کے حوالے سے رنگ بھرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اَدب کا سالانہ جائزہ لکھنے سے قبل وہ سال بھر میں منصہ شہود پر آنے والی تخلیقات کے مقام اور حیثیت کا پورا نقشہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ سال بھر تیاری کرتے اور حوالے مرتب کرتے ہیں۔ ہر نئی تخلیق پر تاثر لکھتے ہیں اور ضروری تراشے فائل میں جمع کرتے جاتے ہیں۔ اس مواد کی اساس پر وہ سالانہ ادبی جائزہ سپرد قلم کرتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے ادبی جائزوں میں ایک خاص ترتیب اور توازن کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ان میں جامعیت بھی ہے اور وسعت بھی۔۔۔۔۔۔ اور ان سب کی وجہ سے اُن کے جائزوں کی توقیر میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔"(۳۹)

اِن جائزوں میں انور سدید کا ادبی نقطۂ نظر واضح دکھائی دیتا ہے۔ انور سدید جائزہ نگاری کے بنیادی تقاضوں اور اوصاف سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کے ہمدردانہ رویے، متوازن تنقیدی نقطۂ نظر، غیر جانبدارانہ انداز نے اُن کی تحریروں میں دلچسپی کا عنصر نمایاں کیا ہے۔ جس سے مطالعہ کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے تخلیقات کا مطالعہ محنت سے کیا اور تخلیق کے نفس مضمون اور بنیادی جوہر تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی ہے، ان کا قوت مشاہدہ، مطالعے کی وسعت، لگن، اعلیٰ ظرفی اور جوہر کو تلاش کرنے کی تنقیدی بصیرت پختہ نظر آتی ہے۔ ہر تخلیق پر رائے دینے میں کشادہ نظری دیکھنے کو ملتی۔ ہر کتاب پر مختصر مگر جامع انداز میں اس طرح تجزیہ پیش کیا جس سے ادیب کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہی تاثر اُن کی تحریروں میں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ نئے جائزے کے تقدیم میں ڈاکٹر انور سدید خود رقم طراز ہیں:

"ادبی جائزوں میں زمانی میعاد کا سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ قلیل عرصے کا جائزہ نسبتاً مفصل ہوتا ہے۔ اس میں ادبی دنیا کی معمولی لرزشوں اور بعض اوقات جزئیات کو بھی اہمیت مل جاتی ہے۔ طویل میعاد کے جائزوں میں تخلیقات اور مصنفین میں انتخاب لازم ہو جاتا ہے۔ طویل المیعاد جائزے میں اکثر نئے لکھنے والوں کی اہم تخلیقات بھی مناسب جگہ حاصل نہیں کر سکتیں۔ چناں چہ جائزہ صرف نامور لوگوں کا تذکرہ بن کر رہ جاتا ہے۔ پانچ، دس،

بیس اور پچیس سال کے جائزوں کی افادیت ان کی میعاد کے مطابق تبدیل ہو جاتی ہے۔ میعاد جتنی طویل ہو گی ادیبوں کی کہکشاں اتنی ہی مختصر نظر آئے گی۔ اور ان میں صرف روشن ستاروں کا تعارف بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ بل کہ مستقبل میں دوام ایڈ پانے والی ادبی شخصیات کے ابتدائی یا اولین تخلیقی کاوشوں سے ملاقات کا موقعہ بھی مل جاتا ہے چناں چہ اگر یہ کہا جائے کہ سالانہ جائزہ صرف زمانہ حال کے ادبا کے تعارف و تصدیق کا فریضہ ہی سر انجام نہیں دیتا بل کہ ان کے سالانہ ارتقاء کا گراف بھی مرتب کرتا ہے اور یہ مستقبل کے ادبا اور محققین کی ضرورت سے بھی عہد بر آ ہوتا ہے تو یہ درست ہو گا۔ گارساں و تاسی نے سالانہ جائزوں کو فروغ دے کر ان کی افادیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔"(۴۰)

جائزہ نگاری کی اس تصنیف میں ایسی تخلیقات کو اہمیت دی گئی ہے جو ایک عہد کا نمائندہ ادب بھی تصور کیا جاتا ہے۔ اس تصنیف کی خاصیت تھی کہ اس میں بے ہنگم تحریریں نہیں ملتیں صرف ادبی اوصاف کی حامل تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ انہوں نے سالانہ جائزوں کو تصنیف کی شکل دے کر جائزہ نگاری کی ایک نئی راہ متعین کر دی ہے۔ جس سے اُردو ادب کے قارئین اور محققین برابر لطف اور استفادہ کر رہے ہیں۔

جائزہ نگاری کی دوسری تصنیف "ادب کہانی ۱۹۹۶ء" ستمبر ۱۹۹۸ء کو مکتبہ فکر و خیال، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ اس تصنیف میں جون، جولائی ۱۹۹۷ء سے دسمبر ۱۹۹۸ء تک کا اُردو ادب جو قسط وار "صریر" میں شائع ہوتا رہا۔ فہیم اعظمی مدیر ماہنامہ "صریر" کی تحریک پر کتابی صوت میں شائع کیے۔ اس میں انہوں نے ۱۹۹۷ء سے ۱۹۹۸ تک نظم، تجزیاتی مطالعے، غیر ملکی زبانوں کی نظموں کے تراجم، غزل، ہائیکو، ترائی لے، سانیٹ، ماہیا، دوہا، گیت، اخذیات، رباعی، دینی شاعری، مرثیہ، نثری نظم، شاعری کی کتابیں، اُردو نثر، افسانہ، ناول، انشائیہ، طنز و مزاح، سفر نامہ، تنقید، تنقید کی کتابیں، شخصیت اور خاکہ نگاری، سوانح اور خود نوشت، یاد نگاری، اقبالیات، غالبیات، خطوط، اداریے، رسائل، کالم، ملاقات، مرحومین، من آنم، تعارف نامہ، ایک شجر (خاکہ) مشتاق احمد اور معاصرین ادب کا ایک طویل جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد میں بدلتے موضوعات۔ فن اور تکنیک کا جائزہ بڑے احسن طریقے سی بیان کیا ہے۔ جو کہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کی خوبی تھی کہ انہوں نے اپنے جائزوں میں معاصر ادب کے ہر صنف پر خوب لکھا ہے۔ اُن کی تحریروں

اور وسیع مطالعہ کی وجہ سے ان پر ہمیشہ یہ گمان رہتا ہے کہ اس قدر مطالعہ اور پھر تجزیہ و تنقید لکھنا جادوئی لگتا ہے۔ لیکن اصل میں یہ سب اُن کے ذوق اور لگن کی وجہ سے تھا۔ اُن کے جائزے ان کی انتھک محنت اور ادب کے لامحدود وسعت کا اشاریہ ہوتا ہے۔ اُن کے جائزوں میں ادبی تخلیق و تصنیف سے لے کر ادبی صحافت تک کا تذکرہ موجود ہے۔ انور سدید اپنی جائزہ نگاری کی مقصدیت اور کاوش کو درج ذیل نکات میں پیش کرتے ہیں۔

"۱۔ پرانے لکھنے والوں کو یہ احساس ہو کہ انہیں پڑھا جارہا ہے۔

۲۔ نئے لکھنے والوں کو معلوم ہو کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں جارہی اور ادب کو طغیان آسا کرنے میں ان کی تخلیقات بھی شریک عمل ہیں۔

۳۔ سال بھر کی دستیاب مطبوعات اور تخلیقات کا ذکر ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔"(۴۱)

انور سدید نے مقصدیت کے ان نکات کو پیش نظر رکھ کر قارئین کی ادبی تشنگی رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ انور سدید جائزہ نگاری میں جہاں فقید المثال محنت اور ژرف نگاہی سے کام لیتے ہیں، وہاں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی ادیب کی کاوش کا ذکر رہ نہ جائے، خواہ وہ تخلیق کسی معروف ادیب کی ہو یا غیر معروف کی۔ معروف ادیب سے وہ اختلاف بھی کرتے ہیں لیکن اس کے نام پر خط تنسیخ نہیں پھیرتے۔ اسے یاد ضرور رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر سے بوڑھے خون میں ایک دو چلو خون کا اضافہ ضرور کر دیتے ہیں اور نو آموز ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی وہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ اگلے سال وہ پہلے سے کہیں بہتر تخلیقات پیش کرتے ہیں۔ وہ کسی رسالے کو نظر انداز نہیں کرتے جہاں انہیں اچھی چیز نظر آتی ہے وہ اسے وہاں سے موتی کی طرح چن لیتے ہیں۔ ان کے جائزے کے توسط سے ایک سال میں لکھے جانے والے بہت سے اشعار زندہ جاوید ہو جاتے ہیں۔ طلبہ اگر انہیں یاد کر لیں تو بیت بازی کے مقابلے جیت سکتے ہیں۔ نقاد انہی مضامین میں اقتباس کر سکتے ہیں۔ ان کے جائزوں سے اب کئی کتابیں مرتب ہونے لگی ہیں۔ "مزید ادبی جائزے" کی اشاعت ۲۰۰۳ء میں ہوئی۔ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی نے وزارت ثقافت و اُمورِ نوجوانان پنجاب کی مالی اعانت سے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا تھا۔ اس کتاب میں ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۵ء تک سالانہ جائزوں کو مرتب کیا گیا ہے۔ تنقیدی و تحقیقی مقاصد کے لیے اس کتاب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب میں موجود ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۵ء تک کا اُردو ادب،، اُردو شاعری، نظمیں، غزلیں، نعت، ہائیکو، گیت، دوہے، ماہیئے، قطعات، رباعی، ثلاثی، فردیات،

نثری ،شاعری،نثری تخلیقات ،افسانہ ،ناول ،انشائیہ ،طنزومزاح ،تنقید ،غالبیات ،اقبالیات ،خاکہ نگاری ،ملاقات نگاری، یاد نگاری، آپ بیتی، سفر نامہ ،کالم نگاری، اداریئے، شعری مجموعے، تحقیق پر تنقیدی آراء ملتی ہے۔ یہ جائزے ماہنامہ "صریر" میں تحریر کیے گئے تھے۔ ان ادبی جائزوں میں جہاں اُن کا وسیع مطالعہ ، تنقیدی بصیرت اور دل کش اسلوب جھلکتا ہے وہاں دو اہم عناصر بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ پہلا عنصر یہ ہے کہ انہوں نے جائزہ نگاری کو محض ادبی کتب کے جائزوں تک محدود نہیں کیا بل کہ کشادہ نظر ہو کر اُن ادیبوں کی تخلیقات کو بھی جائزہ نگاری کے گل دان میں سجا دیا ہے۔ جن کی اکا دکا تحریریں ہی ادبی رسائل میں چھپی تھیں۔ ان میں سے اکثریت نئے لکھنے والوں کی ہے۔ اب وقت ہی بتائے گا کہ ان میں سے کتنے کندن بن کر باہر نکلتے ہیں۔ تاہم انور سدید نے ان کی پوری حوصلہ افزائی کی ہے۔ دوسرا اہم عنصر کسی صنف کے حوالے سے جائزہ لینے سے قبل اُس کے مجموعی رجحان یا تاثر کو پیش کرتا ہے۔ اس کتاب میں ۷ سال کے سالانہ جائزے ہیں۔ جو کہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئے، ان جائزوں میں انور سدید کا اندازِ بیاں منفرد ہے، سہل اور سلیس انداز تحریر میں مشکل سے مشکل بات کو بھی آسانی سے کہہ دیتے ہیں۔ بڑی بحث کو مختصر جملوں میں بیان کیا ہے اور تلخ حقائق کو شائستہ و شگفتہ اسلوب میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان جائزوں میں سادگی و پرکاری کے ساتھ ایجاز اور اختصار بھی موجود ہے۔ "جائزہ اُردو ادب" انور سدید کی جائزہ نگاری سلسلے کی چوتھی کتاب ہے، اس تصنیف میں ۱۹۹۸ء کے سالانہ جائزے شامل ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۰۸ء کو مکتبہ فکروخیال، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں موجود فہرست کے مندرجات، تجزیاتی مطالعات غیر ملکی، نظموں کے اُردو تراجم، غزلیں ،اُردو تراجم، غزلیں، افسانے، ناول، انشایئے، طنز و مزاح، سفر نامہ، تنقید، شخصیت نگاری، خاکہ نگاری، سوانح، خود نوشت، اقبالیات ،غالبیات ،ڈرامہ ،خطوط ،اداریئے ،رسائل ،کالم نگاری اور ملاقات نگاری ہیں۔ اس عہد میں ادب کا پورا نقشہ موجود ہے۔ یہ جائزے اُن کی جہد مسلسل اور اُن کی ادبی شغف کا نمونہ نظر آتے ہیں۔ مجموعی طور پر انہوں نے ہر عہد کو گہرے ادراک سے پرکھا اور اس پر اپنی رائے کا تعین کیا ہے۔ اُن کی اُردو ادب میں جائزہ نگاری کے فروغ اور ارتقاء میں ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اُن کی جائزہ نگاری کے مطالعہ کرنے سے اُن کے تین مستحکم پہلو نظر آتے ہیں۔

۱۔ مصروفیات کے باوجود ہر سال اپنے مطالعہ اور تجزیہ کو وسعت دی۔

۲۔ تجزیہ نگاری کی انتھک محنت، ذوق اور لگن بدرجہ اتم موجود تھا۔

۳۔ اُردو ادب کے ارتقاء کا بصری و ذہنی تاثر کا موجود ہونا۔

پروفیسر ڈاکٹر ناصر عباس نیئر انور سدید کی جائزہ نگاری کے فن کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"انور سدید جائزہ نگاری کی شعریات کا گہرا ادراک رکھتے اور روبہ عمل لاتے ہیں۔ وہ اسے ادبی تاریخ کا متبادل بنانے کے بجائے ادبی تاریخ کے بنیادی مواد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایک معیاری جائزے کا بنیادی وصف ہی یہ ہے کہ وہ آنے والے زمانے کے ادبی مؤرخ کو مستند مواد فراہم، اس کی سمت نمائی بھی کرے۔ یہ وصف جائزے کو کتابیات اور خالص تخلیق سے بھی ممیز کرتا ہے۔ کتابیات و تحقیق میں فقط مستند مواد ہوتا ہے، سمت نمائی کا عمل نہیں ہوتا۔ انور سدید کے زیر نظر جائزے میں سمت نمائی کا یہ عمل اُن کی تنقیدی بصیرت کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔"(۴۲)

اُن کی جائزہ نگاری کا بنیادی وصف یہ ہے کہ اُن کا رویہ ہمدردانہ، تنقیدی نقطہ نظر متوازن ہے۔ انہوں نے ادب کی کہکشاں میں جلنے والے ہر ادیب پر اس کے تخلیقی تحرک کے مطابق ہی نگاہ ڈالی ہے دوسری خاص بات کہ اُن کی قوت مشاہدہ اور جوہر کو تلاش کر لینے کی پختہ ناقدانہ صلاحیت ہے۔ وہ مقناطیس کی طرح جوہر قابل کو اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ اس کا ذکر کشادہ پیشانی اور فراوانی سے کرتے ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں زمانہ کی بے اعتنائی کی وجہ سے دھول اور مٹی میں گم ہو جانے والے لعل و جواہر کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔ اور ایسی تخلیقات کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ جن تک ہماری رسائی پہلے نہیں تھی۔ اُن کی جائزہ نگاری کا یہ حاصل بے حد مثبت ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا ادبی نقطہ نظر اُن کے جائزوں کے عقب میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس ادب کے اہم پہلو مشاہدے میں آتے ہیں اور ادب میں مختلف پنپنے والے رجحانات کی نشاندہی ملتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی، معاشرتی معاشی اور نفسیاتی عوامل جن سے ادیب کی تخلیقات نے اثر قبول کیا۔ یا جو ادیب کو مختلف زاویوں سے سوچنے پر اُبھارتے رہتے ہیں۔ اُن کا ایک خاکہ بھی ان جائزوں ے ہمارے ذہنوں پر مرتسم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی جائزہ نگاری اُردو تنقید کی ایک اہم شاخ ہے، اُن کے سالانہ ادبی جائزوں میں قابل مطالعہ ہونے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ اُن کے جائزوں میں غیر جانبدارانہ مطالعے اور تخلیقی عمانیت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ انور سدید نے ادب کی اس جہت کو خلوص، لگن، استقلال، جامعیت، توازن اور بے لاگ رویے کی بدولت بیسویں صدی میں اس کو مستحکم انداز میں فروغ دیا ہے۔ ان کے جائزے ادب میں نہایت قابل قدر چیز تصور کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اُردو کے معروف و معتبر

نقاد ہیں۔ ان کا منفرد اسلوب تحریر، ان کے مطالعے، مشاہدے اور متبحر علم کی شہادت دیتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا تنقیدی رویہ مثبت اور غیر جانب دار ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں، خصوصاً جائزوں میں اختصار و تلخیص، توضیح و ابلاغ کا نعم البدل ہوتے ہیں۔ اس طرح عام قاری کے لیے ان کے یہ جائزے نہایت دقیع و مفید ہوتے ہیں۔ اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور ذوق کی تربیت ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں سالانہ ادبی جائزوں کی اہمیت اس لیے بڑھ گئی ہے کہ وقت کی برق رفتار تبدیلیوں نے معاشرے کے ہر فرد کو مصروف کر دیا ہے۔ ایک عام آدمی کے برعکس ادیب اور نقاد کے لیے سال بھر کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ایک مشکل امر بن گیا ہے۔ ادبی جائزہ ادبی کام کی رفتار اور نہج کا اندازہ لگانے میں مدد دیتا ہے اور کم وقت میں معاصر ادب کے بارے میں وافر معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس بنا پر ادبی جائزوں کو تخلیق غایا ادب پیما بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ انور سدید نے ۱۹۶۲ء سے ۲۰۰۸ء تک ادبی سلسلہ جائزہ نگاری جاری رکھا اور ادبی خدمات سر انجام دیں۔ انہوں نے جائزہ نگاری کو ایک صنف ادب کا درجہ دیا ہے اور اس کے فنی رموز بھی خود متعین کیے ہیں۔

(ث) ڈاکٹر انور سدید کی ادبی کالم نگاری کا فنی و فکری مطالعہ:

ڈاکٹر انور سدید کا شمار اُردو زبان و ادب کے معماروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک نامور محقق، ممتاز نقاد، بلند پایہ مؤرخ، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، طنز و مزاح، خاکہ نگاری، سفر نامہ نگاری، شاعری، تبصرہ نویسی، دیباچہ نگاری، جائزہ نگاری اور بطور کالم نگار ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ادبی حلقوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیئر ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں بیان کرتے ہیں کہ:

> "ڈاکٹر انور سدید کے تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی کارناموں کی وسعت اور تنوع کے سرسری جائزے سے آدمی خود کو ایک حیرت کدے میں محسوس کرتا ہے۔ کچھ لوگ ادب کے احسان مند ہوتے ہیں کہ ادب انہیں پہچان عطا کرتا ہے اور کچھ لوگوں کا ادب احسان مند ہوتا ہے۔ انور سدید ان لوگوں میں سے ہیں جن کا اُردو ادب احسان مند ہے۔" (۴۳)

ڈاکٹر انور سدید کے علمی و ادبی خدمات کی لاتعداد جہتیں ہیں۔ جن کا آسانی سے احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ انہوں نے کثیر الجہت اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف ادب کو تنقید اور تحقیق کی نگاہ سے پرکھا۔ قومی اور بین الاقوامی سطح کا ادب کا مطالعہ ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ انور سدید بطور کالم نگار ادبی حلقوں اور اُردو دان طبقے میں نمایاں ترین پہچان رکھتے ہیں۔ علمی و ادبی زندگی کے آغاز سے لے کر وفات تک کالم نگاری سے وابستہ رہے

۔ان کی ادبی زندگی میں اخباری کالموں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کے بارے میں اس پہلو پر گراں قدر معلومات ملتی ہیں۔

اقبالیات، اقبال کے کلاسیکی نقوش، اقبال شناسی اور ادبی دنیا، اقبال شناسی اور اوراق اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، اُردو ادب میں انشائیہ، اُردو ادب کی تحریکیں، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، کلاسیکی شعراء کتب میر انیس کی اقلیم سخن، غالب جہاں، میر انیس کے قلم رو تر میم اضافہ شدہ، تنقید کتب، فکر و خیال، اختلاف، کھر درے مضامین، نئے ادبی نظم کے ار با اربعہ، خطوط کے آئینے میں، مشفق خواجہ ایک کتاب، اُردو ادب کی تحریکیں، تقریباً اسی (۸۰) سے زائد تنقیدی، علمی و ادبی کتب لکھیں۔ تصانیف و تالیف کے علاوہ ادبی اور صحافتی رسائل میں کالم نگاری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اُردو ادبی کالم نگاری کا عالمی ادب کا بھی شغف رکھتے تھے اور انگریزی رسالے پاکستان ٹائمز، دی سٹیٹس مین کراچی ہفتہ وار جریدے سے منسلک رہے۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں پر حکومت پاکستان نے انھیں تمغہ امتیاز سے نوازا۔

ڈاکٹر انور سدید ادبی صحافت میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ روزنامہ مشرق، جسارت، حریت، خبریں، نوائے وقت اور ایکسپریس سے وابستہ رہے۔ روزنامہ مشرق لاہور ہفتہ وار ادبی کالم سدیدیات ۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۹ء اور روزنامہ جسارت، کراچی ہفتہ وار ادبی کالم، دید و باز دید، ۱۹۹۳ء تا ۲۰۰۳ء روزنامہ حریت، کراچی ہفتہ وار ادبی کالم بہ نام سدیدیت ۱۹۸۵ء تا ۱۹۸۹ء، روزنامہ خبریں، لاہور، ادبی کالم، دبستان ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۸ء روزنامہ نوائے وقت ہفتہ وار ادبی کالم ادب نامچہ، ۱۹۹۹ء تا ۲۰۱۶ء منسلک رہے تھے۔ اس کے علاوہ نوائے وقت میں کتابوں پر تبصرہ ہفتہ وار کالم ۱۹۹۹ء سے ۲۰۱۶ء تہذیبی کالم، گفتنی ۱۹۹۹ء سے ۲۰۱۶ء تک کالم نگاری کرتے رہے جن میں ہفت روزہ، فیملی میگزین، تہذیبی کالم، قومی سیاست ۱۹۹۹ء سے ۲۰۱۶ء ہفت روزہ، ندائے ملت، لاہور ہفتہ وار ادبی کالم، ادب در ادب۔ ۲۰۰۴ء تا ۲۰۱۶ء ہفت روزہ ندائے ملت لاہور، ہفتہ وار ادبی کالم، طرفہ تماشا، ۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۷ء اور ماہنامہ، قومی زبان، کراچی، کچھ وقت غیر ملکی کتابوں کے ساتھ، ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۵ء تک وابستہ رہے۔ اُردو کالم نگاری کے علاوہ انگریزی کالم نگاری بھی کی اور پاکستان ٹائمز، لاہور ہفت روزہ ادبی کالم ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۵ء اور دی سٹیٹس مین (ویکلی) کراچی ہفتہ وار ادبی کالم ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء تک کالم نگاری کرتے رہے تھے۔

۱۹۸۹ء میں صحافت کی پذیرائی اور بہترین کالم نویسی کی بناء پر کالم نویس کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مرحوم ادیبوں پر ان کے لکھے ہوئے تعزیتی کالموں کے دو مجموعے، ادیبان رفتہ اور زندہ لوگ، چھپ چکے

ہیں۔ انور سدید کے کالموں میں طنز و مزاح کی چاشنی اور تحریر میں شعریت اور بات سے بات پیدا کرنے کی خوبی موجود تھی۔ روزنامہ جسارت میں مرحوم ابو الفضل صدیقی (اپنی طرز کے افسانہ نگار) کے نام سے لکھا جس میں ایک اجلاس کے احوال کو یوں بیان کرتے ہیں:

"ہم نے انہیں اہل قلم کانفرنس میں دیکھا تھا۔ کھانے کی میز سجی تھی ادبائے کرام انواع و اقسام کے کھانوں سے یوں نبرد آزما ہوئے تھے، جیسے پانی پت کے میدانوں میں مغل لودھیوں کے ساتھ نبرد آزما ہوئے تھے۔ ہر ادیب اس کھانے کو زندگی کا آخری کھانا سمجھ کر جھپٹ رہا تھا۔ ابو الفضل صدیقی خالی پلیٹ تھامے ایک طرف کھڑے تھے اور دیر تک کھڑے رہے تا کہ آنکہ ادبائے کرام نے پسپائی اختیار کی اور کھانے سے بھری ہوئی اور میزیں ان کا منہ چڑانے لگیں۔ تب ابو الفضل صدیقی صاحب نے تھوڑا سا سلاد ڈالا اور کچھ دہی لیا، تھوڑا سا سالن ڈالا اور نصف نان لے کر ایک طرف ہو گئے۔ ایک ترقی پسند نے پوچھا، صدیقی صاحب۔ بس اتنا کھانا؟ وہ اطمینان سے بولے، ہاں! زندہ رہنے کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے، پھر کہنے لگے انسان کا ظرف کھانے کی میز پر سامنے آتا ہے لوگ کھانے کے لیے زندہ ہیں زندہ رہنے کے لیے نہیں کھاتے۔"(۴۴)

بیان اقتباس میں ظاہری طور پر ایک احوال ہے لیکن بے ساختہ جملوں اور طنز و مزاح نے تحریر کو لطیف بنا دیا۔ ان کے کالموں میں ادبی عنصر نمایاں ہے۔ اگرچہ نظریاتی کشمکش، رنجش اور سیاست سب کچھ تھا مگر دوسروں کے آرا اور ادبی خدمات کا اعتراف بھی موجود تھا۔ جس سے اُردو ادب میں ایک غیر معمولی تحرک تھا۔ جسارت میں احمد فراز کی وطن واپسی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"اکادمی ادبیات پاکستان میں احمد فراز صاحب کی آمد پر کچھ لوگوں نے مسرت کا اظہار کیا تھا۔ اس مسرت میں خود ہم بھی شامل تھے۔ وجہ یہ تھی کہ نئی ملازمت پر فائز ہونے سے احمد فراز نے پاکستان کی افواج کے لیے ایک ولولہ انگیز نظم لکھی تھی پاک فوج کو خراج عقیدت ادا کیا تھا، دوسرا انہوں نے جونیجو صاحب کے دور حکومت اور جنرل ضیاء الحق کے دور صدارت میں اپنی ملک بدری کے تمام واجبات وصول کر لیے تھے، اپنا عہدہ بحال کر لیا تھا۔

جونیجو صاحب بر طرف نہ ہوتے اور ضیاء الحق حادثے میں وفات نہ پاتے تب بھی احمد فراز کسی بڑے عہدے پر اپنی سنیارٹی کے باعث فائز ہوتے۔ محترمہ بے نظیر سریر آرائے حکومت ہوئی تو احمد فراز نے اپنی شاعری سے مزاحمتی پہلو بر آمد کیا ہم ان کی اس اتحاد کے بھی قائل ہوئے۔ دیکھا کہ ہر آن پخت شاعر نے اپنا دیوان ہاتھ میں اُٹھار کھا ہے اور اس میں مزاحمتی شاعری بر آمد کر کے نئی حکومت سے انعام کا طلب گار ہے۔ یہ نئی تحریک احمد فراز کی بدولت اُردو ادب میں آئی۔ اس محرک شخصیت کو استحقاق حاصل تھا کہ وہ اکادمی ادبیات کا چیئرمین مقرر ہو۔ ہماری اس رائے کو معمر شاعر نے جو خود بھی آئی۔جی۔ آئی حکومت کے وظیفے پر پل رہے تھے اپنے بیان سے تقویت دی کہ اکادمی کو ایک شاعر چیئرمین نصیب ہوا ہے۔ اس پر خوشی کے شادیانے بجانے چاہئیں۔ سو ناظرین کرام! شادیانے بجانے والوں میں ہم بھی شامل تھے۔ ہم نے اکادمی کے نئے چیئرمین کو مبارک باد کا خط لکھا اور گزارش کی کہ سابق چیئرمینوں نے ادیبوں کی بہبود کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اب آپ کچھ کر کے دکھایئے۔ چیئرمین صاحب نے ہماری مبارک باد کا شکریہ ادا کیا اور ہماری توقعات پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ افسوس کہ ان کی ملازمت کی مدت ختم ہو گئی۔۔۔۔۔۔"(۴۵)

ڈاکٹر انور سدید کے کالم ادبی نوعیت کے ہیں۔ ان کے کالموں میں زود نویسی، انشائیہ نگاری اور طنز و مزاح کا عمدہ تاثر ملتا ہے۔ ایک اور کالم مشتاق احمد یوسفی کی ایک شام، لاہور کے نام، میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

"شگفتہ فکر مشتاق احمد یوسفی لاہور کم آتے ہیں تو باتیں اتنی کرتے ہیں کہ ان کی اگلی پچھلی کسر پوری کر دیتے ہیں۔ وہ خود بولتے ہیں اور دوسروں کو اپنے کان سماعت کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ہم نے مؤدبانہ پوچھا، حضرت یہ کیا بات ہوئی کہ اپنی سناتے ہیں، دوسروں کی نہیں سنتے؟ یوسفی صاحب نے ہمیں غور سے دیکھا اور مزاح آلود متانت سے جواب دیا، لاہور والے ایک تو تعریفیں منہ پر کرتے ہیں، دوسرے جھوٹی کرتے ہیں، مری جان دونوں سے جاتی ہے، ہم نے اسے مشتاق یوسفی کی کسر نفی پر محمول

کیا اور سوچا اپنی تعریف سننا کون پسند نہیں کرتا، یوسفی صاحب یونہی کہہ
رہے ہوں گے۔۔۔۔۔۔"(۴۶)

کالم نگاری کا اصل مقصد معاشرتی اصلاح ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عموماً کالم نگاری ہر اخبار کے مالک کی سوچ کو سلیقے اور سوجھ بوجھ سے قارئین تک پہنچانا جیسے آج کل کے کالم نگار اس فرض کو سر انجام دے رہے ہیں۔ سستی پہچان اوراس کی تشہیر کے لیے اسے ایسے اذہان کی ضرورت ہوتی ہے جو اُن کے مقاصد کو پورا کر سکیں۔ یہ سب اخبار کے مالکان کے درمیان ایک دوسرے سے منفرد طور پہچان بنانے اور غرض کے فوائد کا حصول رہتاہیں۔ یہ کام عام کالم نگار بخوبی سر انجام ے سکتے ہیں۔ لیکن اردو کالم نگاری میں انور سدید ایسے کالم نگار ہے کہ انہیں کوئی ڈیکٹیٹ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خالص ادبی اور صالح سوچ کے مالک تھے۔ اُن کا ذہن تخلیقی اور اسلوب اس قدر کمال تھا کہ مشکل سے مشکل بات کو بھی اس طرح کہہ دیتے کہ جیسے اسے ایسے ہی کہا جا سکتا تھا۔ انہوں نے مختلف اخبارات میں کالم نگاری کی اپنی تحریروں میں وہ آزاد رہے ہیں۔ اپنے بیانیے پر کیسی کی سوچ یا رویہ کو مسلط ہونے نہیں دیا۔ انور سدید خود بھی کالم نگاری کو فن صحافت کی ضرورت قرار دیتے ہے اور اُسے ادب کی صنف میں شمار نہیں کرتے۔ لیکن حقیقتت یہ ہے کہ انتظار حسین، مشفق خواجہ اور انور سدید نے صحافت میں قدم رکھا تو اپنے کالموں "لاہور نامہ"، "سخن در سخن" اور "دید و بازدید" میں ادب، ادیب اور ادبی معاشرے کو اہمیت دی اور اہل علم نے انہیں "ادبی کالم" شمار کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے سرکاری ملازمت کے دوران کالم نگاری شروع کی تھی، اس لیے انہوں نے "زود اندیش"، "قلمبر دار"، "تلسی داس گریب"، "ڈاکٹر فرنوس" اور فارقلیط وغیرہ کئی قلمی ناموں سے اخبار "جسارت"، "امروز"، "مشرق"، "حریت" میں کالم لکھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے مستقل نام سے روزنامہ "خبریں"، "نوائے وقت" میں کالم لکھتے رہے۔ انہوں نے انگریزی اخبارات "دی اسٹیٹسمین" کراچی اور "دی پاکستان ٹائمز" لاہور میں ادبی کالم نگاری کی۔ اُن کی کالم نگاری ادب کی اہم شاخ ہے جس سے اُن کی زود نویسی اور انشاء نگاری کا عمدہ تاثر پیدا ہوتا ہے اور شگفتہ اسلوب کے مظہر ہیں۔ جس میں راست بازی، خلوص و صداقت کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ موضوعات میں تنوع کے باوجود ادبی چاشنی برقرار ملتی ہے۔ ان کی رائے جچی تلی، پر استدلال اور وسعت فکر کی حامل ہے۔ خوش رنگی دلآویزی، بلند مقاصد اور فکر و خیال کا ارتقاء کے عناصر ان کے کالم میں نمایاں تھے۔ ادب کا مطالعہ، واقعات و حالات کا مشاہدہ گہرائی سے کرتے جس میں ان کے ادبی کالم میں ژرف بینی، گہرائی اور واضح انداز میں ملتی ہے۔ سادہ اور عام فہم انداز میں قاری تک اپنی فکر کو منتقل کرنے کے اثرات ان کے کالموں

میں نمایاں ہیں۔ اگرچہ ان کے ادبی کالم تھے لیکن ثقیل ادبی اصطلاحات سے گریز اور تحریر کو پر لطف بنانے اور قاری کی دلچسپی کے لیے طنز و مزاحیہ انداز اسلوب بھی اپنایا۔ ان کی تحریروں میں قناعت پسندی، معلوماتی اور اصلاحی عوامل بھی ملتے ہیں۔ ان کے تعزیراتی کالموں میں محبت، خلوص، حافظے کے نقوش اور ذہنی پختگی کے عناصر نمایاں ہیں۔ ان کی کالم نگاری صحافتی ادب میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے اپنے کالموں میں ادب، ادیب اور معاشرے کو اہمیت دی اور قومی تشخص کے حوالے سے اُردو زبان ادب کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کالم نگاری اُردو ادب میں ایک اہم شاخ ہے۔ ان کی زود نویسی اور انشائیہ نگاری کا عکس ان کے کالموں کی تحریروں میں ان کی دیگر تحریروں سے بالکل نہیں تو کسی حد تک مختلف ضرور نظر آتا ہے۔ کالموں کے موضوعات، تنوع اور وسعت فکر کے باوجود وہ بخوبی جانتے تھے کہ اخبارات کے لیے لکھی گئی تحریر ایک مخصوص طبقے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا انہوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ عام قاری کے فہم کے مطابق تھا۔ ان کے مختلف اخبارات میں موجود ان گنت کالموں سے ان کی شخصیت کے بارے گراں قدر معلومات ملتی ہیں۔ ان کی اُردو زبان و ادب کے لیے خدمات لازوال ہیں۔ اردو کالم نگاری میں انہوں نے غیر جانبداری کی روش کو فروغ دیا۔ خود داری، اخلاص اور معاشرتی اصلاح کو اپنا مشن رکھا۔ انہوں نے ضرورت اور غرض کے لیے نہیں بلکہ مکمل طور پر ادب کے فروغ کے لیے خود کو صحافت کے ساتھ وابستہ کیا۔ انہوں نے اصولوں پر مبنی صحافت کی اور مکمل ذمہ داری سے اپنے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ اُن کے کالموں میں ہمیں اعتدال، محبت، میانہ روی، اخلاص اور ہمدردی کا تاثر نمایاں ملتا ہے۔ اُن کے کالمز ادبی، علمی اور سیاسی نوعیت کے تھے۔ جس میں اُس عہد کا پورا نقشہ موجود تھا۔ اس اعتبار سے اُن کے کالمز اہمیت کے حامل ہیں۔

(ج) ڈاکٹر انور سدید کی تبصرہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ:

تبصرہ نگاری کو اُردو ادب کی جدید ترین اصناف میں شمار کیا جاتا ہے۔ تبصرہ نگاری کے ذریعے کسی کتاب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرائی جاتی ہیں۔ اُردو ادب میں اخبارات و رسائل کی اشاعت کے ساتھ ہی کتابوں پر تبصرے کا آغاز ہوا ہے۔ اس سے قبل اُردو ادب میں تقریظ اور دیباچے کی روایت تھی۔ البتہ تقریظ، دیباچہ اور تبصرہ نگاری میں فرق یہ تھا کہ تقریظ یا دیباچہ کتاب میں شامل ہوتا ہے۔ جس میں کتاب کے موضوع اور مصنف کے بارے میں تشریح و توضیح تو ہوتی ہے لیکن اس میں کتاب کے کمزور پہلوؤں سے

انحراف کیا جاتا تھا۔ جبکہ تبصرہ کتاب کی اشاعت کے بعد تحریر کیا جاتا ہے تاکہ عام قاری کو کتاب کی تفصیل معلوم ہو سکے۔ اچھا تبصرہ وہی ہوتا ہے جو قاری کو یہ باور کرا سکے کہ یہ کتاب کس حد تک اہمیت رکھتی ہے۔

لفظ "تبصرہ"، عربی زبان کے مادہ ب۔ ص۔ ر سے اخذ ہے۔ عربی زبان میں اس مادے سے کئی الفاظ بنتے ہیں۔ مثلاً بَصرَ، بَصبر کے معنی جاننا یا دیکھنا کے ہیں۔۔ جبکہ باضر کے معنی دور سے جھانک کر دیکھنا، تبصر کے معنی غور سے دیکھنا، سوچنا، غور کرنا، استبقرا اچھی طرح دیکھنا، ظاہر کرنا، اور المبصر کے معنی نگہبان ہے۔ اُردو زبان میں اس مادہ سے تین الفاظ عام طور پر مستعمل ہیں۔ ایک تو یہی تبصرہ ہے اور دوسرے "بصارت" اور "بصیرت" ہیں۔ بصارت کا تعلق ظاہر سے ہے یعنی زہر کی، عقل اور دانائی اس میں ادراک کا پہلو نمایاں ہے۔ جب کہ تبصرہ کا لفظ عام استعمال میں ہلکی پھلکی رائے کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تبصرہ کے لغوی معنی "تفصیل، تصریح، توضیح، تشریح کے ہیں۔ مذکورہ تمام لغوی معنوں کو سامنے رکھ کر ادب میں ایک مخصوص طرزِ تحریر یا صنف کے طور پر استعمال ہونے والے لفظ تبصرہ پر غور کریں تو اس میں یہ سارے معانی جزوی طور پر پائے جاتے ہیں اور اس میں ظاہر و باطن دونوں پہلوؤں کو سامنے لایا جاتا ہے۔ البتہ ظاہر کی سطح باطن کی سطح سے وسیع ہوتی ہے۔ وزیر آغا تبصرہ نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "کسی تصنیف، کلام یا واقعہ کے متعلق سرسری طور پر بحث و مباحثہ کے لیے جب رائے کا اظہار کیا جاتا ہے تو اسے تبصرہ کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کسی کتاب کے جوہر کا پتہ لگانا اور اسے اجمال یا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا اور جو کچھ کہا جائے اس سے کتاب کی اہم ترین خصوصیتیں واضح ہو جائیں۔"(۴۷)

انور سدید نے تبصرہ نگاری کا آغاز "اوراق" سے ۱۹۶۶ء میں محمد اختر کے ناول "چاکیواڑہ میں وصال" پر تبصرہ لکھا، جو کہ تبصرہ نگاری کے حوالے اُن کا حرف آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ انور سدید نے مختلف اخبارات، رسائل و جرائد میں تسلسل کے ساتھ تبصرہ نگاری کی انہوں نے اب تک ایک ہزار سے زائد مختلف ادباء کی تصانیف پر تبصرے تحریر کیے۔ زیر نظر مقالہ میں اُن کے مرتب تبصروں کی تصانیف کتب مینار، کچھ وقت کتابوں کے ساتھ، اُردو نثر کے آفاق، اُردو ناول کے رنگ اور شاعری کا دیار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

"کچھ وقت کتابوں کے ساتھ" اُردو اکیڈمی، لاہور سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں کل ۱۰۰ تبصرے شامل ہیں۔۔ ۱۹۶۶ء سے ماہنامہ قومی زبان میں "کچھ وقت کتابوں کے ساتھ" کے عنوان ماہانہ اور سالہا سال تبصروں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۳۵ سال کے دستیاب ۱۰۰ کتابوں کے تبصروں کو اس کتاب میں شامل

کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی تبصرے موجود ہیں جو اس کتاب میں شامل ہونے سے عدم دستیابی کی وجہ سے رہ گئے تھے۔ دیگر تصانیف میں اُن کو شامل کیا گیا ہے۔ تبصرہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ۱۰۰ کتابوں پر مشتمل تبصرے ایک کتاب میں پیش کر کے ادب شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تحقیقی کاوش اُن کی پنتیس سالہ جدوجہد علم دوستی اور ادب سے گہری دلچسپی کی شاہکار تصنیف ہے۔ محمد نعیم بزمی کتاب میں شامل مضمون میں اُن کی تبصرہ نگاری پر رائے لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "انور سدید چوں کہ ادب کو سنجیدہ عمل سمجھتے ہیں، لہٰذا اس کو برتنے کے سلسلے میں وہ ہمیشہ فہم وادراک کا دامن تھامے رکھنے کی وکالت کرتے ہیں اور اگر کسی زیر تبصرہ تصنیف میں کوئی مصنف غیر ادبی حربے اور غیر شائستہ زبان کے استعمال کا مرتکب نظر آئے تو پھر اس کے ساتھ ہر گز رعایت نہیں برتتے اور اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔ مگر ایسا کرتے ہوئے وہ کبھی ہذیاں سرائی کا شکار نہیں ہوتے بل کہ منطقی طرز استدلال کو اپنائے رکھتے ہیں۔"(۴۸)

جب کہ "کتب مینار" میں تقریباً ۵۲ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ مختلف موضوعات پر بے لاگ تبصرے اس کتاب میں شامل ہیں۔ یہ تصنیف کلاسیک، لاہور سے جنوری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ اور "اُردو نثر کے آفاق" میں مختلف موضوعات کی اہم کتب کو اپنے تبصرہ آپریشن میں شامل کیا ہے۔ ان کتابوں میں سے کئی ایک پر تبصرے اُن کی دیگر کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ فہرست میں شامل دیگر کتب پر ڈاکٹر انور سدید کے جائزے اور تبصرے بہت سی کتابوں کا نثری رنگ قاری کے لیے مفید ہے۔ یہ تصنیف مقبول اکیڈمی، لاہور سے ۱۹۹۵ء کو شائع ہوئی۔ اس کتاب کے عنوان سے ۱۹ صفحات پر اُردو افسانہ کے ۲۵ سال یعنی ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۲ء افسانوی تاریخ کو تاریخی حیثیت دینے کی کاوش ہے۔ اُردو نثر کی دنیا بہت وسیع ہے۔ سیرت النبیؐ، تاریخ، فلسفہ، مضمون، کہانی، لوک کہانی، حکایات، داستان، ڈرامہ، ناول، افسانہ، ڈرامہ، خاکہ، آپ بیتی، سوانح عمری، تنقید، انشائیہ، رپورتاژ، سفر نامہ، مزاح اور دیگر حوالوں سے اُردو نثر کا دامن بہت کشادہ ہے۔ عرض سدید میں ڈاکٹر انور سدید کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> "یہ کتاب نثر کے مختلف اصناف اور ان کے تخلیق کاروں کے بارے میں لکھے گئے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جب یہ مضامین رسائل میں چھپے تھے، تو

انہیں اہل ادب نے پذیرائی عطا کی تھی۔ اس تحسین نے مجھے لکھنے کی تحریک دی، مزید مطالعے کا شوق پیدا کیا۔ میرے احباب جانتے ہیں کہ اُردو ادب میں میری حیثیت ایک ایسے قاری کی ہے جو معنویت کی تلاش میں لکھنے کے عمل سے بھی گزرتا ہے اور تحسین کی بہ نسبت صرف تنقید سننے کا زیادہ مشتاق ہے۔ یہ کتاب بھی اسی احساس کے تحت پیش کی جارہی ہے کہ آپ اپنے اختلاف کو مجھ تک پہنچا کر مجھے اپنے اخذ کردہ نتائج کو مزید پرکنے کا موقع دیں گے۔"(۴۹)

"اُردو ناول کے رنگ "ڈاکٹر انور سدید نے اُردو ادب کے معروف ناولوں کے بارے میں اپنے تبصروں پر مشتمل کتاب "اُردو ناول کے رنگ" مرتب کی ہے۔ ۱۴ صفحات پر مشتمل مقدمہ میں اُردو ناول کے ارتقاء کو جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "اُردو ناول کے رنگ " مقبول اکیڈمی، لاہور سے ۲۰۱۴ء کو شائع ہوئی۔ اس تصنیف میں انور سدید نے جہاں قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے اُردو ناولوں کی مختلف کروٹوں کا جائزہ لیا۔ بلکہ اپنے پسندیدہ ناولوں کو تنقیدی نقطۂ نگاہ پر پرکھا اور جامع تجزیہ پیش کر کے ناول کے تنقیدی ارتقاء اور فروغ میں قیمتی سرمائے کا اضافہ کیا۔ انور سدید کا تحقیقی کام وسعت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے تحقیقی مضامین مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع کیے۔ اُن کی تحقیقی کاوشوں کی ایک قدر یہ بھی تھی کہ اپنے مضامین کو اخبارات و جرائد سے نکال کر انہیں کتابی شکل میں مرتب کر لیا کرتے تھے۔ "شاعری کا دیار "مقبول اکیڈمی، لاہور سے ۱۹۹۳ء کو شائع ہوئی۔ اس تصنیف میں نظم، غزل، نثر اور خصوصاً نعتیہ شعری مجموعوں پر ڈاکٹر انور سدید کے تبصرے اس کتاب میں شامل ہیں۔ "شاعری کا دیار" مختلف اصناف شعر اور ان کے تخلیق کاروں کے بارے میں لکھے گئے۔ چند منتخب مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں اس عہد کے موضوعات اور نئے خیالات پر تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جو کہ قابل تحقیق عمل تصور کیا جاسکتا ہے۔

انور سدید نے تبصرہ نگاری کا آغاز محمد اختر کے ناول "چاکیواڑہ میں وصال " سے کیا۔ جو پہلی مرتبہ ۱۹۶۶ء میں اوراق میں شائع ہوا۔ تب سے وہ مسلسل کتابوں پر تبصرے لکھتے چلے آرہے ہیں۔ اُن کی اسی (۸۰) سے زائد تصانیف میں وہ تنقیدی و تحقیقی کاوشیں جو رسائل میں شائع کرتے رہے ہیں۔ اُن کی تصانیف کی شکل دی۔ انہوں نے ایک ہزار سے زائد کتابوں پر تبصرے لکھے۔ لیکن اُن میں جو تبصرے جو کہ تصانیف کی شکل میں ہیں جن کی تعداد ۲۲۱ ہے اُن تصانیف کا تعارفی جائزہ کے ساتھ ساتھ تبصروں پر اسلوبیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔

انور سدید کی تبصرہ نگاری کا اپنا مخصوص پیٹرن ہے ۔ اُن کے تبصروں سے قاری کو مصنف سے یگانگت، دوستی اور کتب بینی کا شوق اور جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اُن کی تبصرہ نگاری کی خاصیت ہے کہ کتابوں سے شناسائی ہوتی ہے اور اُن کی قدر و قیمت کا تعین بھی ہو جاتا ہے۔ اُن کے تبصرے اُردو ادب کے قاری کے لیے یکساں مفید اور کسی حد تک کتاب کلچر کے نامساعد حالات میں زندگی کا ضامن ہے۔ اُن کے تبصرے روایتی تنقید کا پہلو نہیں رکھتے جس سے لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی ہو بلکہ ان میں حوصلہ افزائی اور راہنمائی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اور اگر جہاں کہیں اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے تو وہاں شائستہ الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔ اُن کا تجزیہ ہمیشہ بے لاگ دکھائی دیتا ہے۔ جو غیر جانبداری کا پہلو تھامے ہوئے نظر آتا ہے۔ "خالد اقبال یاسر" کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "یاسر کی شاعری میں بے حد تلخ، بے حد ترش ردِ عمل راہ پا رہا تھا لیکن وہ زود نویس شاعر نہیں تھا۔ گزشتہ بیس برس کے دوران اس نے مٹھی بھر غزلیں کہی ہیں اور دیوان جمع کیا ہے تو یہ احمد ندیم قاسمی کے "جلال و جمال" کی طرح ضخیم نہیں، فیض صاحب کی شاعری کی طرح مختصر ہے۔ لیکن یہ پہلی نظر میں ہی آپ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ خالد اقبال یاسر کا ہر شعر احساس کی دلآویز یاترا ہے اور یہ دل کے ویران نگر سے ہو کر آیا ہے۔ چنانچہ درد بست سے جو یادیں اُبھری ہیں وہ انداز میں یاسر کی غزل کے عقبی دیار کی ایسی یادیں ہیں جو کھو جائیں تو صرف شاعری میں ہی بازیافت کی جا سکتی ہیں۔ یہ ایسی بازیافتہ یادیں ہیں جو احساس محرومی کے ساتھ احساس ملال بھی پیدا کرتی ہیں۔"(۵۰)

تبصروں کے اسلوب میں انور سدید کا انداز بیاں جذباتی تاثر کے بجائے ہمیشہ دلیل اور دعوے کے ساتھ شگفتگی کا حامل ہے۔ روانی اور سلیس انداز بیاں کی وجہ سے قاری کتاب کی خصوصیات نقطۂ نظر اور باقی ماندہ پہلوؤں کا ادراک آسانی سے کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب "اقبال کا فن" پر اپنے اختلاف کو شائستہ الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "موضوعات نئے اور فکر انگیز ہیں اور ہندوستانی ادباء نے اقبال کی فن کارانہ عظمت کے تخلیقی، جمالیاتی اور فنی پہلوؤں کو نئے قرینوں سے پیش کیا ہے۔

تاہم یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اقبال کے فکری پہلو کو اس کتاب میں مناسب جگہ نہیں دی گئی اور یہ بات بجائے خود محل نظر ہے کہ اقبال مفکر یا مصلح اس لیے تھے کہ وہ شاعر تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں اقبال کی ادبی شخصیت کا صرف ایک رُخ سامنے آتا ہے اور دوسرا رُخ جو اہل پاکستان کی نظر میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے نظر سے پوشیدہ رہتا ہے۔"(۵۱)

انور سدید کی تبصرہ نگاری ادبی کتب اور جرائد تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ سائنس، ٹیکنالوجی، معاشیات، سیاسیات اور مذہبیات سے متعلق کتب پر بھی اظہار خیال کرتے تھے۔ کوئی بھی صنف اور شعبہ ایسا نہیں جو اُن کی تخلیقی صلاحیتوں سے محروم رہا ہو۔ جمیل آذر انور سدید کی تبصرہ نگاری پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"تبصرہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ تازہ طبع شدہ کتاب پر تبصرہ وہی شخص لکھ سکتا ہے۔ جو تبحر علمی کا حامل ہو، جسے لکھنے پر مکمل دسترس ہو اور جس کا دل و دماغ تعصب سے پاک ہو۔ ڈاکٹر انور سدید ان تمام پیمانوں پر پورے اُترتے ہیں۔ وہ وسیع المطالبہ بھی ہیں اور بسیار نویس بھی، اُن کی تحریر میں سلاست دروانی کے ساتھ حلاوت کی آمیزش بھی ہے جو قاری کو پڑھنے کی خوشگوار ترغیب دیتی ہے۔"(۵۲)

انور سدید کے تبصروں میں درج ذیل خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں۔

۱۔ تبصروں کی تمہید مؤثر نظر آتی ہے جس میں وہ کتاب کی علمی سرگرمیوں اور شخصی پہلوؤں کا مطالعہ کر کے موضوع سے کتاب کی طرف بڑھتے ہیں۔

۲۔ مصنف اور تصنیف کے منفرد اور امتیازی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

۳۔ زبان سلیس سادہ اور رواں رکھتے ہیں کسی قسم کی الجھاؤ کی کیفیت نظر نہیں آتی۔

۴۔ مشاہدات اور تجربات کا سلیقہ مندی سے اظہار کرتے ہیں۔

۵۔ حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں ظاہر کی بجائے باطن پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

۶۔ معاصر ادب کے ارتقاء تاریخ قوانین وضوابط تبصرہ کرتے وقت پیش نظر رکھتے ہیں۔

۷۔ معاشرتی شعور، سماجی مسائل اور موضوعات سے تقابلی مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔

۸۔ سرسری مطالعہ یا جزوی جائزہ کے بجائے طائرانہ نظر رکھتے ہیں۔

انور سدید کے تبصرے مقدار میں بہت زیادہ ہیں۔ کچھ تبصروں میں عقیدت مندی اور التفات کا عنصر بھی موجود ہے لیکن جانبداری کے پہلو سے آزاد ہیں۔ کلیم الدین احمد اُن کی تبصرہ نگاری پر یوں رقم طراز ہیں کہ:

> "تبصرہ کا مقصد ہے کسی کتاب کے جوہر کا پتہ لگانا، اسے اجمال یا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا اور جو کچھ کہا جائے اس سے کتاب کی اہم ترین خصوصیتیں (خوبیاں یا برائیاں) دونوں واضح ہو جائیں۔۔۔۔ اور اس اصول کو پیش نظر رکھ کر اگر اُردو رسالوں میں لکھے جانے والے تبصروں پر نظر ڈالی جائے تو شمس الرحمٰن فاروقی اور کلام حیدری کے علاوہ انور سدید ہی ایسے ادیب نظر آتے ہیں جن میں یہ خوبی موجود ہے اور عالمانہ شان جھلکتی ہے اور جو کسی تصنیف کے بارے میں کوئی آزاد رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ (۵۳)"

تبصرہ نگاری ایک فن ہے، جس کے اپنے اصول وضوابط، قوانین و قاعدے اور تقاضے ہیں۔ فی زمانہ چوں کہ ہر شخص، مستثنیات کے سوا، تن آسانی کا شکار ہے، اس لیے محنت سے جی چرانا ایک عام سی بات بن گئی ہے، یہی معاملہ تبصرہ نگاروں کا بھی ہے، کہ وہ تبصرے کے لیے آئی ہوئی کتاب کو صرف دیکھ کر، اس پر تبصرہ کر دیتے ہیں۔ جو تبصرہ تو کہیں سے نہیں لگتا، البتہ اسے ہم اس کتاب کے شائع ہونے کی اطلاع اور اس کا ایک مبہم تعارف کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تبصرے کو ایک رسمی کارروائی سے زیادہ حیثیت مصنفین ومؤلفین اور ناشرین کتب بھی نہیں دیتے۔ جب کہ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن کو تبصروں میں دی جانے والی تجاویز کی روشنی میں ترتیب دیا جاتا تھا۔ تبصرہ نگاری اردو ادب کی جدید ترین اصناف میں سے ایک ہے، جس کے ذریعے کسی کتاب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں اگرچہ تنقید کی طرح تبصرہ بھی جدید ترین صنف ہے مگر اس کی ایک توانا روایت رہی ہے۔ مشہور ادیبوں میں خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق، علامہ ماہر القادری، مولانا ابو الکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی۔ آل احمد سرور اور مشفق خواجہ وغیرہ نے نہایت معیاری اور عمدہ تبصرے کیے ہیں۔ اردو میں دیگر کئی اصناف کی طرح

اس کے ڈانڈے بھی انگریزی ادب سے ملتے ہیں۔ انگریزی ادب ہی کی پیروی میں اردو کے اخبارات ور سائل کی اشاعت کے ساتھ ہی کتابوں پر تبصرہ کرنے کا آغاز ہوا۔ حالاں کہ اس سے قبل اردو تقریظ اور دیباچے وغیرہ کی روایت رہی ہے۔ البتہ تقریظ و دیباچے اور تبصرے میں فرق یہ ہے کہ تقریظ یا دیباچہ کتاب میں شامل ہوتا ہے جس میں کتاب کے موضوع اور مصنف کے بارے میں تشریح و توضیح تو ہوتی ہے، لیکن اس میں عموماً کتاب کے کمزور پہلوؤں سے اغماض برتا جاتا ہے، جب کہ تبصرہ کتاب کی اشاعت کے بعد تحریر کیا جاتا ہے، تاکہ عام قاری کو کتاب کی تفصیل معلوم ہو سکے۔ تبصرہ کی بنیادی شرط کتاب کا راست اور ذاتی مطالعہ ہے۔ اگر کتاب نہیں پڑھی جائے گی تو کتاب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ممکن نہیں ہو گا اور تبصرے میں غیر درست معلومات بیان ہو سکتی ہیں۔ اس سے مبصر کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ کیونکہ تبصرہ لکھتے ہوئے وہ ایک ذمہ دار شخص ہوتا ہے۔ تبصرہ لکھنے والے کو نہایت باریک بینی کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ مبصر دورانِ مطالعہ ذہن میں ابھرنے والے ضروری نکات کتاب کے حاشیے پر بطور یادداشت قلم بند کر لیتا ہے تاکہ تبصرہ لکھتے وقت کوئی ضروری نکتہ چھوٹ نہ جائے۔ مصنف کے پس منظر کو سامنے رکھے بغیر کتاب پر جامع تبصرہ نہیں ہو سکتا، اس کے پس منظر کا جائزہ مبصر کے لیے رائے قائم کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ مصنف کی سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی وابستگی کے پیش نظر اس کی تعلیمی لیاقت بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر صاحب کتاب اس سے قبل بھی کتاب لکھ چکا ہے تو قبل کی تصنیف کا اس سے کیا تعلق ہے؟ مبصر اس کو بھی سامنے لاتا ہے، اس کا ذکر قاری کے لیے مفید ہوتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کا کمال یہ بھی ہے کہا نہوں نے تبصرے کے اس بے جان پُتلے کو نہ صرف زبان عطا کی ہے بلکہ سوچنے سمجھنے کی قوت سے بھی نوازا ہے۔ اس لیے ان کے تبصرے تعارف کا بے جان آئینہ بن کر کسی کتاب کے صرف

ظاہری حُسن کا عکس ہی پیش نہیں کرتے بلکہ تجزیئے کی روشنی کی صورت میں اس کے اندر کے ہُنر کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے تبصرے عصری آگاہی کو اشیاء اور مظاہر کے حوالے منظر عام پر لاتے ہیں۔ اور انسانی سوچ کو نئی کروٹ دیتے ہیں۔ اُنہیں اگر کسی تصنیف کے اندر کا جائزہ پیش کرتے ہوئے حُسن اور خوبی کے ساتھ ساتھ اگر کہیں کوئی عیب یا کمی نظر آجائے تو اس پر پردہ ڈالنے یا اس سے کترا کر نکل جانے کی بجائے انور سدید اسے قاری کے سامنے پیش کرنے کی بے پناہ جراءت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ چاہے وہ تصنیف کتنے ہی بڑے ادیب کی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ خود ادب کو ایک سنجیدہ فعل سمجھتے ہیں لہٰذہ اس کو برتنے کے سلسلے

میں وہ ہمیشہ فہم و ادراک کا دامن تھامے رکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔ اور اگر کسی زیر تبصرہ تصنیف میں کوئی مصنف غیر ادبی حربے اور غیر شائستہ زبان کے استعمال کا مرتکب نظر آجائے تو پھر اس کے ساتھ ہر گز رعایت نہیں برتتے تھے لیکن وہ کبھی ہذیان سرائی کا شکار نہیں ہوتے بلکہ منطقی طرز استدلال کو اپنائے رکھتے ہیں۔ اس کی مثال وارث علوی کی کتاب " حالی، مقدمہ اور ہم " پر اُن کے تبصرے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انہوں نے وارث علوی کو جب حالی کے بارے میں یہ کہتے دیکھا کہ "حالی نے لنگوٹی پر پھاگ کھیلا " یہ کہ " وہ ان لوگوں میں نہیں جو پجامے پر بنیان پہنے " یا یہ کہ " نمائش کرتے ہوئے آپ سے ملاقات کرتے ہیں" ان آراء پر انہیں تکلیف ہوئی ہے اور مدبرانہ اور استدلال سے جواب دیتی ہوئے کہتے ہے کہ وارث علوی نے قلم کے بجائے خاردار جھاڑی تھام رکھی ہے اور قاری کی توجہ ادب کی جانب منعطف کرانے کے بجائے اسے ادب سے بھگانے کی کاوش کر رہے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر انور سدید کا شمار اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ادب کے مطالعے اپنی زندگی ROUTINE بنایا ہوا ہے۔ اور ادب میں تمام سرگرمیوں اور ہر پیش رفت سے خود کو باخبر رکھتے ہیں۔ لہذا جب کسی قابل ذکر ادیب کی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہیں۔ تو اس ادیب کا پورا ادبی کیریئر اُن کی نظر میں ہوتا ہے اور قاری کو تبصرہ پڑھ کر اس تصنیف میں مصنف کے مزید کارہائے نمایاں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے تبصروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف کتاب کے ظاہر پر نظر نہیں رکھتے بلکہ اس کے باطن میں بھی جھانکتے ہیں اور اس کا اغل بغل سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ تبصرے میں صرف کیا ہے پر معاملہ نہیں روکتے بلکہ کیا ہونا چاہئے تک پہنچتے ہیں۔۔ اس سے قبل کہا گیا کہ مبصر کو زیر تبصرہ کتاب کے متعلقہ فن کی تاریخ، قوانین وضوابط اور جدید ارتقا سے ضروری واقفیت رکھنا چاہئے۔ کتاب میں کوئی خصوصی فیچر مثلا نقشہ جات اور تصاویر وغیرہ ہوں تو اس کی جانب اشارہ کرنا چاہیے۔ اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اُن کے تبصروں میں اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اکثر کتابوں میں زیر تبصرہ کتاب کے فن کی تاریخ، قوانین وضوابط اور جدید ارتقا پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں۔ کتابوں میں سرورق اور دیگر خصوصی ضمیموں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ انور سدید کے تبصرے بطور خاص قاری یا ادب کے طالب علم کو اپنی جن خوبیوں کی وجہ سے متوجہ کرتے ہیں، ان میں زبان بیان کو منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کی نثر میں فطری پن اور بے ساختگی ہے۔ وہ باتوں کو الجھاؤ کے بغیر پیش کرتے ہیں۔ زبان کی سادگی ایسی ہے کہ جیسے ذاتی محفلوں میں کوئی گفتگو کر رہا ہو۔ انہی خوبیوں میں ان کی تعمیر پسندانہ فکر بھی ہے۔ وہ تبصروں میں ان باتوں کو اہمیت دیتے ہیں جن سے سماج کے تانے بانے مضبوط ہوتے ہوں۔ ایسی باتوں پر بلاچوک گرفت کرتے ہیں جن سے سماج میں

تخریب کاری کا دروازہ کھلے۔ اُن کی یہ تعمیر پسندانہ فکر نہ صرف تبصرے کا حصہ ہے بلکہ اس کو ان کی زندگی کا لازمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی پوری شاعری، افسانہ نگاری، مضمون اور تنقید سارے میدان حتی کہ زندگی میں بھی تعمیر پسندی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انور سدید ادب کا ایک مکمل نظریہ رکھتے ہیں۔ جس پر نہ صرف خود عمل پیرا ہیں بلکہ حلقہ احباب، ادبا اور تلامذہ میں بھی اس کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ اُن تبصروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مشاق مبصر ہیں۔ شاعری، افسانہ اور تنقید ان کا میدان ہی ہے۔ اس کے باوجود میرا اپنا یہ احساس ہے کہ افسانہ اور شاعری پر ان کے تبصرے مجموعی طور پر اچھے ہوتے ہیں۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ وہ خود بھی شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ انور سدید کے تبصروں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے کتاب کے بسیط مطالعے کے بعد تبصرہ کیا ہے۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے وہ کتاب میں پیش کئے گئے خیالات کے تضادات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ انور سدید ایک اچھے تبصرہ نگار ہیں۔ ان کے تبصرے فن کی روایات کے پاسدار ہیں۔ کلیم الدین احمد نے اپنے مضمون "اُردو میں تبصرہ نگاری" میں لکھا ہے کہ "تبصرہ کا مقصد ہے کسی کتاب کے جوہر کا پتہ لگانا اسے خصوصیتیں (خوبیاں اور برائیاں) دونوں واضح ہو جائیں اور اس اصول کو پیش نظر رکھ کر اگر اردو رسالوں میں لکھے جانے والے تبصروں پر نظر ڈالی جائے تو شمس الرحمٰن فاروقی اور کلام حیدری کے علاوہ انور سدید ہی ایسے ادیب دکھائی دیتے ہیں جن کے تبصروں میں یہ خوبی موجود ہے اور عالمانہ شان جھلکتی ہے اور جو کسی تصنیف کے بارے میں کوئی آزاد رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت اردو کے تبصروں کے سرمایہ میں ایک اضافے کی ہو گی اور بطور خاص تبصرہ نگاری سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لیے معاون بھی ہے۔

(چ) ڈاکٹر انور سدید کی تراجم نگاری کا فنی و فکری جائزہ:

دیگر اصناف ادب کی طرح ترجمہ نگاری بھی انور سدید کا تخلیقی زاویہ ہے۔ اُن کے ترجمے تخلیقی حُسن سے بھرے پڑے ہیں۔ ادب میں انور سدید مستند درجہ کے ادیب ہیں۔ اُن کے ترجمے معلوماتی، سیاسی اور تاریخی نوعیت کے حامل ہیں۔ انور سدید "قومی ڈائجسٹ، ریڈرز ڈائجسٹ اور ماہنامہ قومی زبان" میں بطور مترجم کام کرتے رہے ہیں۔ اُن کی تراجم نگاری کے درج ذیل شاہکار نمونے ہیں۔ فریب کار، ذُلفی بھٹو آف پاکستان (والپورٹ)، کشمیر۔ سرد جہنم (گورنر جگ موہن)، شہزادی ڈیانا کی محبت، مائی فیوڈل لارڈ (تہمینہ درانی)، ایک بے عنوان کتاب (غلام اکبر)، مون سٹون (ولکی کولنز) جب کہ "فریب کار" فریبی ایک خفیہ اداروں کو

انگریزی سے اُردو ادب میں منتقل کر کے دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں اور جنگ کے مضمرات کو برعظیم پاک و ہند کے قارئین تک پہنچانا ایک بہت بڑی علمی ادبی خدمت ہے۔ فریڈرک فور سائیتھ کا ناول "رد ڈی سیور" (The Deceiver) آج بھی ادبی دنیا میں مقبول ہے۔ اس ضمن میں ناول کے مترجم ڈاکٹر انور سدید رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ:

> "دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو عالمی سرد جنگ چھڑ گئی جو روس اور اقوام مغرب کے درمیان چالیس برس تک جاری رہی۔ تاریخ کے ریکارڈ کے لیے یہ اعتراف ضروری ہے کہ "یہ جنگ مغرب نے جیت لی تھی۔ لیکن مغرب کو اس جیت کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑی؟ اس کا اندازہ ممکن نہیں ہے"۔ فریڈرک فور سائیتھ کی کتاب "دی ڈی سیور" (فریب کار) میں سرد جنگ کے ان کرداروں کی داستان عمل پیش کی گئی ہے۔ جو پس پردہ رہ کر خفیہ منصوبے بناتے، گھناؤنے مشن تکمیل تک پہنچاتے اور دنیا کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات پر اثر انداز ہوتے تھے۔ ان کرداروں کی زندگیاں پردے میں ہیں، یہ کردار اب بھی آنکھوں سے اوجھل ہیں، اس کتاب میں آپ کے سامنے ان کے اعمال آئیں گے، آپ ان کے خفیہ کارنامے ملاحظہ کریں، عالمی حالات کی تبدیلی میں ان کی کارکردگی دیکھیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ انہیں پہچان لیں۔ چار ذیلی کہانیوں پر مشتمل یہ ناول حالیہ دور کی تاریخ کے سیاسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ فریڈرک فور سائیتھ کے اس ناول "دی ڈی سیور" کو جس کا عرفی نام "فریب کار" ہے، عالمی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔" (۵۴)

اس ناول میں مہماتی ذہن رکھنے والوں کے لیے ذخیرہ معلومات موجود ہے۔ مصنف اور مترجم کی کاوش قابل ستائش ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ذوالفقار علی بھٹو انتہائی اہم شخصیت ہے۔ سٹینلے والیورٹ نے بھٹو مرحوم کی شخصی اور سیاسی زندگی پر "ذُلفی بھٹو آف پاکستان" کے نام سے کتاب لکھی۔ انور سدید نے قومی ڈائجسٹ کے لیے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ "کشمیر سرد جہنم" کے عنوان سے مقبوضہ کشمیر کے گورنر جگ موہن کی کتاب کا ترجمہ "قومی ڈائجسٹ" میں شائع کیا۔ ایک اور تصنیف "شہزادی ڈیانا کی محبت" کے عنوان سے ایک دلچسپ انگریزی کتاب کو بھی اُردو میں منتقل کیا جو قسط وار روزنامہ "خبریں" لاہور میں

شائع ہوا۔ "مائی فیوڈل لارڈ" جو کہ میاں شہباز شریف کی اہلیہ کی سوانح تھی اس کا ترجمہ بھی انور سدید نے کیا اور ہفت روزہ "زندگی" میں قسط وار شائع ہوتا رہا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اُردو صحافت کے سینئر صحافی غلام اکبر کی "ایک بے عنوان کتاب" کا ترجمہ بھی انور سدید نے کیا ہے۔

وکی کولنز کا ایک انگریزی ناول Moon Stone انگریزی لٹریچر میں کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ انور سدید نے اس ناول کا ترجمہ "سومنات کا ہیرا" کے عنوان سے کیا۔ انور سدید سے قبل اس کے دو ترجمے "چندر ہیرا" اور "دیوتا کی آنکھ" بالترتیب مختار علی اور تیرتھ رام فیروز پوری نے کیے۔ انور سدید نے ۱۹۹۴ء میں اس کا ترجمہ کیا اور قسط وار قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوتا رہا۔ ترجمہ نگاری میں دوسرے تراجم کی طرح یہ اُن کا قابل قدر کارنامہ تھا جس میں انہوں نے گراں قدر ناول کو مدتوں بعد پھر سے ایک نئے اسلوب کے رنگ میں زندہ کر دیا۔ انور سدید کی ترجمہ نگاری میں دونوں زبانوں پر گرفت مضبوطی لیے رکھتی ہے۔ انہوں نے دیگر زبان کے تخلیقی شہ پاروں کو میکانکی عمل کے بجائے تخلیقی حالت میں ڈھالا ہے۔ ترجمہ نگاری میں روانی، مفہوم کی ادائیگی میں موزوں متبادل الفاظ کا استعمال کیا جو اُسے دوسرے ترجمہ نگاروں سے منفرد رکھتا ہے۔ مون سٹون ناول کے اس ترجمے سے اُن کی اسلوب کی انفرادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> "ہمارے معزز مہمان کی آمد میں تاخیر ہوتی چلی جا رہی تھی، حتیٰ کہ دوپہر کا وقت ہو گیا لیڈی ویرنڈر نے مجھے حکم دیا کہ میں باہر لان میں ہی بیٹھا رہوں اور مسٹر فرینکلن بلیک کا انتظار کروں۔ بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی۔ اچانک کھانے کے کمرے سے برتنوں کی کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی تو میں چونکا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میرا کھانا بالعموم میرے کمرے میں بھیج دیا جاتا تھا، اس لیے میں اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ مجھے دور سے گھر کی نوکرانی تیز رفتاری سے چلتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے بُرا سا منہ بنا رکھا تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کے روکا اور پوچھا "نینی ایسی کیا جلدی ہے؟ تم کدھر بھاگی جا رہی ہو۔"(۵۵)

تراجم زبان کو ثروت مند بنانے کا وسیلہ ہے۔ ان کے ذریعے ہم دوسری زبانوں کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کرتے ہیں۔ انور سدید کی ترجمہ نگاری، تراجم کی اہمیت کے عملی نمونے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ انور سدید کی ترجمہ نگاری پر رقم طراز ہیں کہ:

"کسی دوسری زبان کے تخلیقی شہ پارے کا اپنی زبان میں ترجمے کرتے وقت نہ صرف لفظوں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ بلکہ ترجمہ نگار مروجہ معانی کو گرفت میں لینے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ میرے نزدیک کامیاب ترجمہ وہ ہے جو متن کے قریب ترین ہو اور میکانکی عمل کی بجائے ترجمہ تخلیقی نظر آئے۔ ہر زبان کے الفاظ کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ ترجمہ نگار دوسری زبان کو اپنی زبان کی تہذیب میں ڈھالتا ہے۔ تو بعض اوقات لڑکھڑا جاتا ہے۔ اسے صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے موزوں متبادل الفاظ دستیاب نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ ایسے الفاظ کا سہارا لیتا ہے جو اصل متن اور مفہوم کے قریب ترین پہنچ جائیں اور قاری کو غرابت محسوس نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ کرنا خاصہ مشکل کام سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لیے دونوں زبانوں پر عبور لازم ہے۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے تو یہ ہر ترجمہ نگار کا اپنا ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ کو کسی ایک کتاب کے مختلف مترجمین کا کام شاید ایک جیسا نظر نہ آئے۔ ترجمہ نگار اصل مصنف کے نقوش پا پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔" (۵۶)

انور سدید نے ترجمہ نگاری کے فن سے اردو زبان کو ثروت مند بنایا ہے وہ ترجمے کی داخلی ضرورت کے تحت نہ صرف الفاظ سازی کے عمل سے گزرتے ہیں بلکہ بعض اوقات دوسری زبانوں کے الفاظ بھی اپنی زبان میں منتقل کر دیتے ہیں، اس طرح دیسی زبان کے اظہار میں وسعت پیدا کرتی نظر آتی ہیں اور لفظ و معنی کا نیا ارتباط ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے تراجم میں جہاں کہیں انہیں انگریزی الفاظ کا اپنی زبان میں متبادل یا مترادف نہیں ملا انہیں برقرار رکھا ہے۔ اُردو زبان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اُسے جہاں ضرورت پڑے یہ دوسری زبانوں یہاں تک کہ مقامی بولیوں کے الفاظ بھی بخوشی قبول کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنے ترجمے کو عام فہم بنانے کے لیے جہاں کہیں ضرورت پڑی ہے مقامی زبانوں کے الفاظ کا استعمال بھی روا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ یہ خیال بھی پیش نظر رکھا ہے کہ جس کتاب کا وہ ترجمہ کر رہے ہیں اس کے مصنف کا اسلوب اُردو زبان میں بھی برقرار رہے۔ ترجمے میں ثقیل اور مشکل الفاظ سے پرہیز کی جائے تاکہ اوسط درجے کا قاری بھی ترجمے سے لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ انہوں نے اُردو ادب کی تمام اصناف میں جس قدر تخلیقی کام کیا ہے۔ اور ہر صنف میں

اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں اور منفرد پہچان رکھتے ہے۔ اُن کا مشرقی و مغربی ادب کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا۔ انہوں نے انگریزی کُتب کا وافر مطالعہ کیا اور ان کے تراجم میں اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ زبان وبیان میں کہیں ابتذال اور لذتیت نہ آنے پائے۔ جہاں ضرورت پڑی انگریزی کی ایسی عبارتوں سے صرف نظر کیا۔ عام طور پر انور سدید نے لفظی ترجمے کو ترجیح دی اور جہاں کہیں ضرورت ہوئی عبارت کے مفہوم کو ہی ترجمے کی شکل دے دی ہے۔ لیکن انہوں نے مروجہ معنوں کو گرفت میں لے کر ترجمہ کو تخلیقی شہ پارہ بنا دیتے ہے۔ انہوں نے ترجمے میں میکانکی عمل کے بجائے قریب ترین متن کو تخلیقی انداز میں لیا۔ اور ترجمہ نگار نے دوسری زبان کو اپنی زبان کی تہذیب میں ڈالنے کی کوشش کی اس کاوش جہاں کہیں اُسے صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے موزوں متبادل الفاظ کی دستیابی میسر نہیں تھی تو اُس وقت انہوں نے ایسے الفاظ کا سہارا لیتا ہے جو اصل متن اور مفہوم کے قریب ترین پہنچ جائیں اور قاری کو غرابت محسوس نہ ہو۔ اُن کی ترجمہ نگاری سے معلوم ہوتا ہے کہ انور سدید کو دونوں زبانوں پر مکمل مہارت اور عبور حاصل رہا۔ اُن کے ترجمے جہاں انفرادیت کے حامل ہے وہاں یہ تخلیقی تاثر بھی رکھتی ہے اور دیگر مترجمیں سے مختلف ہے اور اصل مصنف کے نقش پا پر چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انور سدید کی ترجمہ نگاری کے جائزے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دیگر اصناف ادب کی طرح اس جہت میں بھی انہوں نے جان فشانی سے کام لیا۔ اُن کی کتب بینی کا شوق صرف اُردو ادب تک محدود نہ تھا بلکہ بین الاقوامی ادب کے مطالعہ کا رجحان بھی رکھتے تھے۔ ترجمہ نگاری میں بھی انہوں نے اصول وضوابط کی نئی راہیں متعین کیں۔ اُن کے تراجم کی نمایاں خصوصیات میں ترجمے کو عام فہم بنانے کے لیے متبادل کے طور پر مقامی زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کیے اور ترجمے میں مشکل الفاظ سے پرہیز کر کے، آسان الفاظ کا استعمال کیا ۔ ابتذال اور لذتیت سے گریز کر کے عام قاری کے لطف اور دلچسپی کے عناصر کو شامل کیا جس کی وجہ سے اُن کے ترجمے منفرد تخلیقی شاہکار بن گئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، دِلی دور نہیں (سفر نامہ)، مقبول اکیڈمی، لاہور، فروری ۱۹۹۲ء، ص ۹

۲۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفر نامہ، اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳

۴۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد اول، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۲۵۲

۵۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، اُردو کا بہترین انشائی ادب، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۴

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دوسرا کنارہ، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۸

۷۔ ہاروان الرشید تبسم، ڈاکٹر، انوارِ ادب، مقبول اکیڈمی، لاہور، جون ۲۰۱۶ء، ص ۶۶۷

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، ذکر اس پری وش کا، (مجموعہ انشائیے)، مکتبہ اُردو زبان، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۸

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، ذکر اس پری وش کا، دسمبر، ص ۴۹

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، ذکر اس پری وش کا، اونگھنا، ص ۳۶

۱۱۔ سجاد نقوی، پروفیسر، پاکستانی ادب کے معمار، ڈاکٹر انور سدید: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۸۵

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، ذکر اس پری وش کا، (مجموعہ انشائیے)، مکتبہ اُردو زبان، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۴۱

۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، ذکر اس پری وش، تاروں بھری رات، ص ۹۸

۱۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، آسمان میں پتنگیں، (مجموعہ انشائیے)، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۹

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، آسمان میں پتنگیں، چھینک، ص ۳۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۱۸۔ مارٹن گرے، ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز، نیویارک پریس، نیویارک، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۶

۱۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو ادب میں طنز و مزاح، مکتبہ عالیہ، لاہور، طبع نہم، ۱۹۹۹ء، ص ۲۸

۲۰۔ ظفر احمد صدیقی، "اُردو ادب میں پیروڈی" (مضمون)، علی گڑھ میگزین، طنز و ظرافت نمبر، ۱۹۵۳ء، ص ۲۷

۲۱۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، جلد ششم، ۲۰۱۰ء،

۲۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۹

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۹

۲۵۔ ایضاً، ص ۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۷

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۱

۳۰ ایضاً، ص ۲۷

۳۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، قلم کے لوگ، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵

۳۲۔ ایضاً، ص ۶۷، ۶۸

۳۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، ادیبان رفتہ، کلاسیک سپوٹنک پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۹

۳۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، نقوش رفتگاں، کلاسیک سپوٹنک پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۹۷

۳۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، مولانا صلاح الدین احمد: فن اور شخصیت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۴۴

۳۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، بانو قدسیہ: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۲۹

۳۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، سعید صورتیں، دوست پبلیکشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۳، ۶۴

۳۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، نئے جائزے ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۸ء، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ص ۶۶

۳۹۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، ڈاکٹر انور سدید اور ادبی جائزے، (مضمون)، سہ ماہی اسالیب، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۲۳، ص ۱۰

۴۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، نئے جائزے ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۸ء، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ص ۱۲

۴۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ادب کہانی ۱۹۹۶ء، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ستمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۸

۴۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، جائزہ اُردو ادب ۱۹۹۸ء، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲

۴۳۔ سجاد نقوی، پاکستانی ادب کے معمار، ڈاکٹر انور سدید: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۳۹۴

۴۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، کالم، دید و باز دید، روزنامہ جسارت، کراچی، ۲۵ مئی ۱۹۷۸ء

۴۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، کالم، دید و باز دید، روزنامہ جسارت، کراچی، ۲۵ مئی ۱۹۷۸ء

۴۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، سدیدیات، روزنامہ حریت، کراچی، ۱۶ ستمبر ۱۹۹۹ء ص ۴

۴۷۔ کلیم الدین احمد، اُردو تنقید پر ایک نظم، لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۸۳ء، ص ۳۲۶

۴۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، کچھ وقت کتابوں کے ساتھ، اُردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۸

۴۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو نثر کے آفاق، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۷

۵۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، کچھ وقت کتابوں کے ساتھ، اُردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵

۵۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اقبال کا فن، (تبصرہ)، ماہنامہ "اوراق"، لاہور، اگست ۱۹۸۴ء، ص ۲۴۱

۵۲۔ جمیل آذر، انور سدید کی تبصرہ نگاری، سہ ماہی "روشنائی"، کراچی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۶۵

۵۳۔ سجاد نقوی، گردم جستجو، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۹۰ء، ص ۱۸۲

۵۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، فریب کار (ترجمہ)، مقبول اکیڈمی، لاہور، جولائی ۲۰۰۷ء، ص ۸

۵۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، ولکی کولنز، ناول مون سٹون۔ "سومنات کا ہیرا"، (ترجمہ)، قومی ڈائجسٹ، لاہور، شمارہ دسمبر، ص ۲۴

۵۶۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، کتابیات تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۸

باب چہارم:

ڈاکٹر انور سدید کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

(الف) ڈاکٹر انور سدید کی شاعری کا ارتقائی سفر:

ڈاکٹر انور سدید کے عملی و ادبی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہوں نے فکر و خیال، اختلافات، اقبال کے کلاسیکی نقوش، اُردو ادب کی تحریکیں، اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، اُردو ادب میں سفر نامہ، انشائیہ اُردو ادب میں اور دیگر تصنیفات اور تالیفات اُن کے تنقیدی شعور اور علمی مرتبے کو پہچاننے میں مدد دیتی ہیں۔ اُن کے مضامین، مقالات، تنقیدیں، تبصرے، مراسلے، دیباچے اور ادبی جائزے پڑھ کر اُن کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُن کے ادبی کارناموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو جہاں اُن کا شمار جدید دور کے اہم ترین نقادوں، دانشوروں اور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہاں اُن کی ایک اور صنف ادب شاعری میں بھی منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اگرچہ کہ اُن کی یہ جہت حلقہ ادب میں اتنی عام نہیں رہی اور دیگر ادبی جہات کے بوجھ تلے دب گئی۔ انور سدید اُردو شاعری میں اہم مقام رکھتے ہیں اور اُن کا شمار جدید دور کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی دیگر اصناف کی طرح اُن کی شاعری کو خاصے کی چیز شمار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> "اُن کی تخلیقی صلاحیتوں نے افسانہ نگاری کے علاوہ کبھی کبھار غزل گوئی کا روپ اختیار کیا۔ ایک زمانے میں وہ انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہوئے تو انہوں نے نہایت خوب صورت اور کامیاب انشائیے لکھے اس کے افسانے، غزلیں اور انشائیے خاصے کی چیزیں ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر انور سدید بنیادی طور پر سائنس کا طالب علم تھا اور اُن کا پیشہ غیر شاعرانہ تھا۔ لیکن اُن کی طبیعت کو ادب سے فطری رغبت تھی جس نے اُسے کسی کروٹ چین نہ لینے دیا۔ اُن کا خارج اس کے داخل کو شکست نہ دے سکا اور زندگی کے سفر کے دوران میں جونہی موقعہ ملا اس کے اندر کا ادیب اور شاعر سر اُٹھا کر منظر عام پر آگیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے بہت کم اشعار کیے ہیں۔ لیکن اس کی غزلوں، نظموں، نعتوں اور حمدوں کا عقبی منظر اتنا وسیع اور جاذب توجہ ہے کہ قاری کی نگاہوں کے سامنے یکایک کتنے ہی نئے جہانوں کے در وا ہو جاتے ہیں۔ اُن کی شاعری پر یہ بات مصداق ہے کہ اُنہوں نے مقدار سے زیادہ معیار پر ترجیح دی۔

جس عہد میں انور سدید نے شاعری کا آغاز کیا۔ اُس وقت اُردو شاعری میں زبردست انقلابی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی نظر نامے اور دگر گوں معاشرتی و معاشی صورت حال کے تحت شاعری مکمل طور پر بدل گئی اور ہیئت و موضوع ہر حوالے سے ایک انقلاب عظیم وقوع پذیر ہوا۔ انسان کی پیچیدہ نفسی کیفیات اور جذباتی الجھنیں اُردو شاعری کا خاص موضوع ٹھہریں۔ شعراء خارج سے زیادہ داخل کی طرف رجوع کرنے لگے۔ نئے موضوعات، نئی زبان، نئے طرز اظہار کے متقاضی تھے۔ جس کی وجہ سے نئی فنی علامتیں، نئے استعارے اور تشبیہات استعمال کی گئیں۔ نئی امیجری اور الفاظ کا استعمال ہوا گویا شاعری نئے حسی تجربات کا آئینہ دار بن گئی۔ انور سدید کا شمار بھی اُن جدید شعراء میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے شاعری کو نئے سیاسی و سماجی تناظر میں نئے موضوعات اور تنوع بینی تجربات کا خوگر بنایا۔ اُنہوں نے غزل، نظم، قطعات، دوہے اور نعت نگاری کی جو اپنے ڈھب اور انداز سے انفرادیت کی حامل ہے۔

انور سدید کے شاعری کے نمایاں ترین زاویے غزل، نظم، قطعہ اور نعت نگاری ہے۔ اُنہوں نے شاعری کے حوالے سے تین شعری مجموعے "سفر میں پرندے، بقلم خود اور صلعم "بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ "سفر میں پرندے" جو کہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ مقبول اکیڈمی لاہور سے شائع ہو چکا ہے لیکن دیگر مجموعے غیر مطبوعہ ہیں۔ انور سدید تواتر سے شاعری کرتے رہے جو کہ مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہوتی رہی۔ اُن کا غیر مطبوعہ کلام اُن کی بیاض میں محفوظ اور جرائد میں بکھرا پڑا ہے۔ جب سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے شاعری کو ایک ذائقے کے طور پر نہیں لیا بلکہ غزل اور نظم اُن کا بہترین مشغلہ تھا۔ اُردو شاعری میں اُن کی مہارت اور جدت انفرادی تھی۔ سجاد نقوی اُن کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> " انور سدید کا اتنا کلام ہے کہ اس سے اُن کی شاعری کے تین چار مجموعے با آسانی مرتب ہو سکتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی ایک بیاض ۱۹۶۸ء سے ۲۰۰۰ء تک اور دوسری بیاض ۲۰۰۱ء سے تاحال جاری اور غیر مطبوعہ کلام کی سرمایہ دار ہے۔ پہلی بیاض کے پہلے صفحے پر ڈاکٹر انور سدید نے اپنی شاعری کے تین مجموعوں کو "بقلم خود"، "سفر میں پرندے" اور "صلعم" عنوان تجویز کیے ہیں۔ "سفر میں پرندے" سے ظاہر ہے کہ اس میں ڈاکٹر انور سدید کی پابند اور آزاد نظمیں شامل ہوں گی۔ "صلعم" نعتوں کا مجموعہ اپنے دامن میں حمد، منقبت اور سلام بھی لیئے ہو گا۔ "بقلم خود" میں سدا بہار صنف شعر

،"غزل" ڈاکٹر انور سدید کی عہد بہ عہد غزلیہ شاعری کا فکری و فنی ارتقاء پیش
کرے گی۔"(۲)

زیر نظر اقتباس کے پیش نظر انور سدید کی شاعری کے ابتداء اور ارتقاء کے سفر کا تعین کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کو بالترتیب بیاض کی صورت میں محفوظ رکھا اور اپنی حیات میں ہی غیر مطبوعہ کلام کو مجموعوں کی ترتیب دے کر نام دے دیئے تھے۔ جب کہ "پرندہ سفر میں" اُن کی حیات میں شائع ہو چکا تھا۔ جن میں غزلیں شامل ہیں۔ سجاد نقوی نے "سفر میں پرندے" اور عنوان لکھا اور اس کو پابند نظموں کا مجموعہ لکھا جو کہ ایسا نہیں ہے۔ کتاب کا عنوان "پرندہ سفر میں" اور اس میں صرف غزلیات شامل ہیں۔ شاید انہیں میسر معلومات غلط ملیں جن کی وجہ سے یہ غلطی ہوئی۔ اُن کے بیاض کی سالانہ ترتیب اُن کی شاعری کے پس منظر اور اُن کے تجربات و مشاہدات کا عکس نظر آتی ہے۔ جس سے اُن کے ادوار کا تجزیاتی مطالعہ اور فکر و فن کو احسن انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔

اُردو شاعری میں طبع آزمائی کے لیے ایک روایت رہی کہ شعراء کی علم عروض سے کماحقہ آگاہی ضروری ہوتی یا علم عروض سے آگاہ کسی بزرگ شاعر کے سامنے زانوئے تلمذ نہ کرنے سے ہوتی تھی۔ لیکن انور سدید کے ہاں ایسا نہیں تھا۔ دیگر اصناف کی طرح اُردو شاعری کے حوالے سے بھی اُن کا مطالعہ عمیق اور وسیع تھا۔ جن کا اندازہ اُن کی تصنیف کردہ کتاب "غزل کے رنگ" سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو اُردو غزل کے تنقیدی مطالعے کے لیے حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غزل اور اُردو شاعری کے لوازمات کا مطالعہ اور مہارت کے لیے انہوں نے "ادیب فاضل" کے امتحان کی تیاری میں "علم عروض" کا مرحلہ طے کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے شاید انہیں شعر گوئی کے لیے باقاعدہ اُستاد کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ لیکن سید حسن رضوی کو دیئے گئے انٹرویو میں پہلی صنف کی کاوش کے متعلق انور سدید اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

> "میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں ہر نئے لکھنے والے کو پہلی شاعری بلکہ غزل کی شاعری اپنی طرف کھینچتی ہے۔ میں نے بھی ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پہلی تُک بندی ہی کی تھی اور اس پر گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا کے ڈرائنگ ماسٹر شاہ دین شاد صاحب نے مجھے اصلاح بھی دی تھی۔ ماسٹر عبد الکریم نے مجھے اسی زمانے میں عروض کا درس دیا اور چند معروف اور آسان بحروں میں تقطیع کرنا سکھایا۔"(۳)

انور سدید کے ابتدائی صنف کے بارے میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کئی جگہوں پر اُن کے تخلیقی ادب کا نقطۂ آغاز افسانوی ادب بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس انٹرویو میں اُن کی پہلی صنف کاوش کے متعلق جواب میں انہوں نے صنف شاعری کو اپنی ابتدائی کاوش کہی۔ لیکن اصناف کی تاریخ طباعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ابتداء تو شاعری سے کی تھی۔ لیکن وہ شاعری میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھے۔ اُن کی دلچسپی زیادہ تر داستانوی اور افسانوی ادب میں تھی۔ سید حسن رضوی کو دیئے گئے انٹرویو کے سوال "گویا آپ نے ابتداء شاعری سے کی، پھر افسانے کی طرف آ گئے؟" اس کے جواب میں انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> "جی ہاں! مجھے ساتویں آٹھویں جماعت میں داستانیں پڑھنے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ کلاسیکی داستانوں کے علاوہ میں نے حفیظ جالندھری کی کتاب "عمر عیار" اور عظیم بیگ چغتائی کی کتاب "قصر صحرا" بھی گہری دلچسپی سے پڑھی تھی۔ اور یہ میری محبوب کتابیں تھیں۔ اسی زمانے میں مجھے ولکی کالنس کے ناول "مون سٹون" کے ترجمے نے جو دارالاشاعت پنجاب لاہور سے "چندر ہیرا" کے نام سے چھپا تھا۔ خان غلام حسین خان کے "شہاب ثاقب" کا نام بھی میری لوحِ دماغ پر ثبت ہے۔ میرزا ادیب کے "صحر نورد کے خطوط" نے بھی مجھے بہت مسرت فراہم کی اور مجھے صحر نورد کے ہر نئے خط کی اشاعت کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔ میٹرک تک میں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، فیاض محمود، عاشق حسین بٹالوی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، ممتاز مفتی کے کچھ افسانے پڑھ چکا تھا۔"(۴)

بالا اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ انور سدید نے تخلیقی ادب کا آغاز شاعری سے کیا اور بعد میں افسانوی ادب کی طرف مائل ہوئے۔ شاعری میں "شاہ دین شاد" نے اُن کی اصلاح کی اور نثر سے متعارف کرانے میں مولوی محمد بخش نے اُن کی راہنمائی کی۔ لکھنے کی ترغیب کے حوالے سے انہوں نے اس انٹرویو میں محمد نامی ایک دُکان دار کا تذکرہ کیا ہے۔ جنہوں نے اُن کو ساتویں جماعت میں ادب پڑھنے اور لکھنے کے لیے آمادہ اور حوصلہ افزائی بھی کی۔ بالا اقتباسات کے پیش نظر یہ واضح ہے کہ انہوں نے صنف شاعری سے آغاز کیا لیکن وزیر آغا کی رائے اس سے قدرے مختلف ہے۔ اُن کے نزدیک انہوں نے افسانے سے آغاز کیا اس بارے میں وہ یوں لکھتے ہیں کہ:

"انہوں نے افسانہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر وہ انشائیہ نگاری کی طرف راغب ہوئے اور اس میدان میں صف اول کے انشائیہ نگار کی حیثیت میں اُبھرے۔ ساتھ ہی اُنہوں نے غالب کے خطوط نگاری کی نہایت خوبصورت تحریف پیش کی جو بجائے خود ایک تخلیقی عمل تھا۔ اس کے بعد انہوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا اور متعدد دل کو چُھو لینے والی نظمیں لکھیں۔ شاعری کا آغاز نظم سے کیا۔ لیکن اس کے بعد جب وہ غزل کے میدان میں داخل ہوئے تو انہوں نے آہستہ روی کی بجائے بے پناہ تیز نگاری کا مظاہرہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چھا گئے۔"(۵)

وزیر آغا کے نزدیک اُن کی ابتداء افسانوی ادب سے ہوئی بعد میں شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ بالا اقتباس میں ایک اور اہم بات کے انور سدید نے شاعری کا باقاعدہ آغاز اُردو نظم سے کیا۔ لیکن اُن کی بیاض اور "اوراق" میں اُن کی سب سے پہلے غزل کی اشاعت کے آثار ملتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء سے جہاں تک تنقید نگاری سے انور سدید منقطع رہا وہاں دیگر اصناف کی تخلیق بھی رُکی رہی۔ وزیر آغا کے کہنے پر جب انور سدید نے دوبارہ باقاعدہ تنقید اور تحقیق کا رُخ کیا تو ان دنوں میں انور سدید اوراق میں شائع غزلیات اور نظموں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ ۱۹۶۸ء کو اوراق میں اُن کی پہلی غزل شائع ہوئی۔ اس کے بعد اُن کی ابتدائی نظموں میں "پتھر"، "نروان" اور "زمین" شائع ہوئی۔ اُن کی ابتدائی غزل میں رومانوی رنگ غالب تھا۔ لیکن ہر شعر الگ موضوع لیے منفرد جدت کا حامل اسلوب بیان تھا۔

"آرزو نے جس کے پوروں سے تھا سہلایا مجھے
راکھ آخر کر گیا اس چاند کا سایہ مجھے
گھپ اندھیرے میں بھی اس کا جسم تھا چاندی کا شہر
چاند جب نکلا، عجب منظر نظر آیا مجھے
میں بساط گل کو ترسا عمر بھر انور سدید
آج پھولوں پر لٹا کر تو نے لرزایا مجھے"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۸۹)

انور سدید نثر کی طرح شاعری میں بھی تسلسل کے ساتھ طبع آزمائی کرتے رہے۔ ۱۹۶۸ء سے ۲۰۰۹ء تک اوراق، ماہ نور اور دیگر رسائل میں اُن کا کلام چھپتا رہا۔ اُن کا زیادہ تر کلام اُن کی بیاض میں محفوظ رہا۔ انہوں

نے شاعری کی بیاض کو امسال ترتیب دی تھی۔ اُن کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی دو بیاض موجود ہیں۔ پہلی بیاض کے آغاز میں شعری مجموعوں کے عنوانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلام کو شائع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ناگزیر وجوہات کی بناء پر ایسا نہ کر سکے۔ انہوں نے تینوں مجموعوں کو "بقلم خود"، "پرندہ سفر میں" اور "صلعم" عنوان تجویز کیئے ہیں۔ "صلعم" میں نعت، حمد، منقبت اور سلام پر مبنی شاعری ہے۔ جب کہ "بقلم خود" میں آزاد نظم، پابند نظم اور قطعات شامل ہیں۔ جبکہ "پرندہ سفر میں" صنف غزل پر مشتمل ہے۔ غزلیات کے اس مجموعے میں ۴۴ غزلیات شامل ہیں۔ "پرندہ سفر میں" اُن کی حیات میں ۲۰۰۹ء کو مقبول اکیڈمی، لاہور سے شائع کی گئی ہے۔ مجموعہ کا انتساب "شاہد شیدائی" کے نام ہیں۔ جب کہ دیگر کلام غیر مطبوعہ اُن کی بیاضوں میں محفوظ ہیں اور بہت سا کلام مختلف رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔

انور سدید بسیار نویس اور صاحب طرز ادیب کے ساتھ ساتھ ایک پختہ شاعر بھی تھے۔ اُن کا شعری سرمایہ مختصر ہے۔ لیکن اپنے معیار اور نمونے تخیل کی وہ سے منفرد اور اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے شاعری میں جس خلوص، صداقت اور زورِ بیان کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے قاری کے دل میں مولانا کو ایک ماہر سیاست دان، صاف گو شاعر اور صداقت شعار صحافی کی حیثیت کے ساتھ ساتھ بطور ایک شاعر کے بھی زندہ رکھا ہوا ہے۔

انور سدید نے دیگر ادیبوں کی طرح تنقیدی نثر میں اتنا نام کمالیا ہے کہ اُن کی شعری کاوشوں کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں گئی ہے۔ اُن کا شمار بھی اُن نثر گاروں میں ہوتا ہے۔ جن کی شاعری اُن کی نثر تلے دب کر رہ گئی۔ مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور فکر تونسوی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب جیسے نظر نگار کی شاعری بھی اب کسی کو یاد نہیں ہے۔ اُردو ادب کے بڑے ناقدین مثلاً پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر خورشدی الاسلام اور دیگر کی شعری کوششوں کا اعتراف ادبی زبان میں کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا حال ان سے مختلف نہیں ہے۔ انور سدید کی تنقید نگاری میں مدلل انداز قاری کو اپنا ہمنوا اور ادبی کرشمے عقل کو حیران کر دیتی ہے۔ تنقید میں اُن کی ذات قاری کے اوسان پر چھائی رہتی ہے۔ اُن کی شاعری بھی جاذب نظر ہے اور نئے جہانوں کے در وا ہوتے ہیں۔ انہوں نے بہت کم اشعار کہے لیکن ان کی غزلوں، نظموں اور حمدوں کا عقبی منظر انتہائی وسیع ہے۔ علیم صبا نویدی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"انور سدید نے غزل میں زندگی کو، زندگی میں غزل کو یکساں طور پر برتا ہے ۔اُن کے ہاں بلا کی بے ساختگی ہے اور وہ شعر کے ساتھ ذہن میں پیکروں کو ابھارنے کا عمل بھی جاری رکھتے ہیں ۔ کہیں شوخی ہے کہیں غمازی کہیں سنجیدگی اور کہیں معصومیت۔ وہ غزلوں کے ہر شعر میں انسانی وجود کو مختلف پیشوں میں ابھارتے، سکیڑتے ملتے ہیں۔ اسی لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انور سدید کے کثیر العباد نظر و خیال نے اظہار میں کئی پیکر رکھ دیئے ہیں اور شعر کے مختلف لفظ آپ خود علائم کا روپ ڈھال لیتے ہیں۔ اور خیال میں ندرت پیدا کر دیتے ہیں۔"(۶)

تقسیم ہند کے بعد اگر پاکستانی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اُردو شاعری کے رجحانات سامنے آتے ہیں۔ انور سدید نے شاعری کا آغاز اگرچہ بچپن میں ابتدائی تعلیمی دور سے کیا۔ لیکن باقاعدہ شاعری کا سرا ہمیں ۱۹۶۸ء سے اوراق، ماہنامہ کراچی اور دیگر رسائل اور اُن کے بیاض سے ملتا ہے جس میں وہ باقاعدہ اور تسلسل کے ساتھ ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس دور کے یہ چار رجحانات اہم ہیں۔ جن سے اُن کی شاعری کس حد تک متاثر ہے تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ فسادات کا المیہ

۲۔ ہجرت کا منظر

۳۔ سیاسی عدم استحکام اور مارشل لاء

۴۔ نئے نظام کا حمایتی ادب

فسادات کے واقعات میں انسانی جانوں کا زیاں اور اس پر دُکھ درد اور غم کا اظہار کیا گیا۔ افسانہ نگاروں کے ہاں اس موضوع پر زیادہ کھل کر اظہار کیا گیا ہے ۔ لیکن اُردو شاعری بالخصوص غزل میں اس کا نام تاثر گہرے دُکھ اور درد کی صورت میں واضح ہوئی۔ شاعری میں اس موضوع کے نمائندہ شاعر ناصر کاظمی ہے۔ ان کی شاعری میں ماضی کی یاد مستقل استعارہ بن گئی۔ دوسرا رجحان ہجرے کے پس منظر میں نمودار ہوا جس میں ہجرت کا دُکھ اور چھوڑی ہوئی زمین کی محبت اور نئی جگہ آبادکاری کے مسائل موضوع سخن بنے ۔ ایک اور رجحان جو کہ آزادی کے بعد نئے وطن میں قیام اور خوابوں کی تعبیر، ارمانوں کی تکمیل کے تصور کا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد لوٹ کھسوٹ کے نظام سے لوگ جلد بے زار ہوئے۔ خوابوں کا ٹوٹنا، یاست نااُمیدی کا اظہار

اُردو شاعری کا موضوع رہا۔ جو "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" اور یہ "شب گزیدہ سحر" کی صورت میں بہت نمایاں ہوا۔ ان عام رجحانات کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا۔ جو تمام معاشرتی حالات ، سیاسی نظام میں قومی ادب کے فروغ میں محو تھا اور نئے نظام کو قابل قبول بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ فسادات کے واقعات، ہجرت کے مسائل، سیاسی عدم استحکام اور مارشل لاء کے قیام، حالات کے بہتر ہونے، مطمئن اور خوش فہم طبقات کے رُجحانات نے اُردو غزل کو ایمائیت و اشاریت اور مزاحمتی رویے کی طرف دھکیلا۔ اُردو غزل جو شروع روبہ زوال دور سے ہوئی۔ یہ سفر طے کرتی ہوئی اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بھی زوال کے یہ اثرات واضح طور رکھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس میں ایک استعاراتی اور مزاحمتی رویہ واضح نظر آتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد اس ضمن میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "اُنیسویں صدی کی غزل میں خصوصاً دو رجحانات نمایاں ہیں۔ اول یاسیت اور آہ بکا کی منتشر لہریں اور دوم مقصدیت کا ایک کچا پن، بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں اقبال کے جدید تصورات اور فرد کی آزادی کے تصور نے غزل کو نئے مزاج سے آشنا کیا یہ پوری صدی انکشافات کی صدی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ صدی نو آبادیاتی نظام کے ٹوٹنے کی صدی بھی ہے۔ اگرچہ اس صدی کے اختتام پر ایک نئی طرز کا نو آبادیاتی نظام ملٹی نیشنل کی صورت میں وجود میں آچکا ہے۔ اس صدی کے نصف آخر اور کچھ پہلے یعنی جنگ عظیم دوم کے بعد کئی ملک آزاد ہوئے اور بظاہر اقتدار تعالیٰ لوگوں کو اقتدار کی مسند پر بٹھایا گیا ہے۔ یہ سامراج ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور آقا بدیسی کی بجائے اب دیسی ہو گیا ہے۔ پاکستانی غزل کے ابتدائی دور ہی میں اس بے اطمینانی کا تاثر نمایاں ہونے لگا تھا۔ جو رفتہ رفتہ گہرا ہوتا گیا۔" (۷)

۱۹۶۰ء کی دہائی میں سیاسی عدم استحکام اور ابتر معاشی اور سماجی صورتحال نے نئے فکری اور سماجی مسائل کو جنم دیا۔ جس کی وجہ فکری بے ربطی کا احساس اُجاگر ہوا اور ایک سیاسی خلا پیدا کر دیا۔ غزل میں موضوع کے ساتھ ساتھ فنی اور لسانی بحثوں نے بھی اہمیت اختیار کر لی۔ جس سے غزل کا نیا دور شروع ہوا۔ اس نئے دور کے نمائندہ شاعروں میں ظفر اقبال، شکیب جلالی اور شہزاد احمد نمایاں تھے۔ جنہوں نے غزل کو فکر و اسلوب دونوں سطحوں پر الگ الگ متعارف کرایا۔ غزل کے موضوعات لاشعور کے تجسیمی اظہار اور سرمئی

دھند میں لپٹے پیکروں، لہو رنگ تصویروں اور دیہاتی فضا کے استعاروں، رومانویت اور نفسیاتی گرہ کشائی اور شہری زندگی کے اظہار کے طور پر نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر رشید امجد اس عہد کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"پیکر سازی کی اس روایت اور انداز نے نئی غزل میں نئی لفظیات ہی کو روشناس نہیں کرایا بلکہ باطن کے سفر کی روداد کو ایک زبان دی۔ معاشی اور سیاسی ابتری نے جس بے سمتی کو جنم دیا تھا۔ اس نے اجتماع کے بجائے ذات کو اہمیت دی اور باطنی تشخص اور اپنے اندر دوسری ذات کی تلاش اور ذات کے آئینے کو جنم دیا۔ تصوف کی روایت میں شاعر کو اپنے اندر ڈوب کر ایک ازلی مسرت سے ہمکنار ہونا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس سمت اور آئیڈیل نہیں تھا۔ معاشرتی شکست وریخت نے اس کے خوابوں اور تمناؤں کو بھی توڑ پھوڑ سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اندر باہر ایک ہی موسم تھا، خزاں کا موسم۔"(۸)

۷۰ کی دہائی میں سقوط ڈھاکہ، سیاسی عدم استحکام اور مارشل لاء کے نفاذ نے غزل کے موضوع کو یکسر تبدیل کر دیا۔ اس دور میں اُردو غزل نئے مزاج اور ذائقوں سے آشنا ہوتی ہے۔ جمہوری آزادیوں کی تحریک، سیاسی تحریکوں اور دیگر واقعات نے شعر و ادب کو بہت متاثر کیا۔ ۶۰ کی دہائی میں جدیدیت فروغ پاکر جدید غزل کی صورت میں ابھر کر آتی ہے۔ اُردو غزل کے اس دور کے نمائندہ شاعروں میں احمد فراز، منظور عارف، جاوید احمد، منیر نیازی، فیض احمد فیض، جلیل عالی، حمایت علی شاعر، اکبر حمیدی، سبط علی صبا، سجاد باقر رضوی، شبنم رومانی، شفیع ضامن، شوکت کاظمی، ظفر اقبال، احمد ندیم قاسمی، یوسف حسن، افتخار عارف، ثروت حسین اور اظہار الحق شامل ہیں۔ انہوں نے غزل کو نئے موضوعات سے آشنا کیا، مسلم تہذیب کی بازیافت، مٹی کی شناخت، مذہبی علامتوں سے نئے معنوں کی اختراع، وطن سے محبت، انسانی رشتوں کا تقدس، ہجرت اور عشق و محبت کی اقدار کی پاسداری جیسے موضوعات منفرد لہجوں میں تشکیل پاتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً

"میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکاں میں رہتا ہوں اسکو گھر کر دے" (مہر و نیم، افتخار عارف، ص ۱۰۷)

ان جدید غزل کے شعراء نے سماجی شعور کو ایک نیا احساس کا نام دیا اور شاعری نئے رنگ میں منظر عام پر آئی۔ اس نئے انداز اور مزاحمت کے رویئے نے فن کی نئی ریت ڈالی اور غزل کی ایمائیت و اشاریت نے

اسے ہفت رنگ میں تبدیل کر دیا۔ نئی نسل کے غزلوں کے موضوعات میں سماجی طنز بھی ملتا ہے۔ بے اطمینانی، ارمانوں کا ٹوٹنا، عدم شناخت، افراتفری اور انتشار کا منظر تقریباً ہر دور میں علامتوں، استعاروں اور کلاسیکی تلازموں کی شکل میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد ۷۰ کی دہائی میں اُردو غزل کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

"قیام پاکستان سے ساٹھ کی دہائی تک ہونے والی سیاسی و سماجی شکست وریخت اور زوال ستر کی دہائی میں وقتی طور پر ایک انجام کو پہنچا اور جمہوریت کی ننھی سی کرن نمودار ہوئی۔ معاشرے کے مجموعی سفر میں زمین اور قومیت کے احساس ابھرے اور سفر کا رُخ باطن سے خارج کی طرف مڑنے لگا۔ لیکن سات سال بعد ہی ڈرامے کے کردار اپنے اصل روپ میں سامنے آ گئے اور احساس ہوا کہ قیام پاکستان سے ۱۹۸۵ء کے مارشل لاء اور ۱۹۶۸ء کی تحریک سے ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء تک کھیلا جانے والا ڈرامہ دراصل ایک ہی تھا۔ صرف اس کے سین اور کردار ہی مختلف تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ ایکٹر ایک تھے۔ صرف ان کے میک اپ الگ الگ تھے۔ ۱۹۷۷ء کے مارشل کا رد عمل ۱۹۶۸ء کے مارشل لاء کے مقابلے میں شدید تھا ۱۹۸۵ء کے مارشل لاء کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن علامت و تجرید اور دبیز استعاراتی انداز نے زبان و بیان اور ہیئت و تکنیک کی ایسی بحثیں چھیڑ دیں جن کی وجہ سے موضوع کی طرف کا حصہ بن سکی۔ لیکن ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء اور اس دوران بھٹو کی پھانسی نے مزاحمتی رویے کی ایک نئے دور کا آغاز کیا جو آہستہ آہستہ غزل کی ایک توانا آواز میں تبدیل ہو گیا۔ ۱۹۷۹ء اور بعد کے تین سالوں کی غزل کا مطالعہ کیا جائے۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ غزل کے محبوب نے ایک نئی معنویت اختیار کر لی ہے اور رقیب و مقتل اور باغ و خزاں، گل چیں وصیاد کے نئے معنی ہو گئے ہیں۔" (۹)

بالا بحث کے زد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اُردو غزل سماجی حالات و واقعات کے موضوعات مزین ہیں۔ آزادی کے بعد سے لے کر حال تک معاصر شعراء کی شاعری ہر دور کے معاشرتی، سیاسی منظر نامے کی عکاس اور جذباتی سطح پر ذات کی وجدانی کیفیات کی ترجمان نظر آتی ہے۔ اُردو غزل ہر دور میں اپنی وسعت، رمزیت، اشاریت اور رمزیت میں مقبول رہی۔ نئی نسل کے شعراء نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور توانائیوں سے

اُردو غزل کی ارتقاء اور فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انور سدید کا کلام البتہ کم ہے۔ لیکن اُن کی شاعری بھی ان تمام ادوار کی ترجمان ہیں۔

(ب) انور سدید کی غزل کا فنی و فکری مطالعہ:

انور سدید نے جب ادبی زندگی کا آغاز کیا تو اس دور کے ادیب شعراء ادب کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریکوں میں بھرپور حصہ لے رہے تھے۔ ادب کے ساتھ سیاسی فریضہ بھی سرانجام دے رہے تھے۔ آزادی کی تحریکوں کا زور و شور تھا۔ عوامی اور ملی شاعری کا رجحان عام تھا۔ اس وجہ سے ان کے ہاں عصری تقاضوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کی شاعری میں بھی سماجی مسائل اشعار میں منفرد رنگ کی صورت میں موجود ہیں۔ انہوں نے سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور معاشرتی مسائل کا اظہار کہیں واضح الفاظ میں اور کہیں اشاروں، استعاروں، کنایوں اور علامتوں کی صورت میں کیا ہے۔ اُن کو علامت اور استعاروں کے استعمال میں مہارت حاصل تھی۔ اُن کی علامتیں مشکل پسند نہیں ہیں جن کو ٹٹول کر مفہوم تلاش کیا جائے۔ بلکہ قاری گرد و پیش کے حالات سے اُن اشعار کے اندر چھپے مفہوم کو تلاش کر سکتا ہے۔ ذہن کو کھول کر شعر کے اندر موجود پرتوں کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً

"ہر سمت سمندر ہے، ہر سمت رواں پانی
چھاگل ہے مری خالی، لوگو ہے کہاں پانی۔"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۲۱)

اُن کے اشعاروں میں تندی، تیزی اور شور نہیں ہے۔ بلکہ آسان، سہل اور عام فہم صورت میں ملتے ہیں۔ اس شعر میں انہوں نے سمندر، پانی اور چھاگل لغوی مطلب میں نہیں بلکہ انسان کے تہذیبی کرب، روحانی اذیت، معاشرتی ناانصافی اور مادی ترقی کے ہوتے ہوئے لوگوں کی بنیادی ضرورت سے محرومی کو اچھے اور بڑی خوبصورتی سے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کے اشعار کا رنگ جداگانہ ہے۔ گو کہ وہ ترقی پسند شاعر نہیں تھے۔ لیکن اُن کا خیال، سوچ اور رویے ترقی پسندوں سے مختلف نہیں ہے۔ اُن کے ہاں بھی ترقی پسند ادیبوں کی طرح استحصالی طبقات کے حق میں نہیں تھے۔ اور نہ ہی زندگی میں ارتقاء کے نظریے کے مخالف تھے۔ انہوں نے اشعار کی اثریت اور فن کے حدود کے اندر رہ کر ظلم و جبر کے خلاف اپنی آواز ہمیشہ بلند رکھی۔ مثلاً

"جس کھیت کو دہقاں سے مل جاتی تھی کچھ روزی
دریا کی طرح اس پر دیکھا ہے رواں پانی"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۲۲)

اس شعر میں انہوں نے "ہر خوشہ گندم کو جلا دو" نئے فکر میں جداگانہ انداز میں پیش کیا۔ جو کہ مٹھاس اور شیرینی سے کہی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے روایت کو نئے منفرد خیال میں بیان کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ اُن کے اشعار کی خوبی ہے کہ اُن میں بہت سے ابھار ہیں۔ اُن کی الفاظ کو پرکھنے سے پوشیدہ معنوں سے نقاب اُٹھتے ہیں۔ اور قاری کے سامنے خوشنما منظر کی کائنات سامنے آتی ہے جو روح کو سکون اور ذہن کو جلا بخشتی ہیں۔ اسی غزل کے اگلے شعر میں پانی کو ایک نئی صورت دے کر الگ معنی مراد لیے اور انقلاب کے ذریعے بہتر زندگی کی تلاش پر فکر کو اکساتا ہے۔ اُن کے پاس اپنے خیالات کو من و عن دوسروں تک پہنچانے کے لیے الفاظ کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ وہ بلا تکلف اپنے دل کی بات ہو بہو اپنے قاری تک پہنچا سکتے ہیں۔ وہ اپنے مطالب و مدعا کو حسین و جمیل الفاظ کے رنگین پیکر میں سجا کر قاری تک پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ انور سدید کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اشعار میں زندگی کے حقائق اپنی ٹھوس شکل میں موجود ہیں۔ اُن کے یہ اشعار جن میں زندگی انسانی گناہ سے پریشان حالات، افسردگی اور عصر حاضر میں جنم لینے والے ظلم و جبر کا ذکر باریکی سے کیا گیا ہے۔

"میز پر رکھے ہوئے اخبار کے اوراق میں
بج رہی ہیں ہے زور سے رشتوں کی ڈھولک دیکھ لے
موم کے پیکر سجے ہیں ریشمی ملبوس میں
ہاتھ لگتے ہی پگھل جائیں گے بے شک دیکھ لے"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۹۴)

نظام سرمایہ داری میں جنم لینے والی فریب کاری اور سرکاری سطح پر حکمرانوں کی بے حسی کا فن کارانہ انداز میں اظہار ملتا ہے۔ لیکن ان کے اس پیرائیہ انداز میں کہیں بھی بات کہنے کے لیے خطیبانہ رنگ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ الفاظ کی خوبصورتی اور اپنی فنی پختگی کے بل بوتے پر نئی ترکیبیں تراش کر ایک ایسا حسین نقطی پیکر تیار کر لیا ہے۔ جو قاری کی حسیات کو جھنجھوڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی نظروں کے سامنے فکر و نظر کے کئی روشن افق پھیلا دیتا ہے۔ اُن کا یہ سلیقہ اور فن اپنے ہم عصر شعراء میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ اُن کی علامتی رنگ میں کہی ہوئی غزل میں ہماری آنکھوں کے سامنے حالات کا ذکر ملتا ہے۔ علامتیں اتنی مشکل نہیں ہیں بلکہ الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھتے ہیں تو وہاں اور ہی قسم کا جہانِ معنوی جلوہ ریز نظر آتا ہے۔ اور اس کے علاوہ

اُن کے ان اشعار میں سرکشی کے مقابلے میں عجز و انکسار کی بالادستی دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے ہاں درخت کا لفظ اپنے اندر کئی علامتی مفہوم رکھتا ہے جو اپنی جگہ پر مختلف قسم کی معنوی حیثیت میں مستعمل ہیں۔ مثلاً

"کتنے تھے سایہ دار شجر رہ گزر کے ساتھ
اب رہ گزر ترستی ہے اپنے درخت کو
پتے نکل کے شاخ برہنہ کی نوک سے
دیتے ہیں ایک قبائے ننگے درخت کو
انور سدید مانگ دُعا تو اُٹھا کے ہاتھ
کاٹیں کبھی نہ وقت کے آرے درخت کو"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۹۸)

اُن کے اشعار میں درخت کا مفہوم تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ علامت نگاری کے فن میں اُن کو عبور حاصل تھا۔ بالا اشعار میں درخت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ بظاہر تو آسان علامتیں ہیں۔ لیکن ان علامتوں کے پیچھے گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔ درخت کی علامت کے پردہ میں زندگی کے ٹھوس حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ جن کا تعلق انسان کے ماضی اور حال سے ہے۔ سایہ دار درخت، ترستی ہوئی رہ گزر، شاخ برہنہ سے پھوٹنے والی کونپلوں کا درخت کو پتوں کی نئی قبا دینا اور شاعر کی یہ دُعا مانگنا کہ وقت کے آرے کبھی درخت کو نہ کاٹیں۔ ان کے عقب میں جہاں شاعر کا تصوف سے لگاؤ جھلکتا ہے۔ وہاں اشاروں، کنایوں کی زبان میں دقت کی ریت پر گزرتے چلے جانے والے قافلوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ جو اپنے پیچھے کتنی ہی انوکھی اور دلچسپ داستانیں چھوڑ جاتے ہیں۔ یوں بھی لگتا ہے کہ یہاں انور سدید نے سماجی تقاضوں کو تخلیق شعر کے وہبی عمل سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس نے اپنی ظاہر آنکھ کو خارج کا مشاہدہ کرنے سے باز رکھا ہے۔ لیکن اس کے اندر کی آنکھ اتنی سرکش ہے کہ اپنے فوکس میں وہ سارے منظر سمیٹ کر لے آتی ہے اور شاعر کو اپنی تخلیق کاری کی اساس غیر تراشیدہ جذبات پر رکھنے کی بجائے تہذیبی بلوغت کے عمل کو اپنانے پر مجبور کرتی ہے۔ خیر الدین انصاری انور سدید کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

"سچ تو یہ ہے کہ ہم باہر کی آنکھ کو کتنا ہی بند رکھنے کی کوشش کریں ہمارا ذہن باہر کی طرف پھیلے ہوئے منظر سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انور سدید کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ سیاست سے بھاگتا ہے۔ پھر بھی اس کی نظر

عالمی سیاست کی طرف اُٹھ ہی جاتی ہے۔ اس کی ایک "فلسطین کے لیے ایک نظم" کا حوالہ ضروری ہے۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تیری دنیا کا کوئی بھی شاعر عالمی سیاسی حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ فرق صرف کسی شاعر کے ٹھوس حقائق سے نتائج اخذ کرنے کے بعد انہیں اپنی شاعری کا جزو بنانے کے عمل میں ہے۔ کچا اور جذباتی شاعر حقائق کو سطح کے اوپر ہی رہنے دیتا ہے۔ جب کہ ایک خالص اور سچا شاعر اپنی مشاقی کے زور پر ان باتوں کے لیے ایسا پیرائیہ اظہار اختیار کرتا ہے کہ اس کے وہ ذاتی خیالات و میلانات کسی سیال شے کی مانند زیریں لہروں تک چلے جاتے ہیں۔ جنہیں شعریت اپنے خول میں بند کر لیتی ہے۔"(۱۰)

انور سدید ایک سچے اور خالص ادیب اور شاعر تھے۔ مذہبی طور پر وہ پختہ انسان تھے۔ اُن کی مذہبی شاعری سے ایمان کو طاقت اور رُوح کو تازگی ملتی ہے۔ مذہبی شاعری ان کا مقصد حیات نہیں تھا اور نہ ہی مذہب کو باندی سمجھتا ہے اور نہ ہی فن سے انہوں نے اپنے نظریات کا پروپیگنڈہ کیا ہے۔ وہ تو ایک حسن کار ہے اور اظہار کے لیے خوبصورت پیرائے کو اپنانا ضروری خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے اسلامی شاعری سے اسلامی فلسفہ حیات اور نظام زندگی کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے:۔

"روشنی اب تک زمانے کو عطا کرتی ہے یہ
منبع انوار ہے ساری فضا اس شہر کی"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۶۹)

اُن کے نزدیک شاعری اس وقت جنم لیتی ہے۔ جب شعری مواد شعری آہنگ سے غلط ہے اور شاعر کا ضمیر ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہو۔ ایسی باتوں کے لیے غزل کا دامن پھیلا ہوا ہے۔ غزل اُردو زبان کی وہ صنف سخن ہے۔ جس پر ماضی میں کئی بھاری دور گزرے ہیں۔ لیکن یہ ہر دورِ ابتلاء میں صعوبتیں جھیلتی ہوئی بھی کامران و کامگار ہو کر نکلتی ہے اور ہر آزمائش کے بعد اسکے جسم و جان میں پہلے سے زیادہ حسن اور توانائی آتی رہتی ہے۔ اب بھی تقریباً سبھی قابل ذکر شاعر اس صنف میں طبع آزمائی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ لکھنی بھی آسان ہے۔ البتہ اسے عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا سخت مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی بہت کم ایسے شاعر موجود ہیں جنہیں صحیح معنوں میں جدید شاعر کہا جاسکے۔ بعض شاعر جدت

پسندی کو سمجھنے میں سخت قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ غزل میں اجنبی اور نامانوس الفاظ کے دخل کو جدت پسندی کی معراج سمجھتے ہیں۔ جب کہ غزل جدید غزل میں نئی ڈکشن اور نئے تصورات کی موجودگی انتہائی ضروری ہے۔ اور اس کا رنگ اتنا نکھرا نکھرا ہونا چاہیئے کہ قاری کا دل گواہی دے کہ اس سے پہلے غزل انہوں نے نہ پڑھی ہو۔ انور سدید نئے تصورات کے اس کارواں میں شامل ہیں جس نے مجید امجد کی نظم اور شکیب جلالی کی غزل کے اسلوب کی روشنی سے نئی روشنی کو جنم دینے کی کوشش کی ہے۔ شکیب جلالی کی غزل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید غزل کیا ہے۔ انور سدید نے بھی اُن کی طرح غزل کہنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ اُن کا کمال ہے کہ اُن کی غزل فکری اور فنی سطح پر اپنی الگ پہچان کرانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اگرچہ شکیب کو بے بسی، لاچارگی، بے یقینی اور درد و غم کا شاعر کہا جاتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلہ وہ مصائب کو جھیلنے کے لیے ارادوں اور امنگوں کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ اور اپنے قاری رحم نہیں بلکہ حوصلوں، ارادوں اور جرأت کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ وہ دشواریوں سے نہ ٹوٹنے والا ہے اور نہ ہی کھوکھلی حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ مردانہ وار ہمت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

"لوگے ساتھ مرے آگہی کی سرحد تک
یہ راہگزر اترتی ہے گہرے پانی میں
کیوں رو رہے ہو راہ کے اندھے چراغ کو
کیا بجھ گیا ہوا سے لہو کا شرار بھی"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۵۹)

انور سدید بھی شاعری میں شکیب کی طرح مصائب کی یلغار، رنج و الم اور دکھ درد میں حالات کے ساتھ نبرد آزمائی کے لیے حوصلے اور ہمت کا درس دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور حالی کی طرح ہر حال میں خوش رہو کی ترغیب دیتے ہوئے قناعت کرنے کا کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر کہ:

"دیوار پر لکھا نہ پڑھو۔ اور خوش رہو
کہتا ہے جو گجر نہ سنو۔ اور خوش رہو
کانٹے جو دوستوں نے بکھیرے ہیں راہ میں
پلکو سے اپنی آپ چنو۔ اور خوش رہو۔"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۱۷)

انور سدید کی شاعری کا لب و لہجہ نشاطیہ ہے۔ اُن کی شخصیت متوازن اور مستحکم تھی۔ مضبوط قوت ارادی، توانائی اور صلاحیت جو اُن کی ذات کا شاخسانہ تھی۔ اُن کی شاعری میں بھی ان کے کردار کی عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے جس دور میں شاعری کی وہ دور انحطاط اور استحصال کا تھا اور ہر طرف سے پسپائی اور شکست و ریخت کی آوازیں آرہی تھیں۔ لیکن انور سدید نے ادراک اور شعور کو سماجی بیداری سے ہم آہنگ کیا تھا اور صداقت کی فتح پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ اُن کا مزاج اور رویہ حسرت موہانی کے اس شعر کے مصداق ٹھہرتا ہے۔

"کچھ غم دِل ہی ہے مخصوص نہیں لذت غم
خوشی اسی حال میں جو ہر بھی ہے آزاد بھی ہے"

(کلیات حسرت موہانی، حسرت موہانی، ص۲۵)

انہوں نے غزل کو حزن، ملال، شکوہ شکایت، فریاد، نااُمیدی اور مایوسی کے تصور سے پاک کیا ہے۔ انسان کے ذہن پر اچھا یا زندگی بخش تاثر دینے کے لیے رونے دھونے سے نجات دلا کر حقیقت کے قریب لے آئے اور نئی روایات کا اضافہ کیا ہے۔ اُن کے نزدیک شاعری زندگی آموز ادب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی یہ غزل ملاحظہ کریں۔

"خود ہی منظر نیا بنایا ہے
آپ ہی اس کو پھر مٹایا ہے
زندگی بھر جسے اُٹھایا تھا
بوجھ وہ سر سے خود گرایا ہے۔"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۲۵)

انور سدید کے ہاں موضوعات تنوع ہیں۔ زندگی کے متعلق اُن کا تصور اسلامی ہے۔ اُن کی غزل میں زندگی کو جتنے پہلوؤں، صورتوں اور زاویوں میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے حسن اور بدصورتی کے بارے میں اُن کا مشاہدہ اور تجزیہ اُن کے شعر و ادب میں دلکش اور تنوع رنگوں میں ملتا ہے۔ اُن کے نزدیک زندگی حقیقت کا سایہ، پس پردہ منظر کی حقیقت، عارضی گھر اور سُرخ شعلہ کی علامتوں سے معنوی خیز انداز میں بیان کرتے ہیں ۔اُن کے ہاں یہ تصور وزیر آغا کے قریب قریب نظر آتا ہے۔

"عجب طرح سے گزاری ہے زندگی ہم نے
جہاں میں رہ کے نہ کار جہاں کو پہچانا" (غزلیں، وزیر آغا، ص ۶۵)

انور سدید کے ہاں زندگی حالات و واقعات کے ساتھ بدلتی جاتی ہے اور ایک تغیر برپا کرتی نظر آتی ہے۔ جدید غزل میں یہ موضوع دیگر شعراء کے ہاں ہمیں مختلف موضوعات کی صورت میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر:

"کچھ اس طرح سے گزاری ہے زندگی جیسے
تمام عمر کسی دوسرے کے گھر میں رہا"

(،نایافت، احمد فراز، ص ۹۶)

"منیرؔ اس خوب صورت زندگی کو
ہمیشہ ایک سا ہونا نہیں ہے"

(ماہ منیر، منیر نیازی ص ۳۳)

بیسویں صدی میں اُردو غزل نئے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہی۔ جس کی وجہ اُن کے موضوعات میں انقلاب کی کیفیت بپا ہوئی۔ "زندگی" جو کہ شاعری کا لازمی جزو ہے۔ بدلتے ہوئے عصری تناظر میں اُس کی جستجو اور منظر مختلف ملتا ہے۔ ایک اور جگہ انور سدید استفہامیہ انداز میں زندگی کے متعلق یوں گویا ہیں:

"زندگی کیا ہے؟ اِک حباب سخن
بج رہا جس میں ہے رباب سخن"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۴۱)

اُن کے ہاں زندگی ایک مٹائی ہوئی تصویر، اک گراں بوجھ، حقیقت کا سایہ، بھرم اور عارضی گھر کا کرایہ ہے۔ انہوں نے جس دور میں شاعری کی وہ دور معاشرتی، سیاسی، معاشی پسماندگی اور عدم استحکام کا دور تھا۔ کائنات جدت کی طرف پلٹا کھائی جارہی تھی۔ شعراء اس جدید دور کے تناظر میں شاعری کر رہے تھے۔ زبانی انقلاب اور تغیر کے اس دور میں "زندگی" کو معنوی خیز استعاروں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس دور کی غزل کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"جدید شاعری کو بدلتے ہوئے حالات کے نئے تقاضوں نے پیدا کیا، جب
زندگی ایک نئے موڑ پر آگئی اور اس کا قافلہ نئی راہوں پر چل نکلا اور اس کے

نتیجہ میں جب ایک نئی فضاء پیدا ہوئی، ایک نئے ماحول کا وجود ہوا تو شاعری
بھی بدلی اس میں تغیرات پیدا ہوئے اور وہ اک انقلابی کیفیت سے دوچار
ہوئی۔ بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں نے شاعری میں ان گنت موضوعات کو
پیدا کیا، ان گنت معاملات و مسائل اس میں پیش کیے جانے لگے۔" (۱۱)

انور سدید جس عہد میں اُردو غزل لکھ رہے تھے، وہ عہد معاشرتی قحط الرجال کا تھا۔ شعراء عصری حقیقت کو اپنے بطون میں سمونے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ قدروں کی شکستگی، مادی فائدوں کے حصول کی بھاگ دوڑ نے لوگوں سے طمانیت چھین لی تھی۔ زندگی المیے کی صورت اختیار کر گئی۔ متعدد شعراء کی طرح انور سدید کے ہاں بھی ماضی کی طمانیت ساعتوں کی تجدید کا رُجحان نظر آتا ہوا ملتا ہے۔ مثال کے طور پر:

"طمانیت مجھے دیتی ہے تازگی اس کی
کبھی جو چلنے لگی مثلِ آبِ جو ترا غم"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۹۵)

رجحان کی صورت پذیری سیاسی اور سماجی حالات کے پیش نظر آتی ہے۔ بلاشبہ ہر شاعر نے اُن اثرات کو اپنے حوصلے اور ظرف کے مطابق ہی قبول کیا ہے۔ لیکن داخلی خوف، بے کیفی، بے رغبتی اور بے تکلفی کی قدر تمام شعرا کے ادب میں مشترک چور پر موجود ہے۔ اس عہد کے دیگر شعراء کے کلام میں بھی یہ رجحان "معمول" کی صورت اختیار کرتے ہوئے ملتا ہے۔ مثال کے طور پر:

"گئی گزری مسافت کے پڑاؤ پر رکے رہنا
سمند عمر کو پیچھے کی جانب موڑتے رہنا
کبھی اَن دیکھے نادیدہ جزیروں کا سفر کرنا
کبھی پہروں یونہی بیٹھے خلا میں گھورتے رہنا"

(اک ذرا شام سے پہلے، غلام جیلانی اصغر، ص ۴۷)

"ہے اہل چمن کو تیری خوشبوئے قبا یاد
رکھتے ہیں صبا کو وہ دعاؤں میں سدا یاد"

(چراغ صحرا، تابش دہلوی، ص ۲۵)

اُردو غزل میں عشق کا موضوع ہمیشہ غالب حیثیت رکھتا ہے۔ انور سدید کے ہاں عشق ایک ایسا طرز احساس ہے جس میں معاشی اور معاشرتی مسائل کی چاپ نظر آتی ہے۔ جو ردعمل کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس ردعمل میں اُن کی اندر کی صدا واضح نظر آتی ہے۔ اس احساس میں وہ اپنے وجود کو قائم رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غزل میں عشق کو ایک سچے اور حقیقی تاثر میں پیش کیا ہے۔

"وہ کج اداہیں گر تو نہ شکوہ کرو کبھی
بہتر ہے زہر عشق پیو اور خوش رہو"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۲۵)

اُن کے ہاں عشق مسائل حیات کے ہجوم میں روشنی کی وجود کی تلاش ہے۔ اور اعتبار ذات پیدا کرنے کی آرزو کرتا ہے۔ اس معاشرتی عمل پر انہوں نے معتدل اور متوازن اظہار کیا ہے۔ انہوں نے عشق کے موضوع پر غزل میں نئی مزاج سازی کی اور نئی روایت کو پروان چڑھایا ہے۔ انور سدید کا اُردو شاعری بالخصوص غزل کا مطالعہ وسیع تھا۔ شاعری بچپن سے اُن کا ذوق تھا۔ ولی سے اقبال تک کے ادب کو گہرائی اور گیرائی سے پڑھا۔ لیکن انہوں نے روایتی مضامین کو اتباع کی صورت میں نہیں اپنایا۔ انہوں نے اکتساب فیض کے لیے مزاج سے مطابقت رکھنے والی خصوصیات کو اپنے کلام میں منفرد صورت میں پیش کیا۔ جس پر تتبع کا گمان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ولی کے زمین پر کہی ہوئی غزل میں اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"کچھ مضامین غیب سے اترے
پھر تو کھلتا گیا ہے باب سخن
حسن خود اپنا ترجمان ٹھہرا
سامنے جب اُٹھا نقاب سخن
یہ ولی کی زمین ہے انورؔ
کھول تو بھی تو کوئی باب سخن"

(پرندہ سفر میں، انور سدید، ص ۴۳)

وہ اساتذہ سے کسب فیض کرنے اور داخلی، نفسیاتی امور کی طرف اشارہ کرنے کے لیے روایت کا سہارا لیتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ شعر کی عظمت بیان کرنے کے لیے موضوع مستعار لیتے ہیں۔ جن سے ان کی شعری علم کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اوپر بیان غزل میں مطلع کے بعد کا شعر "غالب" کے شعر "آتے ہیں

غیب سے یہ مضامین خیال میں " کا عکس ہے۔ لیکن الگ مضمون اور ولی کی زمین میں پیش کر کے ایک الگ رنگ میں پیش کیا ہے۔ ایک اور جگہ انہوں نے غالب کے شعر:

"رُو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

(دیوان غالب، مرزا اسد اللہ خان غالب، ص ۱۳۶)

اس شعر کو اپنے وجدان سے کچھ اس طرح ہم آہنگ کرنے کی سعی کی ہے۔

"ہر لمحہ اب نشیب کی جانب رواں ہیں ہم
نے باگ ہاتھ میں ہے، نہ پا ہے رکاب پر"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۲۸)

انور سدید نے اپنے وجدانی شعور کو پیش روؤں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں پیروی اور اتباع کا گمان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس سے دو چیزوں کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ کلاسیکی ادب کا وسعتی مطالعہ اور شعری عظمت کا اعتراف کرنا۔ اُن کی اس عنصر کی مثالیں کثیر ہیں۔ مجید امجد عقیدت اور اُن کی عظمت کے متعلق اُن کی بحر اور زمین میں اس طرح خیال کا اظہار کر رہے ہیں:

"چمن میں کھلتے ہیں جب ارغواں گلاب کے پھول
ابھارتے ہیں، غم رفتگاں، گلاب کے پھول
ہماری ذات کے آلام ہیں ہمارے ساتھ
ہیں تیرے تبسم کناں گلاب کے پھول
یہ نوحہ تیری زمین کا ثمر مجید امجد
تری زمین پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۱۱۱)

جہاں تک انور سدید کی کسب فیض کا تعلق ہے۔ یہ اُردو شاعری کی ہمیشہ روایت رہی ہے۔ تمام بڑے شعراء غالب سے اقبال تک نے کلاسیکی شعراء سے اثر لیا اور اپنے رنگ میں لکھا۔ شاعری اور ادب میں چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے۔ انور سدید نے کلاسیکی شعراء اور معاصر ادب کے ادیبوں، شاعروں سے بھرپور اثر لیا۔ اُن کا مشرقی ادب اور مغربی ادب کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا۔ اپنے وجدانی شعور، داخلیت اور نفسانی مطابقت

کے حامل عناصر کا اثر قبول کیا اور خوشہ چینی کی لیکن اپنا منفرد رنگ غزل میں پیش کیا۔ انور سدید کو جذبات نگاری پر ملکہ حاصل تھی، خاص طور پر عشق و محبت اور فطرت کے حسن کے متعلق جذبات کا اظہار کمال فن سے کیا ہے۔ اُن کے جذبات نگاری میں خیال انگیزی کلام کو رعنائی اور لطافت سے مزین کرتی ہے۔ اور محبت کے عالم میں یاد ماضی کی صورت میں اشک شوئی اور یاد دل میں کسک کی آواز کو شعر میں انور سدید اس طرح بیان کر رہے ہیں۔

"ماجرا کس کو سناتے ہم زباں کوئی نہ تھا
دوست تھے کتنے ہی اپنے، آشنا اِک بھی نہ تھا "

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۶۳)

"آنسو ذرا رُکیں تو کروں میں اُسے تلاش
جس کے بغیر دِل کا نگر بے چراغ ہے"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۷۱)

انور سدید کے ہاں عشق کا تصور بہت عظیم ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں محبت کو محبت کا نام دینے سے گریز کیا اور عشق کو حسن کا پابند، مجبور وفا اور دست دُعا کا پیکر کہا اُن کے نزدیک عشق انسان کی استحکام کا ذریعہ ہے اور محبوب کا خیال وقعت عاشق کی پذیرائی ہے۔

"میں خزاں دیدہ شجر کی طرح گمنام سا تھا
مجھ کو وقعت تری تصویر بنانے سے ملی"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ،ص ۸۱)

محبوب کی یاد شعراء کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ انور سدید کے ہاں بھی یہ موضوع منفرد رنگ میں ملتا ہے۔ محبوب کی یاد دِل میں کسک پیدا کر دیتی ہے۔ روز و شب کی گنتی میں ہر لمحہ شمار محبوب کی یاد کو کرتے ہیں۔ اور محبوب کی ملاقات اور وصل کو راز کہتے ہیں۔ وہ راز جو زندگی کو شادماں کرتا ہے اور جاوداں زندگی کا تاثر دیتا ہے۔ جبکہ جدائی کو مرگ ناگہانی قرار دیتا ہے۔

"میں نے روز و شب کی گنتی کی تو یہ مجھ پر کھلا
ایک بھی لمحہ تمہاری یاد سے خالی نہ تھا"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۶۳)

شب فرقت کو لگ بھگ تمام شعراء نے موضوع سخن بنایا ہے۔ انور سدید نے اسے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

"صبح کے وقت تو سورج نے مرا ساتھ دیا
شب کی دہلیز پہ کیوں مجھ سے جدا ہوتا ہے"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید،، ص۵۶)

انور سدید کے کلام کی ایک اور خوبی سادگی اور سلامت ہے۔ وہ سیدھے سادے الفاظ میں حکمت اور دانائی کی بات کر جاتے ہیں۔ اُن کے کلام کو اوسط درجے کا قاری سمجھ سکتا ہے۔ انہوں نے معاشرتی رویوں کو انتہائی سادہ الفاظ میں بیان کیا جو تہذیبی فلسفے حکمت اور دانائی کے قریب قریب باتیں ہیں۔ انور سدید کی غزل میں رسمی اور روایتی موضوعات کا اکثر ذکر ملتا ہے۔ لیکن انہوں نے روایتی کیفیات کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے جو کہ تغزل کے رنگ سے لبریز ہوتی ہے۔ انہوں نے محبت، عشق، محبوب کے حسن جیسے عالمگیر جذبات کو محسوس کر کے اس طرح واردات قلبی میں بیان کیا کہ اُن کی سادگی پرکاری سے بہت سے پہلو نکلتے ہیں جو کہ ان کی جذباتی بصیرت اور فنی پختگی کی دلیل ہیں اس کے علاوہ انور سدید کی غزل میں ذات کی افسردگی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ وہ انسانی اقدار کو اہمیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے احوال و آثار سے ان کی زندگی شادماں اور متوازن نظر آتی ہے۔ دیگر شعراء کی طرح کرب، درد اور تکلیف کے آثار نہیں ملتے ہیں۔ لیکن اُن کی غزل میں دُکھ کی گہری چاپ نظر آتی ہے۔ اُن کا درد معاشرتی رویوں اور انسانی رشتوں کے متعلق ہے جو کہ مختلف رنگ میں انہوں نے بیان کیا ہے۔۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں :

"سرِ مژگاں جو ستارہ سا نظر آیا تھا
غور سے دیکھا تو ایک گہرا سمندر نکلا"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید،، ص۸۰)

"چھو کے دیکھا تو وہ بے جان سا پتھر نکلا
ابنِ آدم مرے معیار سے کم تر نکلا"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید،، ص۷۷)

معاشرتی ناہمواریاں اور تہذیبی رویوں کا فقدان اُن کی غزل میں کرب اور درد کی صورت میں ملتا ہے۔ لیکن یہ درد اُن کی دِل کا متاع ہے۔ جو کہ اُسے متاع درد بھی انہوں نے کہا ہے۔ اس درد نے اُن کی

زندگی کو گراں کیا ہے اور دوستوں میں بیان کرنے سے وہ اپنا بوجھ کم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ بے راہ روی اور خلفشار کے دور میں ان کے ہاں انسانی عظمت کا احساس وافر ملتا ہے۔ وہ انسان کو اشرف المخلوقات مانتے ہوئے اسے کائنات کی بلند ترین ہستی مانتے ہیں۔ اُن کے ان اشعار میں انسانیت کی عظمت کے اعتراف کو مختلف رنگ میں پیش کیا اور بلند خیالی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ عظمت انسان کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں گناہ اور احساس گناہ کو غیر معمولی انداز میں بیان کیا ہے:

"مری غزل کا ہے انور سدیدؔ یہ حاصل
متاعِ درد مرے دوستوں میں بٹ جائے"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۵۶)

"پھرتے رہے اُٹھا کے گناہوں کا سر پہ بوجھ
پستے رہے ہیں وقت کی گردش میں عمر بھر"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۸۰)

انور سدید نے جس دور میں شاعری کی وہ دور جاگیر داری انحطاط، خلفشار کا تھا۔ انہوں نے اپنے طرز بیان سے اس دور کے پورے تمدن کو بند کیا۔ جس میں شکست وریخت کی آواز نہیں ملتی ہے۔ بلکہ اُن کا ادراک اور شعور سماجی بیداری سے ہم آہنگ تھا۔ جو کہ بھرپور توانائی کا حامل تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کی غزل میں لب ولہجہ نشاطیہ اور رجائیت پسندی ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں طغیانی صورت ہے۔ جو کہ منفرد اور دیدنی ہے۔ اس صورت میں اُن کی آواز بالواسطہ انداز اختیار کرتی ہے۔ اپنی آرزؤں کو دبانے کی بجائے اعلان عام کی سعی کرتی ہے۔ اُن کے ہاں یہ تاثر مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بعد احساسات کی ایک نئی لہر کے باعث آتا ہے۔ جس میں دُکھ، درد، کرب اور مزاحمت کی گہری چاپ نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر کہ:

"بے سہارا بھی جی ہی لیتے ہیں
آسماں کو ہے بے ستوں دیکھا"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۸۰)

"اس راہ نوردِ شوق کی منزل کہیں نہیں
درپیش جس کو ہوتا ہے ہر روز اک سفر"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۱۰۱)

ستر کی دہائی جو کہ عدم استحکام تقسیم بنگال کے واقعہ اور ایک نئی ہجرت نے غزل کے موضوع کو باطن کی طرف موڑا اور ایک مزاحمتی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ غزل کا محبوب ایک نئی معنویت اختیار کر لیتا ہے اور نئے انداز میں ایک فنی رچاؤ کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ وجدانی کیفیت کی پہلو بہ پہلو ستم ہائے روزگار کی کہانی، مزاحمت اور شہر آشوب کا رنگ منفرد صورت میں اُن کی غزل میں ملتا ہے۔ اخذ و استعارے کی یہ صورت اس دور کے دیگر نامور شعراء سے استوار کرتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں:

"شہرت عام میں زریں تمغے تھے دل کی تسکین
لیکن قبر کے کتبے پر کب درج ہوئے انعام"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۹۵)

"ہیپ لگتا ہے انورؔ یہ گھر کا سناٹا
ہوا اُڑا کے کہاں لے گئی مکینوں کو"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص۹۱)

اس عہد کے دیگر شعراء کے ہاں بھی یہ رجحان عام تھا۔ مزاحمت کا یہ رویہ سماجی طنز کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ بے اطمینانی اور خوابوں کی شکست و ریخت کے طویل منظر کو انہوں نے علامتی لبادے میں کچھ اس طرح اظہار کیا ہے۔ انور سدید کے ہاں بھی یہ تجزیہ جو کہ قومی استعارے کا روپ دھار لیتا ہے۔ ان کے اشعار میں منفرد رنگ میں ملتا ہے۔ وزیر آغا اس بارے میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"انہوں نے مزاحمتی شاعری کو مہم میں شامل ہونے کی بجائے وہبی سطح کی خصوصیات کو اپنایا ہے۔ جو رنگ آلودگی، منافقت اور جمود کے خلاف ہر زمانے کی اچھی شاعری میں ابھرتی رہی ہے۔ مزاحمت کا یہ انداز کسی خاص تحریک کا زائیدہ نہیں ہوتا بلکہ داخلی سطح کی اس جہت کی پیداوار ہے جو ہر سچے تخلیق کار کے ہاں فطری طور پر پھوٹتی ہے۔"(۱۲)

اُن کی شاعری میں بیسویں صدی کی مشینی زندگی کے خلاف ایک خاص رد عمل نظر آتا ہے۔ مغربی ممالک میں قدیم صنعتی نظام اور جدید ٹیکنالوجی کے اثرات جب پاکستانی معاشرے پر پڑے تو اس کی تبدیلی سے معاشرے کا سانس پھولا اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ جن کو انہوں نے اپنی غزل میں الگ انداز سے پیش کیا:

"عہد حاضر اِک مشین اور اس کا کارندہ ہوں میں
ریزہ ریزہ روح میری ہے مگر زندہ ہوں میں
میں ہوں وہ لمحہ جو مٹھی میں سما سکتا نہیں
پل میں ہوں امروز و ماضی، پل میں آئندہ ہوں میں"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ٦٧)

زمانے کی رفتار اور ٹیکنالوجی کی بھرمار سے تہذیب پر منقش رنگوں کو انور سدید نے مختلف صورت میں بیان کیا ہے۔ جو کہ قابل دید رد عمل ہے۔ زمانے کے اس تغیر میں قومیت کا احساس اور جذبہ حب الوطنی بھی ان کے اشعار کا موضوع رہا ہے۔ انور سدید کے ہاں قیام پاکستان کے بعد حالات اور رجحانات کا ادراک وسیع صورت میں ملتا ہے۔ اُن رجحانات کے زیر اثر اُن کی شاعری بھی ملتی ہے اور حب الوطنی کا جذبہ ان کے کلام میں زیادہ سرشاری کیفیت سے ملتا ہے۔ کیونکہ جوانی میں تحریک پاکستان کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر اور پورے ولولے اور جوش سے مسلم لیگ کے سرگرم رکن رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد کربناک حالات کی چیخ و پکار ہمیں ملتی ہے لیکن ان آوازوں میں وطن سے بے پناہ محبت اور خلوص کا جذبہ ان کی شاعری میں شکست و ریخت کی کیفیت پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ رجائیت، توازن اور اعتدال کی روپ دھارتی نظر آتی ہے۔ اُن کے کلام میں حب الوطنی کیفیت کے اثرات خلوص و محبت کا پیکر نظر آتے ہیں۔ اُن کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

"دور کا دیس نہ جب راس آیا
رزق پھر اپنے نگر میں دیکھا"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۴۲)

"وطن پردیس میں جب یاد آیا
ابھر آیا، نظر میں، گھر اچانک"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۴۹)

انور سدید کی شاعری داخل اور کائنات سے ہم آہنگ ملتی ہے۔ اُنہوں نے خود کو انسان کے جذبات سے ہم آہنگ کیا۔ اُن کو دبستان سرگودھا سے منسلک کیا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے خود کو کسی ادب کے خاص مکتبہ فکر یا نظریے کا پابند نہ رہنے دیا۔ انہوں نے زندگی کے مسائل، گھٹن زدہ ماحول، تہذیب کی گراوٹ،

نا آسودگی اور بے مہری زماں جیسے مسائل کو اپنی غزل میں بیاں کیا۔ سیاست سے سماجیت، اخلاق اور تصوف تک اور ذات سے کائنات تک اور زندگی سے موت تک تمام مسائل کو موضوع سخن بنایا۔ انور سدید مجید امجد اور میراجی کے دھڑے کے کارکن نظر آتے ہیں۔ عصری حالات، تقاضے اور ادبی تحریکوں پر اُن کی گہری نظر تھی۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ غزل اُردو قارئین کا مزاج بن چکی ہے اور اس کی مقبولیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ انہوں نے اپنی بصیرت سے قلبی کیفیات کو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کیا اور بخوبی واقف تھے کہ غزل شعر و ادب کی شان ہے اور اس میں اظہار کے روشن امکانات موجود ہیں۔ انہوں نے اس صنف میں ہر مضمون ،پہلو اور زندگی کی ہر تصویر کو خاص صورت میں ڈھال کر پوری صلاحیت کے ساتھ نمایاں کیا۔ انہوں نے غزل مخالف شعراء پر غزل کے حسن و تاثیر اور اظہار کی طاقت ثابت کرنے کے لیے اپنے اظہار اور تقاضائے طبیعت کا ذریعہ سمجھ کر غزل کہی اور خوب کہی جس کا انہوں نے حق ادا کر دیا۔ اُن کا سرمایہ غزل البتہ کم ہیں مگر معیار میں اعلیٰ، منفرد اور بھرپور صناعتی تکمیل کا مظہر ہے۔

غزل اُردو شاعری کی پسندیدہ صنف سخن کے ساتھ ساتھ ایک مشکل فن کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ غزل کے فن کے حوالے سے عموماً دو طرح کی باتیں ہر شاعر کو درپیش ہوتی ہیں۔ ایک قدیم شعری روایات جس میں شاعر پابندی اختیار کرتا ہے تاکہ روایت کے اس سلسلے کو فن میں توڑا نہ جائے اور دوسری طرف جذبہ اور فکر کی انفرادیت کو بھی اہم تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرا رخ یہ ہے کہ رویت سے انحراف کی صورت میں غزل بے جان ہو جاتی ہے۔ اگر اس صنف کی روایت کو آگے بڑھایا جائے تو غزل تقلیدی اور روایتی کے طعنے اس صنف کو بے رنگ کر دیتے ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے نئے طرز کو اختیار کرنے کا کچھ اس طرح مشورہ دیتے ہیں۔

> "بہت سی باتیں علم کی ترقی سے غلط ثابت ہو جائیں تو بھی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ان خیالات سے بالکل دست بردار ہو جائے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ حقائق و واقعات اور سچے اور نیچرل خیالات کو انہیں غلط اور بے اصل باتوں کے پیرائے میں بیان کرے اور اس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں، ہر گز نہ ٹوٹنے دے۔ ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر سے وہی انچھر بھلا دیئے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے۔" (۱۳)

غزل کا دوسرا بڑا مسئلہ انفرادی تجربے کا ہے۔ انفرادی تجربے کے اظہار کا وسیلہ ایک نئی صورت ہے ۔ جس پر اعتراضات کی بھرمار ہے۔ بعض کم فہم اور سطحی شعراء نے روایتی الفاظ کو روایتی مفہوم اور مضامین میں اس طرح استعمال کیا۔ زبان کو فرسودگی کا احساس ہوا جس کی طرف سب سے پہلے توجہ الطاف حسین حالی نے دی۔ بیسویں صدی میں اُردو کے اہم شعراء کو روایتی الفاظ و تراکیب اور مضامین پر پسماندگی کا خدشہ ہوا۔ اور اس میں نئی جہتوں کی تخلیق کی توقع نہیں رہی۔ اس لیے علامہ اقبال، فیض احمد اور حسرت موہانی نے اپنے تصورات اور تجربات کی مناسبت سے اپنی تخلیقی زبان از سر نو تعمیر کی۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال نے اصل فکر اور تصور کو شاعری میں پیش کیا۔ عشق کو جذباتی کیفیت کے بجائے ایک محرک قوت کی شکل میں بیان کیا اور نئے استعارے، تلمیحات کو منفرد مضامین میں دلکشی سے پیش کیا۔ حسرت موہانی نے الفاظ اپنے ماحول سے لیئے "کوٹھا"، "چکی" اور دیگر کئی الفاظ پہلی مرتبہ استعمال کیئے۔ اسی طرح فیض احمد فیض نے روایتی اور تقریباً متعین مفاہیم کی زبان میں اپنے تجربات اور احساسات سے اظہار کا نیا راستہ نکالا اور سماجی مسائل کو روایتی غزل کی زبان میں بیان کیا۔ فراق گورکھپوری رقم طراز ہیں کہ:

> "فیض نے ایک نیا مدرسہ شاعری قائم کیا۔ انہوں نے جس بصیرت افروز احساس، خلوص و فن کارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا۔ یہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز ہے۔ نئی اور قابل قدر بھی۔" (۱۴)

انور سدید نے اجتماعی طرز بیان اور اجتماعی لاشعور سے مکمل فائدہ اُٹھایا اور اپنا اسلوب اور انداز اظہار منفرد تشکیل کیا۔ اُن کے مخصوص انداز بیان اور لفظوں کے انفرادی چناؤ سے اسلوب ندرت و ظرفگی کا حامل ہے ۔ جس میں روایتی بازگشت کے ساتھ ساتھ جدید عصر کی آواز بھی صاف صاف سنائی دیتی ہے ۔ اُن کا اسلوب سوز و گداز، اثر آفرینی، بے ساختہ پن، سادگی و پرکاری، موسیقیت اور صناعتی تکمیل کا عمدہ نمونہ ہے۔ پروفیسر سجاد نقوی انور سدید کی صنف غزل پر عبور کے متعلق اس طرح رقم طراز ہے۔

> "غزل کے رنگ" کے مطالعے کے دوران میں حیران ہوا کہ انور سدید صاحب کو اُردو غزل کی تاریخ پر غیر معمولی عبور حاصل ہے اور اس کتاب میں انہوں نے کلاسیکی شعراء سے جدید غزل گو شعراء تک سب کو اپنے مقرر کردہ کڑے معیار پر نہیں پرکھا بلکہ ہر شاعر کی انفرادیت بھی دریافت کی ہے

۔ مزید بر آں انہوں نے غزل کے مضامین اور اسلوب بیان میں جدت کے عناصر کی کار فرمائی کو پیش نظر رکھ کر اس حقیقت کا کھوج بھی لگایا ہے کہ اس کتاب میں زیر بحث آنے والے شعراء نے غزل کی صنف کو کتنا ثروت بند کر دیا ہے اور کلم الدین احمد کا یہ قول کہ "غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے" کس قدر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جب کہ انور سدید نے اُردو غزل کو اپنی تہذیب کا بہترین نمائندہ قرار دیا ہے اور اس تہذیبی نمائندگی میں مختلف شعراء کی عطا دریافت کی۔ میں اس طویل جملہ معترضہ کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اسے زیر قلم لانے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ابھی ابھی ڈاکٹر انور سدید کی غزلیات کے پہلے مجموعے "سفر میں پرندے" میں شامل غزلوں کا مطالعہ مکمل کیا ہے۔ اس مطالعے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ انور سدید نے اپنی غزل بھی محولہ بالا معیار کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کی ہے۔" (۱۵)

انور سدید کے ہاں غزل میں ذاتی واردات کا بیان کائنات اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اُن کی ذات میں موجود ہے۔ انہوں نے اظہار ذات کے لیے کائنات سے استعارے لیے ان اشاروں کی آرٹ میں اُن کی غزل میں بڑی بڑی داستانیں اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اُن کی غزل کی نمایاں ترین خوبی ان کا منفرد اسلوب ہے۔ جو سادگی میں اپنی مثال آپ ہے۔ وہ غزل کے پابند اشعار کو نثر کے قریب تر لائے۔ عام قاری آسانی سے اُن کی کہی بات کے مفہوم تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ عموماً اُردو غزل میں روایت ہے کہ غیر ضروری اضافتوں سے صناعی رنگ دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ لیکن انور سدید کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے حتی الوسع اضافتوں کو فراوانی سے استعمال کرنے سے اجتناب کیا اور اپنے بیان کی روانی میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دی۔ جس کی وجہ سے اُن کے کلام کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کی غزل کا ہر شعر مضمون کی مناسبت سے کہیں خیال انگیزی اور تفکر آمیز ہوتا ہے اور کہیں بہجت آفرینی پیدا کرتا ہے۔ جس سے اُن کی غزل کے اشعار پر جدت کا نمایاں احساس معلوم ہوتا ہے۔ صنف غزل کی نمایاں خوبی ہے کہ ہر شعر الگ الگ اکائی کا حامل ہوتا ہے اور ہر شعر نئے مضمون کو پیش کرتا ہے اور شاعر کے داخل کی متعدد الگ الگ کیفیتوں کا عکس بن جاتا ہے۔ انور سدید کے ہاں بھی اظہار اس ہیئت کو قبول کیا گیا ہے۔ تاہم بعض غزلوں میں اظہار کے تسلسل نے بھی کیف و کم پیدا کیا ہے۔ اُن کی غزلوں میں موسیقیت کی خوبی نے غنائی حسن اور صوتی تاثیر بھی

پیدا کرتی ہے۔ اُن کے اشعار میں شعری روایت کا تسلسل موجود ہے جو کہ تمام سماجی اور تہذیبی منظر کے ساتھ منفرد لہجے میں موجود ہے۔ انہوں نے قلبی واردات کو اظہار کا قرینہ عطا کیا۔ اُن کی غزل میں تشبیہات، استعارات اور علامتیں مکمل خصوصیات کے ساتھ عکس فگن ہے۔ جو کہ اُن کے عہد کی تصویر کشی کر رہی ہے۔ اُن کے بیان میں نزاکتیں بھی ہیں اور رعنائیاں بھی ہیں جو ان کے خوابوں کے رنگ سے تشکیل پاتی ہیں۔ اُن کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

"اُن کا جب عالم جنوں دیکھا
پھر کہاں ان کو جوں کا توں دیکھا
دن کو سورج کی قہرمانی تھی
رات کو چاند کا فسوں دیکھا"

(پرندہ سفر میں، ڈاکٹر، انور سدید، ص ۲۷)

انہوں نے حسن بیانی کے لیے استعارے اور علامتیں فطرت سے لیں۔ کائنات کے مناظر کا مشاہدہ کر کے اُن علامتوں کو فلسفہ زندگی کے ستھ مشترک ٹھہرایا، انہوں نے ستارے، رات، دن، آسمان، دشت، برق، پانی، کہکشاں، درخت، ندی، دریا، سورج، چاند، سمندر، سونا اور چاندی وغیرہ کا استعمال اپنے کلام میں حسن کاری سے کیا۔ انہوں نے فطرت کے متعلق ذاتی تجربات و مشاہدات اور کیفیات و احساسات کو فنی اہتمام کے ساتھ غزل میں پیش کیا ہے۔ اس میں کہیں بھی تصنع اور بناوٹ کو داخل نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے اپنی علامتیں اور استعارے انسانوں کی بجائے فطرت سے لیے ہیں۔ داخلی اور خارجی سطح پر متضاد رویوں، تعلقات کی سوداگری اور محبت و نفرت سے دوہرے معیار نے انسان کو اس حد تک جھوٹا بنا دیا ہے کہ ایک سچے فنکار کو اپنے شعری مواد کے حصول کے لیے فطرت سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ یہاں انور سدید کی شاعری ایک امیج کے ساتھ چپک کر نہیں رہ گئی۔ بلکہ فطرت کی ساری علامتیں مثلاً ہوا، ابر، خوشبو، درخت، رنگ، دھوپ، دریا اور صحرا ان کے ہاں مضبوط امیجز بن کر ابھری ہیں۔ یہ علامتیں جہاں شاعر کے پختہ فکری شعور، بھرپور مشاہدے اور اس کی وسعت نظری کا پتہ دیتی ہے، وہاں ہمیں اس کی ذات کے سفر کا انسانی حوالے کی بجائے آفاقی سطح پر جائزہ لینے کا موقع بھی ملتا ہے۔ انور سدید کا کلام فنی طور پر اعلیٰ درجہ کا ہے۔ جہاں ذکر تشبیہ اور استعارے کا ہو تو ان کے ہاں بہت سی نادر تشبیہات اور استعارات کا استعمال دلکش انداز میں ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں فارسی الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اُن کی تعداد قلیل ہے۔ انہوں نے ضرورت

کے تحت اُن سے استفادہ کیا ہے۔ ان الفاظ اور تراکیب کی گنتی ممکن نہیں ہے۔ جو الفاظ اور تراکیب استعمال ہوئیں ان میں ضربِ پیہم، نوردِ شوق، دامنِ صد، کلبہ رانی، سہلِ زمان، شہرتِ عام، سود وزیاں، مرگ ناگہانی، روز وشب، ستم رسیدہ، پیکرِ خاکی، کشتِ دِل، سموم وقت، دمِ وصال، شب سیاہ، اوراق عالم، کشت سحر، گل اندام، آرزو، گرانی، گردش اور چاک گریباں وغیرہ جیسے الفاظ وتراکیب شامل ہیں۔ انور سدید کی غزل کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری فنی پختگی اور تکنیکی مہارت کا عمدہ نمونہ ہے۔ انہوں نے عام فہم اور مانوس الفاظ کی نیا مفہومی منظر عطا کیا جو کہ عہد جدید کی غزل سے ہم آہنگی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ انہوں نے اپنے مقطعوں میں اپنے مرکب نام سے بھی خوب استفادہ کیا ہے اور وہ بحر کی مناسبت سے مقطع میں اپنے نام کے دو حصے الگ الگ استعمال کر لیتے ہیں اور کہیں مرکب نام کو شعر کی بُنت میں تخلص بنا لیتے ہیں۔ انور سدید کی شاعری داخل اور کائنات سے ہم آہنگ ملتی ہے۔ اُنہوں نے خود کو انسان کے جذبات سے ہم آہنگ کیا۔ اُن کو دبستان سرگودھا سے منسلک کیا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے خود کو کسی ادب کے خاص مکتبہ فکر یا نظریے کا پابند نہ رہنے دیا۔ انہوں نے زندگی کے مسائل، گھٹن زدہ ماحول، تہذیب کی گراوٹ، ناآسودگی اور بے مہری زماں جیسے مسائل کو اپنی غزل میں بیاں کیا۔ سیاست سے سماجیت، اخلاق اور تصوف تک اور ذات سے کائنات تک اور زندگی سے موت تک تمام مسائل کو موضوع سخن بنایا۔ انور سدید مجید امجد اور میراجی کے دھڑے کے کارکن نظر آتے ہیں۔ عصری حالات، تقاضے اور ادبی تحریکوں پر اُن کی گہری نظر تھی۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ غزل اُردو قارئین کا مزاج بن چکی ہے اور اس کی مقبولیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ انہوں نے اپنی بصیرت سے قلبی کیفیات کو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کیا اور بخوبی واقف تھے کہ غزل شعر وادب کی شان ہے اور اس میں اظہار کے روشن امکانات موجود ہیں۔ انہوں نے اس صنف میں ہر مضمون، پہلو اور زندگی کی ہر تصویر کو خاص صورت میں ڈھال کر پوری صلاحیت کے ساتھ نمایاں کیا۔ انہوں نے غزل مخالف شعراء پر غزل کے حسن وتاثیر اور اظہار کی طاقت ثابت کرنے کے لیے اپنے اظہار اور تقاضائے طبیعت کا ذریعہ سمجھ کر غزل کہی اور خوب کہی جس کا انہوں نے حق ادا کر دیا۔ اُن کا سرمایہ غزل البتہ کم ہیں مگر معیار میں اعلیٰ، منفرد اور بھرپور صناعتی تکمیل کا مظہر ہے۔ اُن کا مشرقی اور مغربی ادبیات کا مطالعہ وسیع تھا۔ وسعت مطالعہ اور مشاہدہ کائنات سے اظہار کے وسیلوں سے استفادہ کیا اور امتیازی حیثیت سے اُن کا کلام ابھرا۔ اُن کے علم وفضل نے اُن کی غزل کو ثروت مند کیا۔ تشبیہات واستعارات اور علامات واشارات سے غزل کی صناعی میں اضافہ کیا۔ زبان وبیان میں مہارت اور لفظیات کے استعمال میں گرفت ان کے صاحب طرز ادیب ہونے کا مظہر ہے۔

وہ زندگی اور ادب کے بارے میں بھرپور نظریہ رکھتے تھے۔ کلام کی پختگی، شگفتگی اور رعنائی ان کے نظریے کی عکاسی ہے کہ انہوں نے دلکش انداز میں قلم فرسائی کی ہے۔ بالا تمام خوبیوں نے ان کے کلام کو معاصر شعراء میں معتبر ٹھہرادیا ہے۔

(پ) ڈاکٹر انور سدید کی نظم نگاری کا تجزیاتی و اسلوبیاتی جائزہ:

انور سدید کا شمار اگر جدید شعراء میں کیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہونا چاہیے۔ انہوں نے ہر صنف ادب میں اپنے جوہر دکھائے اور اپنا لوہا منوایا۔ بہت کم ادیب ایسے ہوتے ہیں جن کا شعری اصناف کے بارے میں موضوعاتی اور ہیئتی مطالعہ وسعت رکھتا ہو۔ انہوں نے ہر دور کے ادب کو محض ذائقہ لینے کے لیے نہیں پڑھا بلکہ اس کا گہرائی اور گیرائی سے جائزہ لیا۔ اپنے فکر و نظر کے مطابق جانچ کر کے تحقیق کی، تنقید لکھی اور تخلیق کیا۔ اس زاویہ نظر کے تحت انہوں نے شاعری کا مطالعہ بھی کیا اور اپنی ذوق تخلیق کو عہد کے نظریات، رجحانات اور خیالات کے مطابق پروان چڑھایا۔ انہوں نے غزل لکھی، نظم کہی، قطعات لکھے اور نعت نگاری کے صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کی غزل کے متعلق تفصیل سے ذکر کیا جاچکا ہے۔ اگر نظم کا مطالعہ کیا جائے اور فہم کی کوشش کی جائے تو یہ تاثر نمایاں ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری کو نئے سیاسی و سماجی تناظر میں نئے موضوعات کا خوگر بنایا۔ اُن کی شاعری میں فکر و اظہار کی نئی جہتوں کی دریافت کا عنصر ملتا ہے۔ اگر ان کی ادبی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انتہائی شادمان، خوشحال اور معتدل زندگی گزاری ہے۔ یہی خوبیاں اُن کی ذات کی اہمیت کا احساس دلاتی ہیں اور شاعری میں مسرت و طمانیت کے حصول کے فن کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ انور سدید نے غزل کی طرح نظم نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ انہوں نے نظم اپنے ڈھب سے کہی اور خوب کہی۔ انہوں نے نظم میں حیات و کائنات کے رازہائے پنہاں کو کھولنے سے لے کر قلبی کیفیات اور شعور اور لاشعور کے گنجل سمیت نئے خیالات و احساسات کے دھندلکوں کو اپنا موضوع بنایا۔ تصوف و زندگی کے تنوع تجربات، مشاہدات کو اپنی نظم میں بیان کیا اور انفرادیت کی مہر ثبت کر دی۔ انہوں نے نظم کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۸ء سے کیا۔ شاعری میں دلچسپی اُن کو بچپن سے تھی لیکن تنقید کی طرح نمایاں نہیں تھی۔ اُن کی غزل کا مجموعہ "پرندہ سفر میں" اُن کی حیات میں شائع ہوا۔ لیکن نعتیہ کلام، قطعات اور نظم نگاری کے مجموعے اشاعت تاحال نہ ہو سکی۔ اُن کی نظمیں، نعتیہ کلام، قطعات اور کچھ غزلیہ کلام پاک و ہند کے مختلف رسائل میں غیر مطبوعہ حالت میں پڑا ہے۔ زیادہ تر کلام اُن کی تین بیاضوں میں محفوظ ہے۔ اُن کی پہلی نظم ۱۹۶۸ء میں "پتھر" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ نروان، زمین،

استنباط، پورے سیب کی تلاش، نوحہ، سیپ، شب خون، خزاں، سناٹے کی سرگرشی، چور سے معذرت، غالب پسند آم، وزیر حسین شہزادی کی یاد میں، کوہ سلمان کا مرگھٹ، انہیں کیا خبر، اپنی تو بس خواہش یہ ہے، لاحاصل ، اے میرے دل، فلسطین کے لیے اور دسمبر جیسی منفرد اہمیت کی حامل جدید نظمیں تحریر کیں۔ انہوں نے "ماہ نو" کراچی، "اوراق" لاہور، "کوہسار" پھاگل پور، انڈیا، "چہار سو" راولپنڈی، "ارتکاز" کراچی، "جدید ادب" خان پور اور دیگر مختلف رسائل میں ۱۹۶۸ء سے مرگ تک اُن کا کلام شائع ہوتا رہا جو کہ بکھرا پڑا ہے۔ اُن کی نظموں، غزلیات اور نعتیہ کلام غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے اُن کی صحیح تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۸ء تک اُردو نظم کے موضوع اور ہیئت میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ زمانے کی تیز رفتار ترقی، سیاسی منظر نامے، دگرگوں معاشرتی و معاشی صورت حال اور زبردست تغیر پذیری نے اُردو نظم کو موضوعی اور ہیئتی طور بدل دیا تھا۔ یعنی کہ ایک انقلاب عظیم برپا ہوا تھا۔ انسان کی پیچیدہ نفسی کیفیات، جذباتی الجھنیں، معاشرتی زوال، بے حسی اور بے ضمیری اُردو نظم کی خاص موضوعات تھیں۔ ان اثرات نے شعراء کا رُجحان خارج سے داخل کی طرف موڑ دیا تھا۔ نئے موضوعات، نئی زبان، نئے طرز اظہار کا رجحان پروان چڑھا۔ اس لیے نئی فنی علامتیں نئے استعارے اور تشبیہات تراشی گئیں۔ نئی امیجری اور الفاظ کا نیا استعمال عام ہوا اور نئی نظم نئے حسی تجربات کی آئینہ دار بن گئی۔ اشاریت پسندی اور علامت نگاری کے رجحان نے اظہار کے نئے نئے رستے دکھا کر نظم کو وسعت بخشی۔ اس طرح اُردو نظم کی روایت میں نئے پانیوں کی شمولیت سے ندریت اور شگفتگی کا عنصر نمایاں ہوا۔

> "قیام پاکستان کے وقت اُردو نظم نگاروں کے دو نمایاں گروپ موجود تھے۔ ایک گروپ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھا اور دوسرا گروپ حلقہ ارباب ذوق سے متعلق تھا۔ ترقی پسند ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور حلقہ والوں کا منشور ادب برائے ادب تھا۔ ترقی پسند مصنفین و شعراء ادب میں عوامی زندگی کی مکمل اور سپاٹ تصویر کشی پر زور دیتے تھے۔ جبکہ حلقہ والوں کی دروں بینی نے ادب و شعر میں شعور و لاشعور اور تحت الشعور جیسی نفسیاتی اصطلاحات کو رواج دیا۔" (۱۶)

انور سدید کی انفرادیت ہے کہ وہ کسی حلقے کے رُکن نہیں تھے اور نہ ہی اُن کے نظریات میں کسی تفاوت کے قائل تھے۔ ان دونوں نظریوں کے شعر و ادب کی ترویج اُن کے لیے اہم اور ناگزیر نہیں تھی۔ بلکہ

اُن کے نزدیک شعر کا مقصد فطرت حسن کی تخلیق اور جبلت انسانی کے خواص و مظاہر، انسان کی اُمنگوں، حزن و ملال اور جذباتی کشمکش کے المیوں کا اظہار بطور موضوع ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے ارد گرد کائنات اور حقیقی زندگی کا گہرا مشاہدہ اور دیگر افکار کا گہرا مطالعہ کیا۔ انہوں نے زندگی کی تلخیوں، خارجی حقائق کا مشاہدہ کر کے قلبی واردات اور احساسات کو فطرت کی صورت دے کر بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں ذات و کائنات کے مختلف رنگ احساسات اور تاثرات کا امتزاج دلکش انداز میں ملتا ہے۔

انور سدید کی شاعری میں فکر، عمیق مشاہدہ اور وسیع مطالعہ کی بدولت ان کے ذاتی مشاہدے اور تصوف کے نظام فکر سے پھوٹتی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلی کائنات کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور حسن فطرت کے مختلف رنگوں کے جلوؤں کو گہرائی اور گیرائی سے دیکھتے ہیں اور دلفریبیوں کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ اُن کے ہاں حسن فطرت کی حقیقت و مائیت کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اور حسن فطرت کے پوشیدہ مفاہیم اور رموز کو کھوجنے اور تلاش کرنے کی جستجو نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ فطرت کے مظاہر مثلاً دریا، جھیلیں، پہاڑ، آبشار، درخت، شاخیں، ہوائیں، بارش، میدان، چٹانیں، ستارے، رات، سورج، سایہ، صحرا، شام و سحر، رستے، وادیاں، کہسار، خزاں و بہار، بجلی، شفق، اندھیرے اور سناٹے وغیرہ سب کا بغور مطالعہ ملتا ہے اور ان سہہ رنگ تجلیوں میں اپنے کرب کو تلاش کر کے زندگی اور کائنات کے خفیہ مفاہیم کو سمجھنے اور جذبات کو تہذیبی تناظر میں فطرت کے ذریعے اور وسیلے سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انور سدید نے نظم "پتھر" میں قلب انسانی کی ہمہ جہت و سہہ رنگ کیفیتوں کی نزاکت، دلربائی، اثر آفرینی اور گرمی و شدت ہے۔ ان داخلی کیفیات کو انہوں نے مناظر فطرت کے حسن اور دلپذیری کے مقابل لا کر جہاں انسانی جذبات و احساسات کو حسن فطرت کے قریب تر اور اعلیٰ ثابت کیا۔ وہاں منظر نگاری اور گوتم کا حوالہ نظم کو فکر انگیز بنا دیتی ہے۔ نظم مختلف معنوی ابصاد کے ساتھ شعریت اور موسیقی سے بھرپور ہے۔ اُن کی نمایاں خوبی ہے کہ قاری نہ صرف حظ اُٹھاتا ہے بلکہ نظم کی امیجری سے اپنی فکر اور مزاج کے مطابق کہانی تراش سکتا ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

"گھنے پیڑ کے نیچے دھونی رمائے
بڑی دیر سے بند آنکھیں کیئے
سوچ کی گہری کھائی میں کھویا ہوا ہے
پرے اونچے پیڑوں کے پیچھے

پہاڑوں کا اک خوشنما سلسلہ
دُور تک پھیلتا جا رہا ہے
پہاڑوں کے دامن میں اِک جوئے آب رواں پھوٹتی۔۔۔۔"

(بیاض نمبر ا، ڈاکٹر، انور سدید، غیر مطبوعہ)

اُن کی نظم "زمین" بھی اسی نوع کی کامیاب کاوش نظر آتی ہے۔ "نظم "کا بغور جائزہ لیا جائے تو بظاہر سچائی کا عکس نظر آتی ہے اور کسی قسم کا سیاسی تاثر نظر نہیں آتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق عام انسانوں کے سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی رویوں سے جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اِن رویوں کو فطرت کے مظاہر میں تلاش کر کے ایک عکس کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ اس کے لیے اُن کی نگاہیں آسمان کی طرف نہیں اُٹھتی بلکہ ٹکٹکی لگائے زمین کی طرف دیکھتی ہیں۔ جس کا دامن آغوشِ مادر کی طرح پر سکون ملتا ہے۔ ہر سطر کی قرأت سے ایک نئی سچائی وا ہوتی ہے۔ یوں بہت سی سچائیاں سامنے آتی ہیں۔ قاری کی آنکھ اُن کی مثبت قدروں، رنگینیوں کا احساس کر سکتی ہے جو کہ عمدہ فن کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔

"زمین جو لمحوں کی ٹوٹی مالا کے گرتے موتی نگل رہی ہے
اسی زمین سے حیات پھوٹی
اسی زمین کا خمیر سیال خون بن کر
مری رگوں میں بہا تو میں نے
عظیم تر کُل کا بھید سمجھا
عظیم تر کُل کا راز پایا۔۔۔۔"

(پتھر، بیاض نمبر ا، ڈاکٹر، انور سدید، غیر مطبوعہ)

اُن کی نظم کے موضوعات سے معاشرتی، علمی و ادبی، تہذیبی، فکری، معاشی، معاشرتی انتشار، بے اطمینانی اور ذہنی و روحانی توڑ پھوڑ کے دور کی بو آتی ہے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی، شرف انسانیت کی محرومی اور عوام الناس جسم و جان کے رشتوں کا ٹوٹنا، بے معنویت، لاحاصلی، بے چارگی اور مایوسی جیسے احساسات اُن کی نظموں کے موضوعِ خاص ٹھہرتے ہیں۔ انہوں نے انسانی المیے کی زِک کے درد کو شدید محسوس کیا اور اپنے عہد کے اجتماعی شعور کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ "نروان" میں انسانی وجود کی ریزہ ریزہ ہونے کی دلگداز داستان،

انسانی رشتوں کی بگڑتی صورتوں اور سسکتی زندگی کی سرگزشت کو خود کلامی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ جس میں گوتم ایک تلمیح بن کر نظم کو کثیر المعنویت عطا کر دیتا ہے۔

"ابلتے ہوئے تندلاوے کا مسکن
یہ تپتا بدن
پیڑ کے نرم سائے کا طالب
ہزاروں برس سے برہنہ پڑا ہے
میرے گھر کے آنگن سے
معصوم بچوں کا اِک شور اُٹھ رہا ہے
ڈھلی عمر کی ایک عورت کی آواز
اُٹھتے ہوئے شور میں ڈھل گئی ہے۔۔۔۔۔"

(نروان، بیاض نمبر ا، ڈاکٹر، انور سدید، غیر مطبوعہ)

ایک اور نظم "شب خون" میں اس درد کی کیفیت کو موت کے منظر کی صورت میں کھینچتے ہیں۔ خوف، عدم تحفظ، خرابی اور بے حسی کو ایک قتل کے روپ میں ایک کہانی تراشتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رات کے گہرے اندھیرے میں کسی کا دروازے پر دستک دینا، کمرے کے اندر شخص کا بلب روشن کرنا، کمرے میں ہر سُو روشنی پھیلنا، اجنبی کا کمرے میں داخل ہونا، دروازے کا پردہ سرسرانا، کارنس پر جلتی موم بتی کا فرش پر گرنا ایک قتل کی واردات پیش کرتی ہے۔

"اِک کڑے گہرے اندھیرے میں
پسِ دیوار مرا ہاتھ سر کا
اور چوبِ خشک سے چٹخی ہوئی آواز
لپکی
چار سُو بھاگی
سجل گلدان سے ٹکرائی
اچانک سارا کمرہ۔۔۔۔۔"

(بیاض نمبر ا، ڈاکٹر، انور سدید، غیر مطبوعہ)

انور سدید اپنے عہد کے ملکی اور غیر ملکی حالات و واقعات سے بخوبی آگاہ تھے۔ امت مسلمہ کے مسائل زوال پذیری کی داستان کو دُکھ اور درد سے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے فلسطین کے لیے ایک نظم "لاحاصل"، "اے میرے دل" اور "اُنہیں کیا خبر" جیسی منفرد موضوعات کی حامل نظمیں لکھیں۔ "اُنہیں کیا خبر" میں انہوں نے پاکستان، افغانستان اور عراق کی حالت زار کی سرگزشت بیان کی ہے۔ مسلم ممالک کی بنیاد پرستی اور فرقہ واریت کا خون آلود منظر کچھ یوں پیش کیا ہے۔

"اُنہیں کیا خبر ہے
کہ جس سُرخ سورج کی تابانیوں میں
جلوس جہاں کو گزرنے کی تلقین کرتے رہے یہں
وہ سورج حقیقت میں بارود کا ایک گولا تھا
آگ اور آہن کا گولا۔۔۔۔۔۔"

(امروز، بیاض نمبر ا، ڈاکٹر، انور سدید، غیر مطبوعہ)

تیز رفتار ترقی اور زمانے میں تیزی سے رونما ہونے والی تغیر پذیری نے رشتوں کی بے توقیری کے احساس نے اُردو شاعری کو ایک اور آواز عطا کی۔ دولت کی ہوس نے اپنوں کی ناقدری کے رجحان کو فروغ دیا اور عظمت رفتہ کی خوشگوار یاد میں واحد سہارا بن گئیں۔ انور سدید کی نظموں میں عظمت رفتہ کا احساس اور ماضی کی طرف لوٹ کر خوشگوار یادوں کے منظر کو دلکش اسلوب میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"میں نے کب یہ خواہش کی ہے
میری ہتھیلی پر چُن دو تم دنیا کے انعام
جگ مگ کرتے محل دو محلے روشن زرّیں بام
مخملی صوفے، بند جھروکے، شمع کی ڈوبتی لو۔۔۔"

(اپنی تو بس خواہش ہے، بیاض نمبر ا، ڈاکٹر، انور سدید، غیر مطبوعہ)

انور سدید فطرت کے مناظر کے بیان میں امیجری کے رنگ بھرتے ہیں۔ شاعر صرف خارجی عوامل اور عناصر پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ خارجی مناظر کے باطن سے پھوٹنے والے احساس اور جذبے کو قلم بند کرتا ہے وہ سمندر، پہاڑ، ندی نالوں، اُفق، چاند ستاروں کے بیان میں صرف ان کی خارجی ہئیت تک محدود نہیں رہتا بلکہ اپنی ذات کے باطن سے اس کا رشتہ جوڑ دیتا ہے۔ ان کی نظم میں تصورات اور کیفیات ایسا پیکر بن جاتے ہیں جو

ہمارے ذہن کی سکرین پر چلتی پھرتی تصویروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ انہوں نے مظاہر فطرت کو اپنی شاعری میں علامت کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ اُن کے ہاں خاص طور پر پنجاب کے دیہات کا فطری ماحول نظر آتا ہے۔ فطرت سے محبت اُن کی سرشت میں موجود تھی۔ وہ اپنی مٹی سے ذہنی اور جذباتی طور پر وابستہ ہیں اور یہ وابستگی ان کی غزل اور نظم میں فطرت نگاری کی صورت میں سامنے آتی ہے۔اُن کے ہاں زندگی کے مختلف مظاہر کی تصویریں کیمرہ فوٹو نہیں بلکہ مصور کے موئے قلم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ انور سدید کا مشاہدہ کافی گہرا ہے۔ وہ لفظوں کی بجائے تصویروں میں سوچتا ہے۔ انور سدید وہ شاعر ہے جس کو صرف محبوب کی معصومیت اور پانی کی گرتی آبشاروں میں ہی حسن نظر نہیں آتا بلکہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں موجود فطری مظاہر اور تمام مناظر کو موضوع بناتا ہے۔ ان کی شاعری کی تصویروں میں ماحول، معاشرے اور کائنات کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ وہ فطرت سے شعوری اور لاشعوری طور پر وابستہ نظر آتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں کا آغاز فطرت کے کسی منظر سے ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری میں کائناتی مسائل اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں موجود ہیں جو اس کی شاعری کو فطرت کا عکاس بنا دیتی ہیں۔ وہ زندگی میں پوشیدہ رازوں کا متلاشی ہے، اس لئے وہ کائنات میں موجود ہر ذرے، فرد، چرند، پرند، نباتات وجمادات کو بہ نظر غائر دیکھتا ہے اور پھر فطرت کے یہی عناصر اس کی نظم اور غزل میں کرداروں کی صورت میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں یا پھر وہ جذبوں کی نمائندگی کے لئے مظاہر فطرت سے تشبیہ، استعارہ اور علامت اخذ کرتا ہے۔ انھوں نے بھاری بھر کم الفاظ کا استعمال نہیں کیا بلکہ عام، سادہ اور مانوس الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا ہے۔ وہ بے جان اشیاء کو بھی اپنی نظموں میں جاندار بنا کر ان کی ایک خاص شخصیت پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات اور اسلوب دونوں حوالے سے تبدیلی رونما ہوتی ہے، جس کی بنا پر جدید شعراء میں ان کا ایک منفرد مقام ہے۔ انور سدید کی نظم نگاری کو تین فکری جہتوں سے مرکب کہی جاسکتی ہے۔ اُن کی شخصیت ہم عصر ترقی پسند شعراء سے مختلف ہونے کے باوجود اُن کے قریب تر ہے۔ اُن کے ہاں انقلابی فکر، جذبہ حب الوطنی اور ان ک رومانی طرزِ فکر سے عبارت ہے۔ اُن کے ہاں فکر کے چشمے بدلتے ہوئے حالات، غلامی، غربت، افلاس، قحط الرّجال اور تقسیم کے مسائل کی بدولت پھوٹتے ہیں۔ انہوں نے سیاسی حالات قومی اور بین الاقوامی مسائل، امت مسلمہ کی بے چارگی، جدوجہد، انسانیت اور عدل و انصاف جیسے موضوعات پر عمدہ نظمیں تحریر کیں۔ انہوں نے راست بیانیہ کے بجائے رمز و استعارہ کی زبان استعمال کی اور فطرت سے استعارے لے کر ہر جگہ رمز و کنایہ کا عمل گہرا اور پر تاثیر بنادیا۔ انہوں نے نہ صرف استعاروں کا استعمال بخوبی کیا بلکہ بعض بڑے منفرد دلآویز

ترکیبیں اور نادر الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ مثلاً چوبِ خشک، سجل گلدان، لرزیدہ چاپ نے کومل مکھڑا، سُرخ شعلے، تھاشیں وغیرہ وغیرہ اُن کے الفاظ میں استعارے پوشیدہ ہے۔ اُن کی نظموں میں تہہ در تہہ معنی پوشیدہ ہیں۔ یہی وجی ہے کہ اُن کی شاعری انسانی جذبات و احساسات کا نام ہے۔ جو الفاظ کی مخصوص ترتیب اور انتخاب کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ اُن کی نظم نگاری امن و امان، مساوات اور انسان دوستی کے متمنی ہے۔ اُن کے نزدیک ہر ایک شے احسن ہے۔ جو زندگی میں حسن، لطافت اور توانائی پیدا کرتی ہے اور وہ تمام چیزیں جو اس تصور کی مخالف ہیں اُن کی وہ مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن اس کشمکش صور تحال میں اُن کا لہجہ معتدل اور متوازن رہتا ہے۔ اُن کے ہاں رجحان سہہ جہتی سرکل میں رہتے ہیں۔ کوئی ایک غالب رجحان نہیں ملتا بلکہ بیک وقت کئی رجحانات کی آمیزش اور امتزاج ملتا ہے۔ انور سدید کی ذاتی زندگی کے اثرات اُن کے کلام پر نمایاں ہیں، خانگی اور معاشی خوشحالی اور وسیع علم و فضل کے حلقہ احباب نے اُن کی عصری حیثیت کو ہمیشہ جلا دی۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں اعتدال واضح نظر آتا ہے۔ یہ اعتدال کچھ بے سبب نہیں بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ اُن کی ذاتی زندگی کے تجربات ہیں جن کو انہوں نے رودادِ جہاں بنا دیا ہے۔ اُن کی نظموں میں جذبے کی صداقت، فن کارانہ صلاحیتیں، طافت، حلافت، متانت، لہجے میں سنجیدگی اور لفظوں میں استعاروں کا برجستہ استعمال نے اُن کی نظم کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔ گو کہ انہوں نے کم لکھا ہے اور غیر مطبوعہ حالات میں اُن کا کلام موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُن کی نظمیں فن اور فکر کی اعلیٰ معیار کی عکاسی کرتی ہے۔ اُن کی نظمیں منفرد اسلوب اور فکر کی بدولت اُردو ادب کی شاعری کے سرمایے میں دلکش اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ت) انور سدید کی نعت نگاری کا تجزیاتی مطالعہ:

انور سدید نے غزل، آزاد نظم اور پابند نظم کے ساتھ ساتھ اُردو نعت نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے تواتر سے نعتیہ کلام مختلف رسائل و جرائد میں لکھا۔ جن کی صحیح تعداد کا تعین کرنا مشکل امر ہے۔ لیکن اُن کے بیاض میں درج نعتوں اور تجویز کردہ مجموعے "صلعم" کے نام سے معلوم ہاتا ہے کہ انہوں نے تقریباً پچاس سے زائد نعتیہ کلام تحریر کیا تھا۔ جو کہ غیر مطبوعہ حالات میں اُن کے بیاض اور دیگر جرائد میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے پہلی نعت ۱۹۷۱ء میں لکھی جو کہ مولانا ظفر علی خان کی نعت کی زمین میں تحریر کی تھی۔ اُن کی اس پہلی نعت میں اُن کی حضور ﷺ سے محبت کا رنگ قابل دید ہے۔ انہوں نے آپ ﷺ کی ذات

کو انسانیت کی عظمت کا پیکر، تسکین قلب کا ذریعہ، ہستی کا رنگ و روپ اور دِل حزیں کا سہارا قرار دیا ہے۔ نعت میں نبی کریم ﷺ سے عشق کا اظہار خوبصورت لہجے اور دلکش اسلوب میں یوں ملتا ہے۔

"انسانیت کی آنکھ کا تارا تمہیں تو ہو
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا تمہیں تو ہو
تسکین قلب و راحتِ جاں ہے تمہارا نام
مشکل میں سب نے جس کو پکارا تمہیں تو ہو
دنیا تمہارے مصحف زیبا کی اک کرن۔۔۔۔"

(نعت حضور ﷺ، بیاض نمبر ا، ڈاکٹر، انور سدید، غیر مطبوعہ)

ہر عاشق رسول ﷺ کے لیے مدینہ شہر کی زیارت ناقابل بیان خوشی ہے۔ مدینہ سے محبت اور عشق کا اظہار ہمیں ہر جگہ ملتا ہے۔ انور سدید کی شہر مدینہ سے محبت اور اس کی زیارت خواہش اور حسرت منفرد انداز میں ملتی ہے۔ اُن کے نزدیک مدینہ شہر کی فضا نُور ہے اور خوشبو جسم و جان کی روح ہے اور مٹی خاک شفاء ہے۔ اُن کی نعتیہ نظم " مدینہ النبی ﷺ " میں مدینہ شہر سے محبت کا اظہار یوں ملتا ہے:

"مجھ پہ ہے سایہ کناں انور فضا اس شہر کی
اوڑھ کر نکلا ہوں میں سر پر ردا اس شہر کی
تشنہ لب کب سے کھڑا ہوں ریگِ ساحل پر سدید
مجھ پہ بھی برسے کبھی کالی گھٹائیں اس شہر کی"

(مدینہ النبی ﷺ، بیاض نمبر ا، ڈاکٹر، انور سدید، غیر مطبوعہ)

جذبہ عشق محمدی اور محبت کو قرار اس وقت ملتا ہے جب انور سدید نے ۱۹۸۹ء میں حج کی ادائی کی۔ اُن کا جذبہ عشق اس قدر بے قرار تھا کہ سب سے پہلے حاضری مسجد نبوی میں دی اور عبادت کے لیے وہاں گئے۔ اس قیام کی سرگزشت کو رخصت ہوتے وقت خوبصورت انداز تحریر میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"اے شہنشاہ حرم سیّد مکیّ مدنی
معدن جُود و کرم سیّد مکیّ مدنی
آپ کے شہر میں ہے آج مرا آخری دِن

دِل ہے مغلوب بہ غم سیّد مکیّ مدنی
آپ ہیں خاصہ و خاصانِ رسل شاہ بشیر
اور گناہ گار ہیں ہم سیّد مکیّ مدنی
آپ سا محسن و شافع نہ زمانے میں کوئی۔۔۔۔"

(مدینہ میں آخری دن، بیاض نمبر ا، ڈاکٹر انور سدید، غیر مطبوعہ)

انور سدید کی نعتیہ کلام کی امتیازی خصوصیت ہے کہ ان کے پاس ادب موجود ہے۔ وہ عشق محمدیہ ﷺ سے سرشار ہو کر کہیں مدہوش نہیں ہوئے۔ انہوں نے عشق و فریفتگی کی وادی میں والہانہ جذبہ شوق کے طاری ہونے پر بھی آقا اور غلام کی حد بندی کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ ان کے اس شعور نے ان کے کلام میں معنی آفرینی، متانت اور سنجیدگی پیدا کر دی ہے۔ نام مصطفیٰ سے اُن کے دِل میں ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس طوفان کا مرقع پیش کرنے میں وہ جارہِ اعتدال سے سر تجاوز نہیں ہوئے۔ اُن کی فکری صلابت کہیں بھی اُن کو بے راہ روی نہیں ہونے دیتی۔ نمونہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

"آپ نے خاک کے انسان کو دی شان حضور ﷺ
آپ کے نام پہ قربان مری جان حضور ﷺ
آپ کی نظر شفاعت کا طلب گار ہوں میں
مرحلہ حشر کا کر دیجیئے آسان حضور ﷺ"

(نعت حضور ﷺ، بیاض نمبر ا، ڈاکٹر، انور سدید، غیر مطبوعہ)

انور سدید کی دوبارہ خواہش تھی کہ وہ اپنے عشق کے ملجیٰ و ماوٰی کی زیارت سے مشرف ہوں۔ حرم پاک نبویؐ سے رخصت ہوتے وقت شاعر کے دِل کی جو کیفیت تھی انہوں نے اس کا اظہار اپنی ایک نعتیہ کاوش میں اس طرح اظہار کیا ہے کہ:

"مکہ میں اللہ کی شان دیکھیں گے
ہم اس زمین پہ جُھکا آسمان دیکھیں گے
خیال میں حرم پاک جب بھی ابھرے گا
بلالؓ کو وہیں دیتے اذان دیکھیں گے
نظر جُھکا کے ہے دیکھی زمین مکے کی

اور اب مدینے کا ہم آسمان دیکھیں گے۔۔"

(نعت حضور ﷺ ،بیاض نمبر ا،ڈاکٹر،انور سدید، غیر مطبوعہ)

ان نعتوں میں انور سدید کے دل میں دوبارہ حج کے وسیلے سے روضہ رسول ﷺ پر حاضری دینے اور آپ ﷺ کے مکان کی زیارت کرنے کی شدید تمنا کے اظہار کی رُوح پرور مثالیں ملتی ہیں۔ انور سدید نے اپنی نعتیہ شاعری میں اپنے عقائد کی برملا وضاحت کی ہے۔ انہوں نے بانی اسلام کو کونین کا مدعا اور آپ کی محبت کو عین ایمان قرار دیا ہے۔ اُن کے کلام میں سادگی، سلامت، روانی اور صفائی ہے۔ زبان صاف، سادہ اور عام فہم ہے۔ اُن کا نعتیہ کلام داخلیت و خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے وصفی انداز اپنا کر نعت نبی ﷺ میں نغمہ سرائی کی۔ ان کا نعتیہ سرمایہ اُن کے بیاض میں موجود ہے۔ اپنی حیات میں ہی انہوں نے نعتیہ کلام کو "صلعم" کا نام تجویز کیا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے تاحال غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہے۔ اُن کے ہاں نعتوں کی تعداد اچھی خاصی موجود ہے۔ جن سے اس کے سوزِ دروں کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کے کلام میں داخلیت کی ساری رعنائی اس کے سچے جذبہ عشق کی دین ہے۔ اُن کا خاصا تھا کہ وہ اپنے جذبات عشق کے اظہار میں بہت مؤدب نظر آتے تھے۔ پیغمبر اسلام سے مخلص عقیدت، ان کی ذات گرامی سے وابستہ متعلقات ومنسلکات سے والہانہ شگفتگی نے اُن کے کلام کو دلکش بنادیا ہے۔ جس سے دل کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی نعتیہ شعری کاوش کے لیے ایسی بحروں کا انتخاب کیا ہے جو کہ بہت مترنم معلوم ہتی ہے۔ اُن کی اِن بحروں میں خوش الحان پرندے کی لراپ معلوم ہوتی ہے۔ جو خوش جذبات اور ہمہ تن آواز بن گیا ہو۔ انور سدید نے اُردو نعت نگاری کی روایت کو اپنے مخصوص آہنگ کے ذریعے عصر حاضر کے کاروان نعت کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے عصر حاضر کے دیگر شعراء کی طرح اپنی بساط کے مطابق نعتیہ شاعری کو فروغ دیا۔ اُردو نعت نگاری میں اُن کا کلام نمایاں مقام کی حیثیت پر پورا اترتا ہے۔ انہوں نے اپنی نعتیہ تخلیق کو آپ کے بابرکت نام سے مصنون کیا ہے۔ جذبہ کی صداقت اور خلوص کی گہرائی نے ان تخلیقات کو آمد کا ایک مُرقع بنادیا ہے۔ اُن کا نعتیہ کلام ایک صاف شفاف چشمہ کی طرح جذبات میں روانی پیدا کرتا ہے۔

(ٹ) انور سدید کی قطعات نگاری کا تجزیاتی مطالعہ:

قطعہ کے لغوی معنی "ٹکڑا" جزو کے ہیں۔ اصطلاح میں قطعہ اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی واقعہ یا خیال کو مسلسل بیان کیا گیا ہو۔ اُردو میں قطعہ کی روایت فارسی سے آئی ہے۔ اُردو میں قطعہ نگاری کو مقبولیت انیسویں صدی کے اواخر میں ملی ہے۔ اکبر الہٰ آبادی نے اس صنف کی طرف توجہ دی اور آپن کی ظریفانہ

شاعری قطعہ کی صورت میں ہے۔ حالی، شبلی، آزاد، اکبر اور اقبال نے بھی قطعات کہے ہیں اور اس میں فلسفیانہ مضامین کو بیان کیا ہے۔ اکبر اور اقبال کے زیر اثر بیسویں صدی کے کچھ شعراء نے بھی قطعات لکھے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کی غزل، نظم نگاری اور نعت نگاری کے بعد اُن کی شاعری کا تیسرا زاویہ "قطعہ نگاری" ہے۔ انہوں نے اپنے قطعات میں ہنگامی موضوعات کو شامل کیا کیونکہ مختصر لفظوں میں ہنگامی موضوعات کے لیے قطعہ موزوں ترین صنفِ شعر ہے۔ اس وجہ سے عموماً روزانہ اخبارات میں بالالتزام ہر اخبار میں ایک "قطعہ" موجود ہوتا ہے۔ اخبار کے قاری کی شہ سُرخی کے بعد نظر عموماً قطعہ پر جا ٹھہرتی ہے۔ وہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد تک اُردو صحافت سے وابستہ رہے۔ عصر حاضر کے قومی اور بین الاقوامی حالات حاضرہ پر اُن کی گہری نظر تھی۔ معاشی اور معاشرتی زوال کو تنقیدی بصیرت سے بغور جائزہ لیتے رہے اور اظہار خیال کے لیے انہوں نے کالم نگاری کے ساتھ ساتھ قطعات کا سہارا بھی لیا۔ انہوں نے بے شمار قطعات لکھے جن کی صحیح تعداد کا تعین ناممکن عمل ہے۔ اُن کی بیاض اور جن رسائل اور اخبارات میں انہوں نے صحافتی سرگرمیاں سرانجام دیں۔ اُن میں قطعات کی تعداد کثیر ہے۔ لیکن انہوں نے زیادہ تر قطعات "مشرق" اور "خبریں" اخبار کے لیے لکھے۔ اس کے علاوہ "نوائے وقت" اور دیگر اخبارات میں بصورت فرمائش اخبار تحریر کرتے رہے۔ اُن کے قطعات میں سیاسی، معاشرتی اور دیگر معاشرتی کمزور پہلوؤں پر گہری طنز کے نشتر ملتے ہیں۔ مثلاً

"جناب شیخ سے پوچھا" سیاست کیسے آتی ہے؟"
وہ بولے، مال ہو تو پھر سیاست آ ہی جاتی ہے
کسی مفلس پہ اس کو مہرباں ہوتے نہیں دیکھا
بھری ہو جیب تو اس پہ طبیعت آ ہی جاتی ہے" (۱۷)

بالا قطعہ میں انور سدید نے سیاسی نظام کی خرابیوں کو بیان کیا ہے۔ نہوں نے بر سر اقتدار طبقے پر گہری چوٹ کی ہے۔ اور مکمل سیاسی ڈھانچے کی تشکیل کو حقیقت پسندانہ انداز میں واضح طور پر بیان کیا ہے۔ انور سدید چونکہ محب الوطن شخص تھے اور آزادی کی تحریکوں میں بھی پیش پیش تھے۔ لیکن عصر حاضر کی سیاست سے وہ بدگمان تھے۔ اُن کے نزدیک یہ خیال پختہ ہے کہ پاکستان میں سیاست اور سیاسی نظام دولت کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ اس نظام کے تحت موروثی سیاست اور موروثی لیڈر شپ کا وجود ہی ممکن ہے یا وہ لوگ جن کے پاس دولت کی ریل پیل ہے۔ ایک غریب جو حقیقت میں گریب کا دکھ درد رکھتا ہے اور احساس کر سکتا ہے۔ جو نچلے طبقے کے مسائل اور حالات سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا یہ نظام غریب قیادت کی

راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ جس سے حقیقی جمہوریت اور عام آدمی کی خوشحالی کا حصول ناممکن ہے۔ اس فرسودہ نظام کی نشاندہی کئی جگہوں پر کیہے اور اُس کا اظہار انہوں نے اپنے قطعات میں منفرد رنگ میں کیا ہے۔ اس نظام کی بدولت معاشرتی مسائل کو بھی انہوں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ ایک اور جگہ وہ یوں اظہار کرتے ہیں کہ:

"بے کاریوں کا دور ہے اور ہم ہیں دوستو
فکر معاش جتنے بھی ہیں کم ہیں دوستو
پہلے تو یہ خیال تھا، ڈگری نہیں ہے پاس
ڈگری کے ساتھ اور بھی اب غم ہیں دوستو" (۱۸)

اس قطعہ میں انہوں نے پاکستان میں جمہوریت کے عدم تسلسل اور خراب معاشی صورتحال پر گہرا طنز کیا ہے اُن کا یہ طنز حقیقت پسندانہ ہے۔ کیونکہ کے گزشتہ کئی دہائیوں سے پاکستان کا نظام سلطنت مختلف تجربات سے گزرتا رہا۔ ملکی میں سیاسی عدم استحکام اور ناقص پالیسیوں سے وہ نالاں نظر آتے ہیں۔ نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور بے روزگاری کے مسائل کو اُجاگر کیا۔ ملک کی سیاست، معاشی حالات اور معاشرے پر اُس کے اثرات کا وہ بخوبی ادراک رکھتے تھے۔ سماجی شعور کو ایک حقیقت کا رنگ دے کر اپنے قطعات میں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے قطعات میں ٹھوس حقائق سانس لیتے محسوس ہوتے ہے۔ مفاد پرست اور خود غرضانہ سیاست نے معاشرتی حقوق کو سلب کر دیا۔ اقرباء پروری، نا انصافی اور نااہلی نے سماجی طور پر لوگوں کو عدم اطمینان کا شکار کر دیا تھا۔ تعلیم یافتہ نوجوان گردش روزگار کے چونگل میں پھنس گئے۔ سیاسی نااہلیوں نے معاشی طور پر ملک کو کھوکھلا کر دیا اور لوگ فکر معاش میں میں رُوگرداں تھے۔ انور سدید نے اس دور کے ایک اہم معاشرتی مسئلے کو خوبصورت اظہاریہ میں بیان کیا ہے۔ اُنہوں نے معاشرتی مسائل پر نہ صرف خود آواز بلند کی بلکہ عصر حاضر کے دیگر ادیبوں کو بھی ان موضوعات کی طرف راغب کیا۔ اور ایسے صحافی اور ادیبوں پر گہرا طنز کیا ہے۔ جو آنکھوں دیکھا حال کو چھپاتے اور اپنے مفاد اور غرض کی خاطر اپنے قلم کو ذریعہ آمدن یا سرمایہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایسے لکھاریوں کے بے حمیت کا لقب دیا ہے۔ ایک قطعہ میں وہ کچھ اس طرح طنز کرتے ہیں کہ:

"چاروں طرف ہے رقص کناں بے حمیتی
غیرت کدے جو دِل کے تھے بے جوش ہو گئے
اپنے قلم کو توڑ کے بولا یہ اک ادیب

حالی ہمارے دور میں بے نوش ہو گئے " (۱۹)

انہوں نے قلم سے اصلاح اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے کی سعی کی ہے۔ اُن کے نزدیک قلم ہی سے دوبارہ جذبہ حب الوطنی کی تحریک کو جلا بخشی جاسکتی ہے۔ قوم کو عظمت رفتہ کا احساس اور وطن سے محبت کی ترغیب قلم سے ممکن ہے۔ اُن کے نزدیک وطن کی محبت ایک عظیم جذبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کے کلام میں وطن کے حالات وواقعات کو دردمندانہ انداز میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان قطعات میں اُن کی وطن سے محبت اور اس کی موجودہ حالت کے بارے میں اُن کے خیال سے جو کہ سیاسی نظام کی ناکامی اور ناپختگی کی وجہ سے تھا۔ اس کا نوحہ انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔

" قائد اعظم نے ہم کو جو وطن لے کر دیا
خطۂ ارض تھا یہ، اسلام کا کاشانہ تھا
اب یہ حالت ہے اسے تکتے ہی ہوتا ہے گماں
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا" (۲۰)

اُن کے قطعات کی نمایاں خصوصیت سیاسی منظر نامے کی عکاسی اور جذباتی سطح پر ان کی ذات وجدانی کیفیات کا ترجمان نظر آتی ہے۔ جس میں وہ پاکستان کے حالت پر مایوسی کا اظہار کرتے ہے اور قائد اعظم کے عظیم دریافت اور اُن کے خواب، نظریہ اور فلسفہ کے متضاد حالات کا تخمینہ کرتے ہے۔ وطن عزیز جس کی بنیاد اسلام کے قلعے کی تھی۔ جہاں مساوات، عدل، استحکام اور ریاست مدینہ کے ماڈل پر پر امور کے انجام دہی ہونی چاہیئے تھی لیکن غیر مستحکم سیاسی صورت اور بدترین طرز حکومت نے پاکستانی معاشرے کو سماجی مسائل سے دو چار کیا۔ سماجی و معاشی بحران نے ایک بے سمتی کا احساس پیدا کیا اور بے اطمینانی، بے چینی اور پریشانی کا تاثر نمایاں ہونے لگا جو رفتہ رفتہ گہرا ہوتا گیا اس صورتحال پر رنجیدہ ہو کر وہ ایک اور قطع میں انہوں نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

" تاب جب دل میں نہیں رہتی تو ہم سوچتے ہیں
کون آئے گا بھلا گرتوں ہوؤں کو تھامنے
کون دے گا ان کو جذبہ قوم کی تعمیر کا
کون آئے گا ہجوم بدگمانی چھانٹنے "(۲۱)

ان کے قطعات میں گہرے طنز کے ساتھ ساتھ قومی درد کی کیفیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور کئی جگہوں پر شاعری اور قلم کے ذریعے قومیت کی تعمیر و ترقی کا اظہار ملتا ہے۔ اس اظہار میں وہ نمونہ کے طور پر کبھی علامہ اقبال کی تحریکی شاعری اور کبھی حالی کی ملی شاعری کا حوالہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ معاشرتی، اخلاقی اور ملی جذبے کی تعمیر و تشکیل کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کی قومی حالات اور سیاسی معاملات پر گہری نظر تھی۔ بگڑتی امن و امان کی صورتحال اور غیر مستحکم سیاسی نظام کے حوالے سے حالات کے تناظر میں مستقبل کے خدشات کا تجزیہ کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں

"ضمیمہ چھپ گیا اخبار کا، جس میں یہ خبریں ہیں
ہمارے ملک میں چاروں طرف گڑبڑ گھٹالا ہے
کراچی میں بموں کے پھر دھماکے ہونے والے ہیں
مسز جمہوریت کا پاؤں بھاری ہونے والا ہے" (۲۲)

انہوں نے قطعات میں جہاں سنجیدہ معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بنایا وہاں اُن کے ہاں طنز و ظرافت پر مبنی قطعات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کا یہ قطعہ جو کہ انتہائی لطیف حیثیت رکھتا ہے۔

"جو عرضِ عشق کا ان سے ارادہ رکھتے ہیں
وہ تہمتوں کی بھی ہمت زیادہ رکھتے ہیں
کوئی حسینہ جو چاہے ہمیں اُٹھالے جائے
کہ عقدِ ثانی کا ہم بھی ارادہ رکھتے ہیں
سُنا ہے ہم نے کہ انور سدید صاحب بھی
ہوس پرس ہیں اور ذوق بادہ رکھتے ہیں" (۲۳)

اُن کے ہاں جہاں ہمیں سنجیدہ سماجی مسائل، سیاست اور عظمت رفتہ کا احساس دلا کر اصلاح کی سعی کا تاثر ملتا ہے۔ وہاں چند ایک نمکین قطعات بھی ملتے ہیں جو اُن کی شگفتہ ذوق حس کا عمدہ نمونہ ہیں۔ بالا قطعہ میں اُن کے لطیف مزاج کا ادراک آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ انور سدید کی قطعہ نگاری اخلاقی، افادی اور مقصدیت کی حامل ہے۔ انہوں نے اپنے دور میں قطعات کے ذریعے مصلحانہ کردار ادا کیا ہے۔ اُن کے ہاں ایک خاص توازن موجود ہے۔ اگرچہ قطعات اتنے پرجوش نہیں ہیں مگر تاثیر کی کمی بھی نہیں پائی جاتی ہے۔ قطعات میں سادگی، حسن اور شیرینی ملتی ہے۔ الفاظ میں گھن گرج کی کمی ہے۔ لیکن دھیمے الفاظ میں کسک اور کھٹک موجود

ہے جو نشتر میں موجود ہوتی ہے۔ قطعات میں موجود شگفتگی، دلکشی اور تازگی نے اُن کے معنوی میں تسلسل کی فضا پیدا کر دی جو کہ عہد حاضر میں بھی معنی پرور ہیں۔ جس سے زندگی کے مسائل حل کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے حالی کی طرح اپنے قطعات میں اصلاحی اسلوب استعمال کیا ہے۔ اُن کی تمام قطعات میں اصلاحی رنگ جابجا نظر آتا ہے۔ انہوں نے مختصر نظمیہ اشعار میں عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے فنی حسن و جمال کی کمال مہارت دکھائی کہ وہ عام فہم اور سادہ سلیس زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہ، استعارہ اور بناوٹ وغیرہ سے وہ گریز کرتے ہیں۔ وہ آرٹ کو صرف آرٹ کی خاطر ہی نہیں بلکہ اخلاقی زندگی کو سنوارنے، سجانے، نکھارنے اور سدھارنے کی خاطر شعوری طور پر استعمال کرتے تھے۔ اُردو ادب میں حالی کے علاوہ آزاد، شبلی، اکبر، اقبال، وحید الدین سلیم، جوش، فراق، فیض اور اختر انصاری نے بے شمار قطعات لکھے لیکن جو رنگ حالی نے اختیار کیا اُس سے اُردو شاعری میں بڑا تغیر برپا ہو گیا۔ حالی نے اپنے دور جدید کے نظمیہ اشعار سے دوسرے شعراء کو روشنی بخشی اور اُردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ اس روشنی سے ہر شاعر نے کسب فیض حاصل کیا۔ انور سدید نے بھی حالی کے نظریے کو فروغ دیا اور انہی کی طرح قطع نگاری کو زندگی کے قریب لانا چاہتے تھے۔ اس لیے انور سدید کا مختصر نظمیہ اشعار میں ایسے سادہ اور برجستہ اسلوب مصلحانہ کاوش کے لیے آسان، مؤثر اور راہ نما اصول قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان وسیع تر معنوں میں اگر ہم وسعت نظری اور کشادہ دلی سے اعتراف کریں کہ انور سدید بھی قطعات نگاری میں دور جدید کا صحیح معنوں میں باکمال پیام بر ہیں۔ وہ اپنی اصلاحی نظمیہ شاعری کے ذریعہ لوگوں کو متاثر کرتے ہیں اور زندگی کو سجانے، سنوارنے اور نکھارنے کا ایک موثر ذریعہ مانتے ہیں۔ اُن کے دل میں اپنے وطن کی محبت جاگزیں تھی۔ اور اپنے دل میں اصلاح قوم کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ اپنے قطعات کو اصلاح کے لیے استعمال کرتے تھے اور اِن قطعات کے ذریعہ اچھّی باتوں کی تلقین اور دورِ جدید کی نظمیہ شاعری کا شوق پیدا کرنے کے لیے اشعار کہتے تھے۔ اُن کے قطعات میں سادگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ جو اُن کی نظمیہ شاعری کا سب سے بڑا وصف و کمال ہے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی قطعات نگاری سے اہل ذوق اور اہل دِل قارئین پر گہرا اثر مرتب کیا اور دور جدید کی مختصر نظمیہ شاعری کو مختلف سطحوں پر مشمول کیا اور قطعات نگاری کے سرمایہ اُردو ادب میں خوبصورت غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد نقوی، پروفیسر، گرم دم جستجو، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۵ء، ص ۸۷

۲۔ سجاد نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر انور سدید، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۲۵

۳۔ سجاد نقوی، پروفیسر، گرم دم جستجو، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۵ تا ۱۳۶

۴۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، پرندہ سفر میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۹

۶۔ ایضاً، سرورق

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۴۰

۸۔ ایضاً، ص ۴۲

۹۔ ایضاً، ص ۴۴

۱۰۔ سجاد نقوی، گرم دم جستجو، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۵ء ص ۹۸

۱۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، اُردو دنیا، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۳۳

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، پرندہ سفر میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰

۱۳۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، اتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۳۳۹

۱۴۔ فراق گورکھپوری، اُردو غزل گوئی، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء، ص ۶۸

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، پرندہ سفر میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰

۱۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ص ۱۲

۱۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، قطعہ، مطبوعہ: روزنامہ مشرق، لاہور، ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۱

۱۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، قطعہ، مطبوعہ: روزنامہ مشرق، لاہور، ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۱

۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، قطعہ، مطبوعہ: روزنامہ مشرق، لاہور، ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۱

۲۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، قطعہ، مطبوعہ: روزنامہ خبریں، لاہور، ۲۶ اپریل ۱۹۹۴ء، ص ۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۱

۲۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، قطعہ، مطبوعہ: روزنامہ خبریں، لاہور، ۲۶ ستمبر ۱۹۹۴ء، ص ۱

۲۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، پرندہ سفر میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۱

باب پنجم:

ماحصل

(الف) مجموعی جائزہ:

ڈاکٹر انور سدید نے اپنی صلاحیتوں سے اُردو ادب کی ہر صنف میں کامیابیاں سمیٹیں۔ انہوں نے اپنے سرمایہ ادب میں اُردو ادب کی تاریخ، اس کے فکری رجحانات، نظریاتی اختراعات، مقامی ایجادات، غیر ملکی اثرات، انفرادی اجتہادات اور عہد بہ عہد ہونے والی عصری تبدیلیوں کا احوال سمیٹا ہے۔ اُن کی تحریروں سے اُردو ادب کے ایک عہد کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اُن کی علمی و تخلیقی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۴ء سے ہوتا ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے اور انہوں نے اپنی ساری زندگی محکمہ آب پاشی میں گزاری۔ وہ ۱۹۸۸ء میں اپنی ملازمت سے سبک دوش ہوئے اور پھر اگلے ۲۸ سال ہمہ وقت تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ انہوں نے فانی زندگی میں پیشہ وارانہ اور ادبی طور پر بھرپور زندگی گزاری ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ہمہ پہلو تخلیقی اور تالیفی شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے تحقیق، تنقید، تخلیقی نظم و نثر، تالیف، ترجمہ اور صحافت جیسے مختلف النوع میدانوں میں اپنے قلم کو رواں رکھا اور بیش تر میدانوں میں وہ ایک کام یاب لکھنے والے تھے۔ ادبی دنیا میں ایسے لکھاریوں کے ساتھ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اُس کی تصنیفی زندگی کا کوئی ایک پہلو اتنا نمایاں ہو جاتا ہے کہ دیگر پہلو دب جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ ہوا۔ اُن کی نقاد کی حیثیت نے اُن کی دوسری حیثیتوں کو دبا دیا ہے۔ اب جب کہ اُن کی تخلیقی کاوشوں کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ اُن کی تحریروں کو نئے سرے سے پڑھا جائے گا اور اُن کے ادبی مقام و مرتبے کا زیادہ بہتر انداز میں تعین ہو سکے گا۔

انور سدید کی ادبی زندگی بھرپور رہی ہے۔ اُن کی حیات ہی میں اُن کی تخلیقی زندگی زیر بحث آتی رہی ہے۔ لیکن اُن کی نظم و نثر کی طرف لوگوں کی توجہ بہت کم گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اُن کے تحقیقی اور تنقیدی کام کا حجم ہے۔ جس کے سامنے اُن کا تخلیقی کام بہت کم ہے۔ لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ انہوں نے نظم و نثر ہر دو اصناف میں تخلیقی کام کیا ہے۔ اُردو نثر میں انہوں نے افسانے، انشائیے، خاکے شخصیے اور سفر نامے تحریر کیئے، جب کہ شاعری میں غزل، نظم، قطعہ اور نعت نگاری کی ہے۔ اِن تخلیقی جہات کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترجمہ نگاری اور کالم نگاری کے جوہر بھی دکھائے۔ یوں وہ پچاس، ساٹھ سال کی

تصنیفی زندگی گزار کر اس دار فانی سے رُخصت ہوئے اور اپنے پیچھے یادگار کام چھوڑ گئے۔ ڈاکٹر انور سدید کے کام کو اُن کی زندگی میں بھی سراہا گیا اور اُن کے کام کی تعریف کرنے والوں میں ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر وزیر آغا ،ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ، انتظار حسین، ممتاز مفتی، میر زاادیب، جوگندر پال، بلراج کومل، منشایاد اور ڈاکٹر خورشید رضوی جیسے احباب شامل رہے ہیں البتہ تنقید میں کاٹ اور دوٹوک انداز نے اُن کو متنازعہ بھی بنایا ہے اور ہم عصر ادیب احمد ندیم قاسمی اور اس کے گروپ نے ادبی حیثیت پر شکوک شبہات کا اظہار کیا ہے جس کا ذکر باب اول میں کیا جا چکا اور ساری احوال کا خلاصہ بھی بیان کیا ہے۔

انور سدید کی ادبی زندگی کے تخلیقی گوشوں کو اس مقالے میں پانچ ابواب میں پیش کیا گیا۔ اول باب میں انور سدید کے احوال و کوائف اور ادبی زندگی کے سفر کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اُن کی ادبی اور پیشہ وارانہ زندگی کا مختلف انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اُن کی شخصی پہلوؤں کو ہر ممکن طور اُجاگر کر کے ادبی زندگی پر اس کے اثرات کو تلاش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اُن کی افسانہ نگاری کا فکری اور فنی جائزہ لیا گیا۔ جب کہ باب سوم میں اُن کی غیر افسانوی نثر کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جس میں خاکہ نگاری، سفر نامہ نگاری، انشائیہ نگاری، تحریف نگاری، جائزہ نگاری، تبصرہ نگاری، کالم نگاری اور ترجمہ نگاری کے بارے میں تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں اُن کی شعری اصناف کا تجزیاتی اور اسلوبیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

انور سدید نے صنف سفر نامہ میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اُن کے سفر ناموں کا اسلوب تخلیقی اور بیانیہ ہے۔ اُن کے علمی پس منظر کی بازیافت میں پوری معاونت فراہم کرتا ہے۔ یہ سفر تاثر محض معلوماتی نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے بھی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور دور جدید کے سفر ناموں میں منفرد اہمیت رکھتی ہے۔

انہوں نے افسانوی ادب میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ اُن کے افسانوں میں دیہی اقدار، انسان، انسان کی زندگی اور محبت کے لطیف احساسات اور جذبات کے طور پر مستحکم موضوع ملتے ہیں۔ انہوں نے دیہی زندگی کو مختلف زاویوں سے پرکھا اور مختلف پہلوؤں کی تصویریں، مختلف رنگوں کی آمیزش کو اپنے افسانوں میں پیش کیئے۔ اُن کے افسانوں کے موضوعات میں بے پناہ وسعت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اگرچہ کم افسانے لکھے۔ لیکن فن اور فکر کے اعتبار سے اُن کے افسانے منفرد رنگ اور نوعیت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ انور سدید کے افسانے فکری و فنی اور تخلیقی لوازمات سے بھرپور ہیں۔ اُن کے افسانوں میں مشرقی زندگی چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ بالخصوص دیہات کو زندگی کی پیش

کش کے زاویے کو نمایاں طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے تانے بانے سماجی ماحول کی تصویر کشی سے بنائے ہیں۔ اُن کے ہاں سماج پر تنقید نہیں ملتی۔ تاہم معاشرے کی اُن رکاوٹوں کا تذکرہ کیا جو عشق و محبت کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ ان معاملات میں اُن کا نقطۂ نظر زیادہ تر انفرادی رہا۔ جس کی بدولت اُن کے افسانوں میں افراد کو اہمیت حاصل رہی۔ اُن کے افسانوں کا اسلوب انشائی ہے۔ جو ایک زندہ اسلوب اور افسانوی زندگی کی رعنائی اور جھلک اس میں واضح ہے۔ اگر ان کے افسانوں کو بھی فکر و فن کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھا جائے تو یہ افسانے اپنے باطن میں گہری معنویت اور گہرے علامتی زاویوں کے ساتھ ساتھ فکری بصیرت کی بھی اعلیٰ معراج پر نظر آتے ہیں۔ اُن کا افسانوی ادب تکنیکی، ہیئتی اور دیگر زاویوں سے بھی مکمل صورت پیش کرتے ہیں۔ اُن کا افسانوی ادب تکنیکی، ہیئتی اور دیگر زاویوں سے بھی مکمل صورت پیش کرتے ہیں۔ اُن کا افسانوی اسلوب تازگی بخشتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کا یہ اسلوب انور سدید کا ذاتی اور شخصی پہلو ہے۔ اُن کے افسانے تخلیقی کاوش کا ایک بہترین نمونہ ہیں۔

انور سدید نے انشائیہ نگاری بھی کی ہے۔ اُن کی انشائیوں میں مختلف موضوعات کو منفرد تاثرات کے ساتھ خوبصورت اسلوب اور لطیف احساسات کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ اُن کے انشائیوں کے موضوعات عموماً سماج کے رویے، بگڑے افعال اور عام فطرت پر منحصر ہے۔ انشائیہ جو کہ موضوع کا پابند نہیں ہوتا اور وسیع کینوس رکھتا ہے۔ انور سدید نے اظہار بیان میں اس صنف کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ تحریف نگاری، طنز و مزاح سے انہوں نے خوب کام لیا ہے اور اصلاحی تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے انشائیے مجموعے اُن کی انشائی اسلوب کے بہترین نمونے ہیں۔

انور سدید کے انشائیے نفسیاتی تسکین دیتے ہیں۔ فرد کے احساسات اور خیالات کے موازنہ میں ممد و معاون ہوتے ہیں اور تصورات و نظریات، معتقدیات کو معقولیت بخشتے ہیں۔ وہ نہ صرف سب چیزوں کی جانب ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں بل کہ اس بات پر بھی آمادہ کرتے ہیں کہ جن باتوں کو ہم فراموش کر چکے ہیں۔ اُن کو دوبارہ تازہ کیا جائے اور ایسی اشیاء جن سے ہم واقف نہیں اور جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ انہیں روشنی میں لایا جائے۔ انور سدید نے طنز و مزاح میں اپنے لیے قدرے مشکل راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے غالب کے اسلوب میں اپنے عہد کی ادبی زندگی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کی پیروڈی اس طرح کی ہے کہ تحریف نگاری میں اُن کی کتاب "غالب کے نئے خطوط" ایک شاہکار بن گئی ہے۔ انہوں نے تحریف نگاری کی روایت میں عمدہ اضافہ کیا ہے۔ اُن کی تحریف نگاری پر مشتمل یہ تحریر عمدہ نمونہ ہے۔ جس سے قاری

یا سامع نہ صرف حظ اُٹھاتا ہے۔ بلکہ فن پاروں کے مفاہیم کے موازنے سے بھی لطف اُٹھاتا محسوس کرتا ہے۔ انور سدید کی ادبی شخصیت پر تحریریں بھی خصوصی توجہ کی طلب گار ہیں۔ ان کتابوں میں جن ادبی شخصیات کا تزکرہ موجود ہے۔ وہ اُردو ادب کی تاریخ میں یاد رکھی جانے والی شخصیات ہیں۔ انہوں نے اُن کی فکر و فن کو آب پاشی یا کسی اور نوع کی تحریر میں مقید نہیں کیا۔ بلکہ معاصر ادیبوں کے احوال، خدوخال، فکر و فن کے باریک عناصر کو اپنی ملاقاتوں اور مطالعوں کی بنیاد پر نمایاں کیا اور معاصر ادب کے لیے کسی قسم کی رنگ آمیزی کے بغیر سہولت کے لیے رکھ دیا۔ انہوں نے اُن کی ذاتی اور ادبی زندگی میں تضاد یا تصادم کا کہیں احساس نہیں ابھرنے دیا۔ انہوں نے ذاتی زندگی اور ادبی زندگی کو الگ الگ روش سے بیان کیا ہے۔ جس میں اصول پرستی اور راست گوئی کا عنصر نمایاں ہے۔ اُن مقتدر اور جلیل القدر شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کا مطالعہ فقط اُن کی ذات تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اُس عہد کی تصویر کشی بھی کرتا ہے جس میں وہ عظیم ہستیاں سانس لے رہی تھیں۔ انور سدید کی اُردو ادب میں جائزہ نگاری کے فروغ اور ارتقاء میں ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے جائزہ نگاری کو تاریخ کے متبادل کے طور پر بنیادی مواد کے طور پر پیش کیا۔ اُن کے جائزے ایک معیاری جائزے کے بنیادی اوصاف سے بھرپور ہیں۔ جائزہ نگاری اُن کی تنقیدی بصیرت کو واضح طور پر نمایاں کرتی ہے۔ اُن کے جائزوں میں غیر جانبدارانہ مطالعے اور تخلیقی عمانیت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے ادب کی اس جہت کو خلوص، لگن، استقلال، جامعیت، توازن اور بے لاگ رویے کی بدولت بیسویں صدی میں اس مستحکم انداز میں فروغ دیا۔ اُن کی جائزہ نگاری ادب میں نہایت قابل قدر جہت تصور کی جاتی ہے۔

اُن کی کالم نگاری شگفتہ اسلوب کی مظہر ہے۔ جس میں خلوص و صداقت، سچائی، اصول پرستی اور راست بازی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ موضوعات میں تنوع کے باوجود ادبی چاشنی برقرار ملتی ہے۔ اُن کی رائے جچی تلی، پر استدلال اور وسعت و فکر کی حامل ہے۔ خوش رنگی، دلآویزی، بلند مقاصد اور فکر و خیال کا ارتقاء کے عناصر ان کے کالم میں نمایاں تھے۔ ادب کا مطالعہ، واقعات و حالات کا مشاہدہ گہرائی سے کرتے جس میں اُن کے ادبی کالم میں ژرف بینی، گہرائی اور واضح انداز میں ملتی ہے۔ سادہ اور عام فہم انداز میں قاری تک اپنی فکر کو منتقل کیا اور اُن کے کالم پُر اثر کیفیات سے لبریز ہیں۔ اگرچہ اُن کے کالم ادبی تھے لیکن ثقیل ادبی اصطلاحات سے گریز اور تحریر کر پُر لطف بنانے اور قاری کی دلچسپی کے لیے طنز و مزاحیہ اسلوب بھی اپنایا۔ اُن کی تحریروں میں قناعت پسندی، معلوماتی اور اصلاحی عوامل بھی ملتے ہیں۔ ان کے تعزیراتی کالموں میں محبت،

خلوص، حافظے کی نقوش اور ذہنی پختگی کے عناصر نمایاں ہیں۔ اُن کی کالم نفاری صحافتی ادب میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے اپنے کالموں میں ادب، ادیب اور معاشرے کو اہمیت دی اور قومی تشخص کے حوالے سے اُردو زبان ادب کی اہمیت کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُن کی کالم نگاری اُردو ادب میں ایک اہم شاخ ہے۔ اُن کی زور نویسی اور انشائیہ نگاری کا عکس اُن کے کالموں کی تحریروں میں اُن کی دیگر تحریروں سے بالکل نہیں تو کسی حد تک مختلف ضرور نظر آتا ہے۔ کالموں کے موضوعات، تنوع اور وسعت فکر کے باوجود وہ بخوبی جانتے تھے کہ اخبارات کے لیے لکھی گئی تحریر ایک مخصوص طبقے کے لیے نہیں ہونا چاہیئے۔ لہٰذا انہوں نے جو کچھ بھی لکھا عام قاری کی فہم کے مطابق تحریر کیا ہے۔ ان کے مختلف اخبارات میں موجود اَن گنت کالموں سے اُن کی شخصیت کے بارے گراں قدر معلومات ملتی ہیں۔ دیگر اصناف کی طرح انور سدید نے تبصرہ نگاری کی جہت میں خامہ فرسائی کی۔ انور سدید نے مختلف اخبارات، رسائل وجرائد میں تسلسل کے ساتھ تبصرہ نگاری کی انہوں نے اب تک ایک ہزار سے زائد مختلف ادباء کی تصانیف پر تبصرے تحریر کیئے۔ تبصروں کے اسلوب میں انور سدید کا انداز بیان جذباتی تاثر کے بجائے ہمیشہ دلیل اور دعوے کے ساتھ شگفتگی کا حامل ہے۔ اُن کے تبصرے جانبداری کے پہلو سے آزاد ہیں۔

انور سدید کا مطالعہ وسعت پذیر تھا۔ اُن کا کتب بینی کا شوق صرف اُردو ادب تک محدود نہ تھا بلکہ بین الاقوامی مطالعہ کا رجحان بھی رکھتے تھے۔ ترجمہ نگاری میں بھی انہوں نے اصول وضوابط کی نئی راہیں نکالیں۔ اُن کی نمایاں خصوصیت ترجمے کو عام فہم بنانے کے لیے متبادل کے طور پر مقامی زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کیئے اور ترجمے میں مشکل الفاظ سے پرہیز کرکے، آسان الفاظ کا استعمال کیا۔ ابتذال اور لذئیت سے گریز کرکے عام قاری کے لطف اور دلچسپی کے عناصر کو شامل کیا۔ جس کی وجہ سے اُن کے ترجمے منفرد تخلیقی شاہکار بن گئے ہیں۔ انور سدید کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ ایک نقاد کے ساتھ شاعر، کالم نگاری، تبصرہ نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار، سفر نامہ نگار اور افسانہ نگار بھی تھے۔ انہوں نے اُردو ادب کا بڑی محنت وکاوش سے مطالعہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سوجھ بوجھ، ہمت بے پناہ بصیرت بیکراں علم وفضل، بے انداز خلاقانہ، نقادانہ اور مخلصانہ صلاحیتوں کے کی دولت سے فرازاں کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید بنیادی طور پر سائنس کے طالب علم تھے۔ پیشہ کے غیر شاعرانہ کے باوجود اُن کی طبیعت شاعری کی طرف راغب رہی ہے۔ اس ذوق نے اُن کو چین سے رہنے نہیں دیا۔ گویا ان کے خارج نے اس کے داخل کو شکست سے دوچار نہ کرسکا۔ اور زندگی کے سفر کے دوران میں جونہی موقع ملا اس کے اندر کا ادیب اور شاعر جاگ گیا اور شاعری اُن کی زندگی کی جزو بن گئی۔ اُن

کی غزلوں، نظموں، نعتوں اور حمدوں کا عقبی منظر اتنا وسیع اور جاذبِ توجہ ہے کہ قاری کی نگاہوں کے سامنے یکایک کتنے ہی نئے جہانوں کے دَر وا ہو جاتے ہیں۔ اُن کے ہاں عصری تقاضوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ہاں سماجی مسائل بہ رنگ دگر شعر کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔ اس کے ہاں سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور معاشرتی مسائل کا اظہار کہیں واضح الفاظ میں اور کہیں اشاروں، کنایوں اور استعاروں کی مدد سے ہوتا ہے۔ اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس علامت کے استعمال پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ وہ ترقی پسندوں کا ہم خیال نہ ہونے کے باوجود اپنی سوچ اور رویے کے لحاظ سے غیر ترقی پسند نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کے ہاں استحصالی طبقات کے حق میں کہیں بھی کلمۂ خیر نہیں ملتا۔ یہ زندگی میں ارتقاء کے نظریئے کی مخالفت نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں یہ ظلم و جبر کے خلاف اپنی آواز بھی بلند کرتا ہے۔ لیکن فن کی حدود میں رہ کر تاکہ شعر کا حسن مجروح نہ ہو اور اس کی اثریت زائل نہ ہو۔ قاری پر یہ چیزیں فوری طور پر اس لیے واضح نہیں ہوتیں کہ اس کے شعر میں بہت سے ابعاد (Dimension) ہوتے ہیں۔ ایسے اشعار کو سمجھنے کے لیے پوری توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ تب جاکر ان کے الفاظ کی تہوں میں چُھپے ہوئے جہانِ معنی کے رُخ پر سے نقاب اُٹھتی ہے۔ اور قاری کی آنکھوں کے سامنے کتنے ہی خوش نما منظر پھیل کر اس کی رُوح کو سکون اور ذہن کو جلا بخشتی ہے۔

ناقدین ادب کسی قادر الکلام شاعر کی جو تعریف کرتے چلے آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک تمام اصناف طبع آزمائی کرنے کے اہل قادر الکلام شاعر کہلانے کے حق دار ہیں۔ لیکن اس طرح بہت سے شعراء اس تصور کے تحت قادر الکلام ہونے سے محل نظر ٹھہرتے ہیں۔ سبھی اصناف میں اہلیت ثابت کرنا اگر قادر الکلام ہونے کا مظہر ہے تو انور سدید قادر الکلام شاعر نہیں ہے۔ لیکن اس کے پاس اپنے خیالات کو من و عن دوسروں تک پہنچانے کے لیے الفاظ کا اتنا ذخیرہ ضرور موجود ہے کہ وہ بلا تکلف اپنے دل کی بات ہو بہو اپنے قاری تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ مطالب و مدعا کو حسین و جمیل الفاظ کے رنگین پیکر میں سما کر قاری تک پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ کسی ایک صنف سخن پر آکر ٹھہر نہیں گیا۔ بلکہ غزل کے علاوہ نظم، حمد اور نعت کو موضوع سخن بنایا ہے۔ حمد و نعت میں اس نے روایت سے ہٹ کر اپنے جذبہ ایمانی کا رنگ دکھایا ہے۔ اس کی مذہبی شاعری پڑھ کر ایمان کو طاقت اور رُوح کو تازگی ملتی ہے۔ اس لیے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ انور سدید کوئی سخت مذہبی آدمی تھے اور مذہبی شاعری ہی اُن کا مقصد حیات ہے۔ وہ ایک سچا اور خالص ادیب اور شاعر ہے۔ شاعری کو وہ کسی مذہب کی باندی نہیں سمجھتا اور نہ ہی فن سے اس کی مراد اپنے نظریات کا پروپیگنڈہ ہے۔ وہ تو ایک حُسن کار ہے اور اظہار کے لیے خوبصورت پیرائے کو اپنانا ضروری خیال کرتا ہے۔ اُن کے نزدیک شاعری اس وقت

جنم لیتی ہے۔ جب شعری آہنگ سے مملو ہو۔ نیز اُن کے نزدیک شاعری کا ضمیر ہر قسم کی تعصبات سے پاک ہو۔ غزل صنف پر تاریخی طور پر بھاری ادوار گزرے ہیں۔ اور ہر دور میں مشکلات جھیلتی ہوئی کامیابی سے ہم کنار ہوئی ہے اور بدلتے وقتوں کے ساتھ ایک نئے رنگ اور طاقت لے کر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سبھی شعراء اس صنف سخن کو پسند کرتے ہیں۔ اس کا لکھنا آسان تو ہے۔ لیکن ہم عصر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔ اس وجہ سے کم شعراء جدیدیت کے مفہوم پر پورا اترتے ہیں۔ کیونکہ بعض شاعر جدت پسندی کے مفہوم سے نابلد ہیں۔ اور غزل میں اجنبی اور نامانوس الفاظ کے دخل کو جدت پسندی کی معراج سمجھتے ہیں۔ جبکہ جدید غزل میں نئے تصورات کی موجودگی از بس ضروری ہے۔ اس کا رنگ اتنا نکھرا نکھرا ہونا چاہیئے کہ قاری کا دِل گواہی دے کہ اس سے پہلے ایسی غزل کبھی نہ پڑھی ہو۔ انور سدید کا کمال ہے کہ انہوں نے اپنی غزل کو ایک نئے رنگ اور نور سے آشنا کیا اور جدید عہد سے وابستہ خیالات و تصورات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انور سدید اس کارواں میں شامل ہے جس نے مجید امجد کی نظم اور شکیب جلالی کی غزل کے اسلوب کی روشنی سے نئی تابانی کو جنم دینے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی شاعری میں زندگی ٹھوس حقائق کی شکل میں موجود ہے۔ انہوں نے سرمایہ داری میں جنم لینے والی فریب کاری اور سرکاری سطح پر حکمرانوں کی بے حسی کا فن کارانہ انداز میں بیان کرنے کے لیے اس سے اچھا پیرایہ ناممکن تھا۔ اُن کے اشعار میں خطیبانہ رنگ موجود ہیں اور انہوں نے الفاظ کی خوبصورتی اور اپنی فنی پختگی کے بل بوتے پر نئی ترکیبیں تراش کر ایک ایسا حسین لفظی پیکر تیار کر لیا ہے۔ جو قاری کی حیات کو جھنجھوڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی نظروں کے سامنے فکر و نظر کے کئی روشن افق پھیلا دیتا ہے۔ انور سدید کا یہ سلیقہ اور اس کی ہنر کاری اسے ہم عصر شعراء میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ اُن کی تخلیقی سرگرمیاں بہت سی ہیں۔ اقدار کے انتشار، زندگی، ثقافت، مسرت کی تلاش اور مؤثر انداز میں حقائق کے اظہار کی ہمت اور حقیقت کو فن کا روپ دینے کی مہارت میں وہ یکتا نظر آتے ہے۔ اگرچہ ذہنی سرگرمیوں کے اس طویل سفر میں انہیں بہت سے اعتراضات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ انہوں نے اعتراضات کے باوجود فرد کو شخصی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ اعتراضات کا جواب منطقی قوت اور اعلیٰ فن کے اظہار سے دیا۔ جس طریق کار سے بعض لوگوں نے مراعات بافتگی کی خاطر زندگی کے جمود کو قبول کیا ہے اور تاریخ کے جبر کے سامنے ہتھیارے پھینکے ہیں۔ ان کے خلاف نتائج سے بے پرواہو کر اُس نے صداقت کا علم بلند کیا ہے۔ جس کی بناء پر اُسے ہمیشہ ذہنی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ گویا اس حوالے سے انور سدید معاشرے کے بیدار آدمی ہے اور یہی بیداری اس کی زندگی، علم، فن اور تاریخ بھی ہے۔ انہوں نے منافقت کے مقابلے

پر استدلال، جذبات کے سامنے صداقت اور ہٹ دھرمی کے آگے زندگی کی اعلیٰ قدروں کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے ادب میں تجزیہ، فن میں استدلال، ادبی صحافت میں منطق اور شخصی جذبات اور مباحث میں فطری رویہ اپنایا ہے۔ اور فطری بھلمناہٹ کو قائم رکھ کر ذہن کو آلودہ نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے عہد میں حُسن کی اقدار، ادب کی رفتار اور زندگی کے مدار پر الگ دکھائی دیتے ہے یہی بات اُن کو انفرادیت دلاتی ہے۔ انہوں نے فکری آنچ کو آنگیخت کے طور پر قبول کیا ہے اور منطقی استدراک کے ذریعے تخلیق ادب میں صحافتی جمالیاتی اقدار کو بھی برقرار رکھا ہے۔ جس سے اس کے وژن کا دائرہ عمل اور براہ راست اخذ و نتائج سے اس کے دیرینہ تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ انور سدید کا ہنگامی اقدار سے تعلق نہ تھا اور نہ ہی نفسیاتی اعتبار سے وہ جذبات کے آدمی تھے۔ انہوں نے فن کی عظمت کو اپنا مشن بنا رکھا تھا۔ جس نے اس کے ادب میں ایک مستقل نظام فکر کا رُوپ دھار لیا ہے۔ انہوں نے انسانی جبلی تقاضوں اور اس کے ماتحت زندہ رہنے والوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے ایسے انسانوں کو اس گروہ میں شامل کیا ہے کہ جو مخصوص تقاضوں کی خاطر زندگی بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ ادب، تنقید، تاریخ، تحریر، کالم نگاری، شاعری اور سُراغ رسانی کے ذریعے وہ سچ کی ترغیب پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاکہ ادیب جبلی تقاضوں کے خول سے باہر آکر سچ کا سامنا کرے اور کسی تلازمے اور سچے اختلاف کے ذریعے ایک ادبی مقام پیدا کرے لیکن بعض نظریات اور مقاصد پسند انسانوں کو جبلی خول ہی پسند آتا رہا ہے۔ اس لیے اُن کی زندگی کا دھارا مجرد نظریات کی طرف بہتا رہتا ہے۔ اس لیے وہ موجود بالذات اور نظریات کے خول میں اسیر رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اب بھی معاشرے میں موجود ہیں۔ مگر اُن کے قلم خاموش ہیں۔ لیکن انور سدید نے سچے اور کھرے ادب کے ذریعے ایک بنیادی فرق یہ پیدا کیا ہے کہ ادب پروپیگنڈہ نہیں ادبی حقیقت ہے۔ فن اقدار کو پیدا کرتا ہے اور ایک سچا فن کار ہی اقدار کی پہچان رکھتا ہے۔ اس نکتۂ نظر سے انور سدید کے ادب و فن کا حاطہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کا ادب حقیقی ہے جذباتی نہیں اس کے تمام تر مباحث منطقی ہیں اسلوبی نہیں۔ وہ حقیقت کا احساس پیدا کر کے اس کے ادراک کے لیے جمالیاتی تاثیر کے ساتھ ادیب کے کردار پر بھی بحث کرتا ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک ادیب کا کردار ادب میں ہی ضم ہے۔ لہٰذا غیر جذباتی لیکن استدلالی طریق کار سے انور سدید زندگی کے استعاروں اور ادراک زندگی سے فیض حاصل کرتا ہے۔ اور یہ مستقل فن اس کے ادب کا معیار ہے۔ وہ احساسِ فن کا منفرد تخلیق کار ہے۔ انہوں نے نثر، نظم۔ حمد، سلام، نعت کے ذریعے اس نے عقیدت کا طلسم پیدا کیا ہے۔ تخلیقی رو کو روا رکھ کر اس نے تمثال حسی کا ماحول پیدا کیا ہے۔ ان کے انشائیوں نے ذہنی جذباتی اور شخصی تاثر منتقل کیا

ہے۔ اس نے ابہام مجہولیت اور بے لگام جذبے کے خلاف جہاد کیا ہے۔ انہوں نے تنقید کو حقیقت اور جمالیاتی اقدار سے آشنا ہو کر تعصب، غیر صحت مند ماحول اور بیمار واقفیت کے چُنگل سے آزادی دلانے کا بیڑہ اُٹھایا تھا۔ انہوں نے وصف نگاری کو ایک مقام بخشا ہے۔ بلکہ غالب کے خطوط کی پیروی میں اس نے تضمین کی جس کیفیت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے ادب کے قاری کو خوشگوار حیرت سے دوچار کیا ہے اور غالب کے مخصوص اسلوب میں اس کی نقل کر کے ایک عجیب سی "انتخابیت" سے کام لیا ہے۔ جو انتہائی مشکل اور کٹھن مرحلہ ادب ہے۔ مگر انور سدید اپنی لگن اور غالب شناسی کی بنا پر اس سفر کو بھی کامیابی سے طے کر گیا۔ اُن کی زندگی کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ رمزیت کا آدمی اور جمالیاتی بُعد کا ادیب دکھائی دیا۔ انہوں نے غالب کے خطوط میں جو حُسن پیدا کیا ہے۔ اس سے انہوں نے اپنی مخفی زندگی کے پہلوؤں کو اُجاگر کیا اور یہ اظہار اُن کی داخلی خواہش کو تخلیقی محرک بنایا ہے۔ اُن کے یہ خطوط اُن کی داخلی تحریک کا ایک عنصر تھا۔ اس طرح غالب ہمارے عہد میں نئے واقعات کے ساتھ لاشعوری تاثرات اور پُر اسراریت کے ساتھ دوبارہ دُنیا میں وارد ہوا ہے۔ چنانچہ غالب کے خطوط میں ایک خارجی تحریک اور ادبی تعلق کی نشان دہی تلازمہ خیال کی صورت میں موجود ہیں۔ بلکہ غالب کی روایت کو من و عن نبھا کر انور سدید نے داخلی واردات کا بھیس بدل کر اپنا نیا رُوپ دکھایا ہے۔

بنیادی طور پر انور سدید افسانے کا مردِ میدان ہے۔ مگر افسانہ اس کے لیے وسیع کینوس نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے تنقید، تحقیق اور تحریک کا آغاز کیا اور یہ کہنا درست ہو گا۔ اُن کی علمی تحریریں، فرائض منصبی سے دلچسپی، دفتری اوقات کی پابندی، اپنے پیشے پر عبور، ادب اور سائنس سے یکساں لگاؤ، انگریزی کالم نویسی میں مہارت تردید یا تائید سے بے نیاز ادب کی تحریکات اور نئی تحقیقات کا آغاز کیا اور یکہ و تنہا طور پر طے کرتا ہے۔ اور کوئی خارجی سہارا بھی حاصل نہیں کیا۔ بلکہ توازن قائم رکھ کر شخصی رد عمل میں ایک بے باکی پیدا کر کے سرشاری حاصل کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ادب کی یہ پیچ در پیچ کیفیات کا حاطہ کیا ہے۔ اور بے پناہ محنت کی ہے اور انوکھی تحقیق کے ذریعے بعض منفرد خیالات اور افکار کو فروغ بخشا ہے اور تمام تر ادبی محنت کو ذاتی یا شخصی نہیں بننے دیا۔ اس طرح ادب کی ہمہ گیر تحریکات کو سامنے لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اب ادب کا عام قاری بھی اس کی تحقیق کی سچائی اور ژرف بینی سے آشنا ہے۔ ادب میں ذاتی یا شخصی معاملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن انور سدید نے کسی معاملے کو شخصی اور ذاتی نہیں بنایا۔ کیونکہ وہ براہِ راست سماج سے نہیں ٹکراتا، بلکہ ادبی شعور کے فروغ کے لیے وہ اِن باتوں کی ٹوہ لگاتا ہے۔

جن سے ادب کو نقصان پہنچ رہا ہو۔ بلکہ انسانی عظمت کے احساس اور وقار کے مشن کو فروغ دیا ہے۔ چنانچہ انور سدید اپنے مشن کی گرفت سے بھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ "سمجھوتے بار" ادیب نہیں ہے بلکہ اقدار اور وقار پر تعاون پیش کرنے والا باشعور انسان ہے۔ اُن کی تخلیقات کے تحقیقی جائزے اور پرکھ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بے خوفی اور بے باکی کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ انور سدید اجتماعی ادب اور ازلی اقدار کے لیے اپنی صلاحیتیں صرف کر رہا ہے اور اس طرح وہ ادب کا ایسارہ نورد ثابت ہوتا ہے۔ جن کا ہر قدم استقرائی عمل کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ اور وہ تمام جُزئیات سے کل کا تصور کشید کر کے تخلیقات مرتب کیں۔ موضوعات کے انتخابات اور تخیل و استدراک میں انور سدید کی چابکدستی حیرت انگیز ہوتی ہے۔ وہ ادب کی سطروں میں چھپے ہوئے معانی کی دریافت میں بڑی سُرعت دکھاتا ہے۔ وہ حافظے کی بنیاد پر یاداشتوں کا طویل سلسلہ رکھتا ہے۔ اور وسعت تخیل کی بے پناہ قوت سے بہرہ یاب ہو کر تخلیق، فن اور نتائج کے اصول وضع کرتا ہے اور کلی مماثلتوں میں زندہ رہ کر فکر و دانش کا استنباط کرتا ہے۔ انور سدید کو اردو ادب کی نمائندہ ادیبوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ وہ ہر لحہ متحرک زندہ اور سلسلہ وار آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے تحریک کی بناء پر بے شمار تلازمہ ادب پیدا کیے ہیں۔ جو نئے معانی اور نئی تحریکات کے لیے انہوں نے فنکارانہ اسلوب پیدا کیا ہے۔ اُن کی تخلیقات کا اسلوب منفرد اور امتیازی نوعیت کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں اُن کا مقام و مرتبہ اہمیت کا حامل ہے۔

(ب) نتائج:

اس تحقیق سے سامنے آنے والے حاصلات درج ذیل ہیں۔

☆ انور سدید کے افسانے فکری و فنی اعتبار سے معیاری صورت کی حامل ہیں۔ اُن کے افسانوں میں مشرقی زندگی چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ افسانے اپنے باطن میں گہری معنویت اور گہرے علامتی زاویوں کے ساتھ ساتھ فکری بصیرت بھی رکھتے ہیں۔ جس کے سبب اُن کے ہاں انوکھی اور دل آویز صورتیں اور کیفیتیں اُجاگر ہوتی ہیں الغرض یہ افسانے اُن کی تخلیقی کاوش کا روشن نمونہ ہیں۔

☆ انور سدید کی سفر نامہ نگاری میں تخلیقی بیانیہ اسلوب، انکسار، درویشی، طالب علمی اور عقیدت مندی کا سچا جذبہ موجود ہے اور یہ علمی پس منظر کی بازیافت میں پوری معاونت فراہم کرتا ہے۔ یہ سفر تاثر

محض معلوماتی نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے بھی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور دور جدید کے سفر ناموں میں اپنی منفرد اہمیت رکھتا ہے۔

☆ اُن کے انشائیوں کے موضوعات عموماً سماج کے رویے، بگڑے افعال اور عام فطرت پر منحصر ہے۔ انشائیہ جو کہ موضوع کا پابند نہیں ہوتا اور تحریف نگاری، طنز و مزاح انشائیہ کی تکنیکی شناخت کے ساتھ وسیع کینوس رکھتا ہے۔ انہوں نے انشائیہ نگاری میں اصلاحی تاثر قائم کیا اور غیر محسوس اور غیر رسمی انداز میں معاشرتی ناہمواریوں کو اُجاگر کرتے ہوئے اور اس کے اصلاح کی سعی کی ہے۔

☆ ڈاکٹر انور سدید نے شخصیت نگاری میں وہ اپنے طرز، طور اور اسلوبیاتی تکنیک اور طریقہ کار کی بدولت منفرد شخصیت نگار ہیں۔ انہوں نے جاندار اسلوب سے اُردو ادب میں شخصیت نگاری کو مزید مستحکم کیا ہے۔

☆ ڈاکٹر انور سدید کی شاعری کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن کے نزدیک شعر کا مقصد فطرت حسن کی تخلیق اور جبلت انسانی کے خواص، مظاہر، انسان کی اُمنگوں، حزن و ملال اور جذباتی کشمکش کے المیوں کا اظہار بطور موضوع ملتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے اردگرد کائنات اور حقیقی زندگی کا گہرا مشاہدہ اور دیگر افکار کا وسیع مطالعہ کیا۔ اُنہوں نے زندگی کی تلخیوں، خارجی حقائق کا مشاہدہ کر کے قلبی واردات اور احساسات کو فطرت کی صورت دے کر بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں ذات و کائنات کے مختلف رنگ احساسات اور تاثرات کا امتزاج دلکش صورت میں ملتا ہے۔

(i) سفارشات:

گزشتہ ابواب میں کی گئی بحث اور حاصل ہونے والے نتائج کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

☆ ڈاکٹر انور سدید نے اُردو ادب کی تاریخ، تنقید، انشائیہ، طنز و مزاح، خاکہ نگاری، سفر نامہ نگاری اور شاعری کے ساتھ ساتھ تبصرہ نویسی اور تین دہائیوں پر مشتمل سالانہ ادبی جائزہ نگاری میں اتنا کام کیا ہے کہ زیر نظر تحقیق میں اُن کا مکمل جائزہ ناممکن تھا۔ اس لحاظ سے تبصرہ نویسی اور ادبی جائزہ نگاری پر تحقیقی کام کی مزید گنجائش موجود ہے۔

☆ وہ محقق، نقاد، کالم نگار، مدیر، مترجم اور شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اُنہوں نے مختلف اخبار اور رسائل میں کالم نویسی کے جوہر دکھائے اور اُن کے سینکڑوں مضامین مختلف علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے اُن کی "ادبی کالم نگاری" کے عنوان سے الگ تحقیق کی ضرورت ہے۔

☆ اُن کی نظمیں، قطعات اور نعتیں اُن کی بیاض اور مختلف رسائل میں غیر مطبوعہ حالات میں موجود ہیں ۔ ان کو اکٹھا کر کے کتابی صورت میں مرتب کیا جائے۔

☆ انور سدید کے افسانے اپنے سماج سے جُڑے ہونے کے باوجود آفاقی نوعیت کے حامل ہیں ۔ لہٰذا جامعاتی سطح کے نصاب میں اُن کے افسانوں کو نصاب میں شامل کر کے جدید تقاضوں کے مطابق استوار کرنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

انور سدید، ڈاکٹر، اقبال کے کلاسیکی نقوش، مکتب عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء

انور سدید، ڈاکٹر، اقبال شناسی اور "ادبی دُنیا" تالیف، بزم اقبال، لاہور ۱۹۸۹ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، الٰہ آباد، بھارت، ۱۹۸۳ء

انور سدید، ڈاکٹر، انشائیہ اُردو ادب میں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۵ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۲۰۰۴ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، لاہور، ۱۹۹۰ء

انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

انور سدید، ڈاکٹر، میر انیس کی اقلیم سخن، رائیٹرز گلڈ، الٰہ آباد، بھارت، ۱۹۸۵ء

انور سدید، ڈاکٹر، غالب کا جہاں اور، مکتبہ کارواں، ملتان، ۱۹۸۹ء

انور سدید، ڈاکٹر، فکر و خیال، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۱ء

انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۵ء

انور سدید، ڈاکٹر، کھردرے مضامین، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۸ء

انور سدید، ڈاکٹر، نئے ادبی جائزے، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۹ء

انور سدید، ڈاکٹر، میر انیس کی قلم رو، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۹ء

انور سدید، ڈاکٹر، شمع اُردو کا سفر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء

انور سدید، ڈاکٹر، بر سبیلِ تنقید، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱ء

انور سدید، ڈاکٹر، موضوعات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۲ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو نثر کے آفاق، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۸ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا دیار، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۹ء

انور سدید، ڈاکٹر، جدید اُردو ادب کے ارباب اربعہ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۷ء

انور سدید، ڈاکٹر، مولانا صلاح الدین احمد۔ ایک مطالعہ، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۱۹۹۰ء
انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء
انور سدید، ڈاکٹر، مولانا صلاح الدین احمد، فن اور شخصیت، اکامی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
انور سدید، ڈاکٹر، وزیر آغا ایک مطالعہ، مکتب فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۵ء
انور سدید، ڈاکٹر، شام کا سورج، تالیف، مکتب فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۵ء
انور سدید، ڈاکٹر، ذکر اس پری وش کا (انشائیے)، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۹ء
انور سدید، ڈاکٹر، آسمان میں پتنگیں (انشائیے)، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۴ء
انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط (طنز و مزاح)، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء
انور سدید، ڈاکٹر، دلاور فگاریاں (سوانح)، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۰ء
انور سدید، ڈاکٹر، محترم چہرے (خاکے)، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۹ء
انور سدید، ڈاکٹر، قلم کے لوگ (خاکے)، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۹ء
انور سدید، ڈاکٹر، ادبیان رفتہ (خاکے)، کلاسیک، لاہور، ۲۰۰۶ء
انور سدید، ڈاکٹر، رادھے شیام کے نام (تصوف)، مکتبہ اُردو زبان سرگودھا، ۱۹۷۶ء
انور سدید، ڈاکٹر، بہترین ادب ۱۹۶۸ء، تالیف، مکتبہ اُردو زبان سرگودھا، ۱۹۶۹ء
انور سدید، ڈاکٹر، بہترین ادب ۱۹۶۹ء، تالیف، مکتبہ اُردو زبان سرگودھا، ۱۹۷۰ء
انور سدید، ڈاکٹر، بہترین نظمیں ۱۹۷۶ء، تالیف، مکتبہ اُردو زبان سرگودھا، ۱۹۷۷ء
انور سدید، ڈاکٹر، بہترین نظمیں ۱۹۷۸ء، تالیف، مکتبہ اُردو زبان سرگودھا، ۱۹۷۹ء
انور سدید، ڈاکٹر، وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام، تالیف، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۵ء
انور سدید، ڈاکٹر، مکالمات، تالیف، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۲ء
انور سدید، ڈاکٹر، آخری نظمیں، راجہ مہدی علی خان، تالیف، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۶ء
انور سدید، ڈاکٹر، اُردو اسانہ عہد بہ عہد، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۶ء
انور سدید، ڈاکٹر، خطوط کے آئینے میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۷ء
انور سدید، ڈاکٹر، نئے ادبی جائزے، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء
انور سدید، ڈاکٹر، ادب کہانی ۱۹۹۶ء، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۹ء

انور سدید، ڈاکٹر، ادب کہانی ۱۹۹۷ء، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۹ء

انور سدید، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار صلاح الدین احمد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

انور سدید، ڈاکٹر، کچھ وقت کتابوں کے ساتھ، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۴ء

انور سدید، ڈاکٹر، دہلی دور نہیں (سفر نامہ)، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۸ء

انور سدید، ڈاکٹر، نئے ادبی جائزے، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۸ء

انور سدید، ڈاکٹر، مزید ادبی جائزے، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۷ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو نظم کے ارباب اربعہ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۶ء

انور سدید، ڈاکٹر، خطوط کے آئینے میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۷ء

انور سدید، ڈاکٹر، غزل کے رنگ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۹ ء

انور سدید، ڈاکٹر، سن تو سہی، تالیف، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

انور سدید، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، بانو قدسیہ، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

انور سدید، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، فرخندہ لودھی، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

کتابیات

ثانوی ماخذ:

حسن رضوی، ڈاکٹر، گفت و شنید، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اُردو ادب، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۰ء

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، سنگ میل پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

سجاد نقوی، ڈاکٹر وزیر آغا کے منتخب مقالات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء

سجاد نقوی، گرم دم جستجو، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۹۰ء

سجاد نقوی، مطالعے، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۹ء

سلطانہ مہر، گفتنی (دوئم)، مہر بک فاؤنڈیشن، لائس انجلز، ۲۰۰۴ء

سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اُردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، جلد ششم، ۲۰۱۰ء

فراق گورکھپوری، اُردو غزل گوئی، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو افسانہ۔ روایت اور مسائل، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو افسانہ روایت و مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۱ء

محمد حسن، ڈاکٹر، اُردو ادب میں رومانوی تحریک، مکتبہ کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء

محمد طفیل، نقوش افسانہ نمبر، جلد دوم، ادارہ فروغ اُردو، لاہور

منور عثمانی، مطالعہ اسلوب کے کے تقاضے، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۲۰۱۷ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو ادب میں طنز و مزاح، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۸ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا مزاج، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید اُردو تنقید، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۰ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، مولانا صلاح الدین احمد، شخصیت اور فن، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۰ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء

وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

رسائل وجرائد

رسائل:

سہ ماہی، اسالیب، (انور سدید نمبر)، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۳

ماہنامہ "اوراق" ، خاص شمارہ ۳ ، لاہور، ۱۹۶۶ء

ماہنامہ "نقوش" شمارہ، ۹۷ (شخصیات نمبر)، لاہور، ۱۹۵۶ء

اخبارات:

روزنامہ "جسارت"، کراچی، مئی ۱۹۷۸ء

روزنامہ "حریت"، کراچی، ستمبر ۱۹۹۹

روزنامہ "خبریں" لاہور، اپریل، ۱۹۹۴ء

روزنامہ "مشرق" لاہور، اکتوبر ۱۹۹۱ء

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور، ستمبر ۱۹۹۱ء

غیر مطبوعہ مقالہ جات:

مسرت شاہین "ڈاکٹر انور سدید بطور نقاد" مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)، سرگودھا یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء

نعیم بزمی "انور سدید کی ادبی خدمات" مقالہ برائے ایم۔اے (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۷ء